

بندھی میں سلگتی ریت

صائمہ اکرم چوہدری

انتساب

ڈاکٹر غلام شبیر کے نام!
جنہوں نے 14 اگست 2008ء کو
میری زندگی کو ایک خوبصورت موڑ دیا۔

درا حساس پردستک

’بند مٹھی میں سلگتی ریت‘ کتابی شکل میں میری پہلی کوشش ہے۔ جس طرح ایک بچہ اپنا پہلا قدم اٹھاتے ہوئے تھوڑا سا لڑکھڑاتا ہے، گرتا ہے اور پھر سنبھل جاتا ہے، یوں سمجھیں کہ میں بھی انہی مراحل میں ہوں۔ یہ تحریر ایک چھوٹا سا احتجاج ہے ان ظالمانہ رسموں، رواجوں کے خلاف جنہوں نے جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو آکاس نیل کی طرح جکڑ رکھا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ جس طرح ریت کو مٹھی میں قید نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح یہ غیر اسلامی رسمیں بھی انسانیت کے ماتھے کا بد نما داغ ہیں اور ان کو بھی ہماری زندگیوں سے نکلتا ہوگا۔ لیکن یہ سلگتی ریت کتنے ہاتھوں پر بد نما داغ ڈال چکی ہے، اس تکلیف کا مداوا ممکن نہیں۔ اس کہانی میں آپ کو مختلف رنگ ملیں گے۔ محبت جو کسی دلیل اور منطق کی محتاج نہیں ہوتی، جہالت، جس کی تپش جسم و دل کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے۔ ہوس، جس کا شکار ایک اندھے کوئیں میں جا گرتا ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج، ایک ایسی روشنی، جسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ ہمارے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اس کے کردار ہمارے ساتھ ہی اس فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ہم کسی نہ کسی شکل میں ان کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان کا ہر چہرہ ہی بد نما ہے۔ اس کہانی کے ایک کردار کے جملے نے مجھ سے پورا ناول لکھوا ڈالا۔ میں اس کے دکھوں کا ازالہ تو نہیں کر سکتی لیکن درا حساس پردستک تو دے سکتی ہوں۔ یہ کتاب بھی ایک دستک ہے۔ دیکھتے ہیں کہ یہ دستک کتنے مقفل دلوں کے تالے کھولتی ہے۔

کسی بھی کتاب کی اشاعت پبلشر کے تعاون اور کوشش کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ القریش پبلی کیشنز کی خدمات کو نہ سراہنا ایک زیادتی ہوگی۔ میں اپنے پہلے قدم میں ان کے تعاون کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد رکھوں گی۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین! آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

دعا گو

صائمہ اکرم چوہدری

اسلام آباد

بند مٹھی میں سلگتی ریت

سردیوں کی گلابی شام اس پختہ دیواروں والے گھر میں سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی۔ اس کا گلابی رنگ جوں جوں پگھلتا جا رہا تھا، اس گھر کے واحد کمرے میں موجود لڑکی کی سانسیں اور اُمیدیں ویسے ویسے اکھڑ رہی تھیں۔ اس مٹی ہوئی شام کی نیم جاں آنکھوں میں غضب کی اداسی تھی۔ خوشگوار خنک ہوا سر کنڈے کے جھاڑوں میں سے گزرتی مبہم سرسراہٹیں پیدا کر رہی تھی۔

اس لڑکی کو معلوم تھا کہ اگر یہ خوفناک رات گزر گئی تو اس کی آنے والی زندگی میں صرف اندھیرے ہی اندھیرے ہوں گے۔ خوف اور دہشت کے سنپولے اسے اپنے وجود پر ریگتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ ہر اسان نظروں سے اس کمرے میں موجود ہر چیز پر نظریں جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرے میں لگا ساٹھ واٹ کا بلب دیواروں کی خستگی کو نمایاں کر رہا تھا۔ اکھڑا ہوا پلستر، چھت پر لگا پرانا پنکھا، بوسیدہ چارپائی اور ٹوٹی ہوئی کرسی..... وہ اب ہونٹوں کو کچلتے ہوئے دھندلی آنکھوں سے زمین کو گھور رہی تھی۔ آسمان کے سینے سے پھوٹا ہوا خنک اندھیرا اب اس کی آنکھوں سے رگوں میں اترنے لگا تھا۔ کمرے میں موجود واحد مضبوط سلاخوں والی کھڑکی سے نظر آنے والا نیم کا درخت اور اس کی جھکی ہوئی شاخیں اب اس کے دُکھ پر آہیں بھر رہی تھیں۔ ہر سُو خزاں کا حزن و ملال ٹھہرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے سرد ہوا کا جھونکا اس کے بدن سے ٹکرایا تو خفیف سی کپکپی طاری ہو گئی۔ دروازے پر دستک دے دے کر اس کی گلابی ہتھیلیاں دُکھنے لگی تھیں، لیکن اسے اس بات کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

”دروازہ کھول دیں، مجھ پر رحم کریں، مجھے حویلی جانے دیں۔“ چیختے چیختے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ رات کا سرد تنفس اس کی سانسوں سے اُلجھنے لگا تھا۔

یہاں سے فرار کو کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے پلکیں جھپک کر آنکھوں کے گرد تہی نمی کی چادر کو ہٹایا اور کمرے کے روشندان کو بے بسی سے دیکھا۔ اس کا جسم اتنا کم تھا کہ وہ کسی طرح بھی سمٹ سمٹا کر بھی وہاں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ رو رو کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ وہ اب ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں کھڑی بے حس و حرکت کمرے کی کھڑکی سے گزرتی رات کو بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ صحن میں لگے اکلوتے نیم کے درخت کی شاخیں ساکت ہو گئی تھیں۔ سرمئی آسمان پر اکا دکا تارے بجھے بجھے سے لگ رہے تھے۔ سرمئی ریشم جیسی رات بہت تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ اس کا نڈھال وجود رات کے ملامت بدن میں دھنستا جا رہا تھا۔

فجر کی اذان اس کی سماعت پر بہت دھیمی دستک دے کر لوٹ گئی تھی۔ وہ بے بسی کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ وہ رگوں کو کاٹتی ہوئی سردی سے بے نیاز تھی۔ گلے میں بے شمار آنسو آن بیٹھے تھے۔

”یا خدا! مجھ سے کہاں غلطی ہو گئی؟“

”حیدر لالہ تو مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔“

”اوہ خدایا! میں کس کس کو صفائی دوں گی۔“ مختلف وہم اور اندیشے زہریلے ناگوں کی طرح سر اٹھا رہے تھے۔ عجیب بے بسی، مایوسی اور وحشت کمرے میں قفس کر رہی تھی۔

پھر ایسا لمحہ آیا جب گھر کی ہر شے پر چھایا سناٹا اور اندھیرا اپنا لبادہ اتار چکا تھا۔ پاکیزہ سکوت تار تار ہو چکا تھا۔ باہر نکلنے کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ اس کے رخساروں پر مسلسل پڑھت قطرے پھسل رہے تھے۔

”اے خدا! اب کیا مانگوں؟“ مانگنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں رہا تھا اب وقت کی ظالم ڈور اس کے ہاتھوں سے پھسل چکی تھی۔ اس نے بے اختیار اپنے بازو پر بندھی رسٹ واچ کو دیکھا درد اور خوف نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اسے اغوا ہوئے پورے بارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔

لال حویلی کے بڑے سے سیاہ گیٹ کو بوگن ویلیا کی آتشیں گلابی اور سفید پھولوں والی

بیل نے اپنی بانہوں کے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس حویلی کے مکینوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ صبح ان کے لیے قیامت خیز ثابت ہوگی۔ دودھیا دھند کی چادر اوڑھے موسم سرما کی سرد ہوانے پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گیٹ سے پورج تک آنے والی سیاہ تارکول کی سڑک پر ساری رات گاڑیوں کی آمد و رفت جاری رہی تھی۔ پوری حویلی کے ملازمین اور مکینوں کے چہرے سہمے ہوئے اور آنے والے وقت سے خوفزدہ تھے۔

باہر سے نظر آنے والی لال حویلی قدیم اور جدید طرز تعمیر کا خوبصورت امتزاج تھی۔ وسیع و عریض لان میں سکھ چین، الماس اور موسمی پھلوں کے درختوں کی بھرمار تھی۔ لان کے ایک گوشے میں سوئمنگ پول تھا۔ جس کے گرد چندنا اور مور پنکھ کے پودے گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ حویلی کے پیچھے وسیع و عریض میدان کے ایک سائیڈ پر سید سجاد حسین شاہ کے گھوڑوں کا فارم تھا اور دوسری سائیڈ پر لگے جنگلے میں موردوں کا ایک جوڑا اکثر اٹھیلیاں کرتا دکھائی دیتا تھا۔ باہر سے نظر آنے والی اس قدیم اور جدید طرز کی حامل حویلی میں زنان خانہ اور مردانہ خانہ بالکل علیحدہ علیحدہ تھے اور زنان خانے میں صرف خواتین ملازماؤں کو جانے کی اجازت تھی۔

سید پیر محمد شاہ کی وفات کے بعد بھاری بھر کم ذمے داریوں کا بوجھ سید سجاد حسین کے کندھوں پر آ چکا تھا۔ جو ان کی واحد اور دیرینہ اولاد تھے اور..... ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے دو بیویوں سے صرف ایک بیٹا اور تین بیٹیاں دی تھیں۔ اس وقت لال حویلی کے زنان خانے میں موت جیسی خوفناک اور دل کو چیرنے والی خاموشی کا راج تھا۔ لکڑی کے منقش تخت پر گاؤں کی بچے سے ٹیک لگائے بے جی کی زبان صدمے سے گنگ تھی۔ ان کے پاس بیٹھی روٹی پھوسر جھکائے بے بس سی بیٹھی تھیں۔ ان کا چہرہ خوف سے پیلا پھٹک تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی اربیبہ اور عروہ ہاتھ پیر چھوڑے پتھر کے بت کے مانند کھڑی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں کے گرد راتوں رات سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے اور شکرنی ہونٹ مرجھائے ہوئے پھولوں کی پتیوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی ان کی ماں کا چہرہ زرد اور سپاٹ تھا جبکہ سید سجاد حسین کی شعلے برساتی آنکھیں ان سب پر جمی ہوئی تھیں۔ دیوار کے بائیں سائیڈ پر رکھے صوفے پر بیٹھی مدیحہ نے استہزائیہ مسکراہٹ سے سب کا جائزہ لیا۔ اس وقت ان کا دماغ سرور کے انوکھے نشے میں بھکورے لے رہا تھا۔

”لالہ جی! قسم خدا کی! میں سارا وقت بچیوں کے پاس تھی۔ بس کھانے کے وقت تھوڑا

”آئے ہائے کوئی میرے بچے کا تو پتا کروائے جب سے اسے اس بے غیرت کے بھانسنے کی اطلاع ملی ہے اپنا ہسپتال اور جیب لے کر نکلا ہوا ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں تین تین سلیں اس کے سینے پر دھری ہیں میں کہتی ہوں شاہ صاحب آپ دلاور کوفون کریں اور پوچھیں حیدر شاہ کہاں ہے؟ مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔“ ان کی آواز بلند اور انداز سراسر تمسخرانہ تھا۔

”کچھ نہیں ہوتا تمہارے بیٹے کو اسی نے سفارش کی تھی کہ محمود شاہ کے بیٹے کے عقیقے میں سب کو جانے دیں اور اوپر سے وہ دو گن مین بھی ساتھ تھے۔ وہ ان سب کی موجودگی میں کہیں دفغان ہو گئی اور ان کم بختوں کو پتا تک نہ چلا۔“ سید شاہ کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا جبکہ سیدہ مدیحہ تو جیسے پھٹ پڑی تھیں۔

”ہاں تو میرے معصوم بیٹے کو ان منحوسوں کے کرتوتوں کا کیا پتا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ کس گند کو ساتھ لیے جا رہا ہے اور اندر ہی اندر یہ کچھڑی کب سے پک رہی ہے۔ اوپر سے لال حویلی کی سب سے ”سیانی“ کو آپ نے ساتھ روانہ کیا تھا۔ اب کیا خبر..... اندر سے کون کون ملا ہوا.....؟“

”مدیحہ منہ سنبھال کر بات کرو۔“ بے جی تڑپ کر غصے سے بولی تھیں۔

”میں تو منہ سنبھال لوں گی، لیکن گاؤں والوں کی زبانیں کون سنبھالے گا۔ گھر سے بھاگ جانے والی لڑکی کا جرم سیاہ رات کی تاریکی سے بھی زیادہ خوفناک اور ہولناک ہوتا ہے۔ لوگ شاہ صاحب اور میرے بیٹے کی طرف دیکھ کر ہنسیں گئے اگھلیاں اٹھائیں گے۔“ سیدہ مدیحہ آج موقع کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھیں اور کچھ بیٹے کی ماں ہونے کے احساس نے خود بخود شاہ صاحب کی نظروں میں انہیں معتبر بنا دیا تھا اور وہ ان کی دوسری ”لاڈلی“ بیوی ہونے کا اکثر ناجائز فائدہ اٹھا جاتی تھیں۔

”میں اگھلیاں اٹھانے اور ہنسنے والوں کو جان سے مار دوں گا، زندہ دفن کر دوں گا حرام خوروں کو کسی کی جرأت نہیں ہے کہ سید سجاد حسین شاہ اور حیدر سجاد شاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔“ وہ ایک دفعہ پھر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ چہرہ اندرونی فشار سے سرخ، لہجہ زہر آلود اور انداز میں سرد مہری کا عنصر واضح تھا۔

”ارے کی کمین لوگوں کی کہاں جرأت؟ وہ تو ہمارے لیے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے..... میں تو ”شرکیوں“ کی بات کر رہی ہوں۔ ان تک بھی خبر پہنچ گئی ہوگی۔

سا اودھم مچا اور پچیاں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ اریہ اور عروہ تو میرے سامنے تھیں۔ میں نے سمجھا کہ مومنہ بھی وہیں ہوگی۔“ روہینہ سہمی ہوئی آواز میں ایک دفعہ پھر صفائی دے رہی تھیں۔ ان کی آواز گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”بکواس بند کر روہینہ شاہ! مجھے یہ بے ہودہ وضاحتیں مت دو۔“ وہ ایک دفعہ پھر بھڑک اُٹھے تھے۔ ان کے ماتھے کی شکنیں گہری جبکہ بھوین تن سی گئی تھیں، جبکہ کرااری آواز گہرے تنفر کا پتا دے رہی تھی۔

”مجھے وہ منحوس ذلیل اور بے غیرت لڑکی کہیں سے مل جائے تو میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ ”لال حویلی“ میں صدیوں تک اس عبرت ناک سزا کی مثالیں دی جائیں گی۔ اس گھٹیا لڑکی کو تو میں پاتال کی گہرائیوں سے بھی نکال لاؤں گا، جو دن دھاڑے میری عزت سے کھیل گئی۔ اسے معلوم نہیں کہ لال حویلی میں اس قسم کے نافرمان لوگوں کا کیا حشر ہوتا ہے؟ پالتو کتوں کی خوراک بناؤں گا اسے.....“ ان کے لہجے میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ مغلظات بکتے ہوئے خونخوار آنکھوں سے کمرے میں موجود تمام خواتین کو دیکھ رہے تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سب کو گولیوں سے بھون دیں۔

”سجاد شاہ حوصلے اور صبر سے کام لو۔ ہماری بچی کی تربیت غلط نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا ہو۔“ اس طرح کے ماحول میں بات کرنے کا حوصلہ صرف بے جی ہی کر سکتی تھی۔

”بے جی! اپنی اولاد کے رنگ ڈھنگ سے والدین سے زیادہ کوئی واقف نہیں ہوتا اور اس بد ذات کے بچپن سے ہی لچھن ایسے تھے..... بھاگ بھاگ کر مردانے میں جاتی تھی۔ ضد کر کے کالج میں داخلہ لیا اور ہماری ناک کے نیچے اس نے اپنے کمرے میں موبائل کافی دنوں تک چھپا کے رکھا۔ اپنی پھپھو کی طرح اس کی جوانی بھی بے لگام ہو رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ تو چاند اس نے چڑھانا تھا، چڑھا لیا۔ میری جان کا عذاب ہیں یہ جو نکلیں پہلے چار بہنوں نے میری زندگی کو عذاب بنائے رکھا..... اوپر سے خدا نے بیٹیوں کی صورت میں تین منحوس صورتیں میرے گھر بھیج دیں۔“ انہوں نے زخمی نظروں سے تخت پر بیٹھی اپنی والدہ کو دیکھا۔

سیدہ گلشنہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھتی رہ گئیں۔ اتنی زہر آلود سوچ اور اتنا نفرت انگیز انداز۔ سیدہ مدیحہ ہاتھ ملتے ہوئے مصنوعی ٹھکر سے بولیں۔

آج تو سید شہباز شاہ کی حویلی میں چراغاں ہوگا۔ دیکھیں کھڑک رہی ہوں گی۔“ سیدہ مدیحہ شاہ بولتے بولتے ایک دم چنکیں اور نسبتاً دھیمے لہجے میں بولیں۔

”شاہ جی! آپ نے سید سجاد علی شاہ کا پتا کروایا۔ کہیں.....“ وہ فقرہ، ادھورا چھوڑ کر شاہ جی کی طرف دیکھنے لگیں، جن کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ بے جی اور شگفتہ شاہ نے انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میں تمہیں شکل سے بے وقوف چھد یا گھماڑ لگتا ہوں؟“ شاہ جی کے سر رد اور طنزیہ لہجے پر مدیحہ شاہ گھبرا گئیں۔ انہیں شاہ جی کی آنکھوں سے جھلکتے تنفر کی گہرائی کا اندازہ ہوا، لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہیں۔ ”سب مہرے پہلے ان گھنیا لوگوں کا ہی پتا کروایا تھا، سجاد اہل شاہ آج کل باہر مرا ہوا ہے، بلاول لاہور میں پھڑوے اڑا رہا ہے اور خود معظم شاہ اس دو ٹکٹے کی اداکارہ کے ساتھ دہلی میں ہے۔“ شاہ جی بھوکے شیر کی طرح غزائے تھے۔

”میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔“ وہ خفیف سا ہو کر گویا ہوئیں۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا انتہائی اشتعال انگیز انداز میں حیدر شاہ اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن سامنے باپ کو دیکھ کر تھوڑا سا ٹھنکا، ستا ہوا چہرہ آنکھوں میں سرخ ڈورے بکھرے ہوئے بال، چھپٹ سے اونچا قد اور گھنی مونچھیں اس کے ایک انگ سے بے چینی اور غصہ مترشح تھا۔

”آ جاؤ، پتا چلا اس کا.....؟“ شاہ جی کی خشک اور بے تاثر آواز پورے کمرے میں گونجی۔

”اگر پتا چلتا تو اس کی جگہ یہاں لاش آتی میرے ساتھ۔“ اس کا لہجہ بھی پتھر یلا تھا۔

”میں کہتی ہوں لعنت بھیجو..... اس بد چلن پر بس پورے گاؤں میں مشہور کروا دو کہ دینا پور سے آتے ہوئے گاڑی کا ایکسڈنٹ ہوا اور وہ کم بخت، آوارہ مرگنی۔ کم از کم پورے گاؤں میں تو کسی کی جرأت نہیں کہ آپ کی بات سے اختلاف کر سکے۔“ سیدہ مدیحہ کے اس مشورے پر بے جی نے بڑی چھپتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔ شاہ جی بھی اپنی جگہ پر پہلو بدل گئے، جبکہ حیدر شاہ صرف باپ کے لحاظ میں خاموش تھا، ورنہ اس کے اندر ابلتا ہوا لاؤ اس کے چہرے سے صاف جھلک رہا تھا۔

”ماں جی! لوگوں کو بے وقوف مت سمجھیں۔ اس حویلی کے ملازم اندھھے یا بہرے نہیں..... یہ وہ دور نہیں جب ملازم اپنے مالکوں کے راز سینوں میں دفن کر لیتے تھے۔ یہ سب

حرام خور ہیں جہاں سے اچھا کھانے کو ملے وہیں کتے کی طرح پکیتے ہیں۔ وہ بے غیرت کہیں سے ہاتھ آگے تو اس کے ٹوٹے ٹوٹے کر کے حویلی کے اندھے کنویں میں پھنکوا دوں گا۔“ وہ اکھڑ لہجے میں بولا تھا، لیکن شاہ جی کچھ توقف کے بعد بولے۔

”اور رنگ پور والوں کی کوئی خبر؟“ شاہ جی ساٹ لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

”کچھ نہیں، سجاد حقیقت میں انگلینڈ، معظم، چچا دہلی اور بلاول لاہور میں ہی ہے۔ میں نے ان کے بہت قریبی لوگوں سے پتا کروایا ہے..... سجاد پر سوں پاکستان آئے گا، جبکہ معظم چچا گلے ہفتے۔“

”اور دینا پور والوں کے ملازمین.....؟“ وہ برہمی سے پوچھ رہے تھے۔

”محمود ماموں نے رات سے ان سب کو الٹا لٹکا رکھا ہے، مگر کوئی حرام خور منہ سے کچھ نہیں پھوٹ رہا..... سب کا کہنا ہے کہ رات حویلی میں سینکڑوں گاڑیاں تھیں اور ہزاروں لوگ اکٹھے تھے اتنے ہجوم میں کہاں پتا چلتا ہے کہ کون آیا اور کون گیا؟ جہاں جہاں شک تھا ہر جگہ ماموں کے خاص بندے اچانک چھاپے مارنے گئے ہیں، لیکن کہیں سے کوئی اطلاع نہیں۔ اللہ جانے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔“ حیدر شاہ انتہائی ناگواری سے بتا رہا تھا۔ شاہ جی اس اطلاع سے ایک جھٹکے سے اٹھے، ان کا چہرہ دھکے لگا تھا ایک دفعہ پھر۔

”حیدر کسی کو کہہ کر گاڑی نکلواؤ اور دلاور سے کہو میرے ساتھ چلے مجھے ابھی دینا پور جانا ہے۔“ وہ جھپاک سے کمرے سے نکل گئے۔ ان کے نکلنے ہی شگفتہ شاہ نے آنکھ کے اشارے سے اریبہ اور عروہ کو اندر جانے کا کہا، جبکہ مدیحہ شاہ نے طنزیہ انداز میں اپنی سوکن اور ساس کو دیکھا۔

”حیدر شاہ! اٹھو اور کھانا کھاؤ پتھر، یہ تو ساری زندگی کے سیاپے ہیں، ابھی دو حویلی میں ہی ہیں۔ دیکھو وہ کتنے چاند چڑھاتی ہیں۔“ مدیحہ شاہ کے استہزائیہ لہجے پر شگفتہ شاہ نے شکایتی نظروں سے ساس کو دیکھا، جبکہ حیدر تو ان کی بات پر بھڑک ہی اٹھا۔

”ابھی حیدر شاہ نے چوڑیاں نہیں پہنیں کہ لوگ اپنی مرضی کر سکیں۔ بھون کر رکھ دوں گا، کسی کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ کوئی کسی بھول میں نہ رہے۔“ وہ بھی بہنوں کے کمرے کی طرف منہ کر کے زور سے چلایا تو مدیحہ شاہ فاتحانہ انداز میں مسکرائیں۔

”حیدر.....“ بے جی نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ”بہنیں ہیں تمہاری.....“

”ہونہہ.....“ وہ نفرت سے پھنکارا۔ ”ایسی بے غیرت اور بے حیا بہنوں کے لیے ہماری حویلی کے اندھے کنویں ہی کافی ہیں۔ بے جی ان دونوں سے پوچھیں انہیں ضرور اس ادارہ کے سارے کرتوتوں کا پتا ہوگا۔ وہ کسی کی مدد کے بغیر نہیں بھاگ سکتی۔ یہ پتا تو کبھی نہ کبھی چل ہی جائے گا۔ اس کے بعد میں ان کا ایسا حشر کروں گا کہ لال حویلی میں کوئی لڑکی دوبارہ ایسی جرأت کا سوچے گی بھی نہیں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکنا نہیں اور دھڑ دھڑ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

کمرے میں اب صرف تین خواتین اور ایک چھینے والی خاموشی رہ گئی تھی۔ بے جی نے گھبرا کر اپنی خاندانی ملازمہ سلطانہ بوا کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

گھفٹہ شاہ پتھر کے بت کی طرح ساکت جبکہ مدیحہ شاہ کے لیوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ گھفٹہ شاہ گرتی پڑتی کسی طرح بمشکل اپنی خواب گاہ تک پہنچیں۔ دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے جبکہ آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔

اریبہ اور عروہ اپنی ماں کی یہ حالت دیکھ کر بوکھلا گئیں اور گھبرا کر ملازموں کو آوازیں دینے لگیں۔

* * *

دونوں بازو نیچے کی صورت سر کے نیچے دھرے وہ بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ سی ڈی پلیئر پر ”شہزاد رائے“ کی آوازیں ”وہ لڑکی کتنی سندر تھی“ بہت مدھم سروں میں بج رہا تھا۔ بلاول شاہ کے ذہن کے پردے میں کچھ مناظر متحرک تھے جبکہ ہونٹوں پر بہت خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ اسے وہ شوخ و خشک لڑکی کسی طور نہیں بھولتی تھی جو ایک روز بڑے دھڑلے سے یونیورسٹی پارکنگ میں ان کی لینڈ کروزر کے سامنے آن رکی تھی۔ اس کی خوبصورت جمیل جیسی آنکھوں میں چمکتی شوخی کے برعکس لہجہ خاصا مہذب اور الفاظ کا چناؤ بھی عمدہ تھا۔

”دیکھیں جناب! ہمارا پوائنٹ مس ہو گیا ہے اور ہمیں ہر صورت آدھے گھنٹے میں فورٹریس پہنچنا ہے۔ ویسے تو ہم کوئی ٹیکسی بھی آرینج کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ہمیں پیدل چل کر کیسپس کے مین گیٹ تک جانا ہوگا اور کم از کم میرے نازک پیروں میں اتنی سکت نہیں کہ وہاں تک پیدل مارچ کر سکیں۔ آپ کا روٹ کوئی بھی ہو لیکن یونیورسٹی فیلو ہونے کے ناتے آپ کا فرض بنتا ہے کہ ہماری اس مشکل کا حل نکال سکیں۔ اس احسان کا بدلہ ہم جلد ہی چکا دیں گے جب ہماری گاڑی ورکشاپ سے ٹھیک ہو کر آجائے گی۔“

”اور اس کے آنے کے فی الحال کوئی چانس نہیں۔“ گروپ ہی میں سے کسی نے شوخی سے لقمہ دیا تو بلاول شاہ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس کو گرین سگنل سمجھ کر وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گئی۔

”دیکھیں! ویسے تو ہم اس پارکنگ میں کسی سے بھی لفٹ لے سکتے ہیں لیکن ان بے شمار لوگوں میں سے آپ ہی مجھے کچھ بھلے مانس اور شریف دکھائی دیئے ہیں۔“

”اور اگر میں آپ کو لفٹ نہ دوں.....؟“ بلاول شاہ نے معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے آنکھوں سے براؤن گلاسز اتارے اور گہری نظروں سے اپنے سامنے کھڑی نرم و نازک سی پانچ فٹ چار انچ کی پڑا اعتماد اور شوخ و شریر لڑکی کو دیکھا جس نے وائٹ جینز پر وائٹ گرتہ اور سر پر اسٹائلش سا اسکارف لے رکھا تھا۔ چہرہ ڈھلا ہوا چمکدار اور میک اپ کے بغیر ہی دمک رہا تھا اور ہونٹ لپ اسٹک کے بغیر ہی گلابی اور سراپا گویا سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”اگر آپ لفٹ نہیں دیں گے تو پھر مجبوری ہے ہم آپ کو کوسے ہوئے پیدل مین روڈ تک چل پڑیں گے اور غصے میں سنا ہے کہ فاصلہ جلدی طے ہو جاتا ہے۔“ وہ شرارتی لہجے میں صاف گوئی سے بولی تھی۔ بلاول شاہ کے چہرے پر ایک دفعہ پھر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ویسے تو کسی خوبصورت لڑکی کے لیوں سے گالیاں بھی بری نہیں لگتیں لیکن اگر آپ نے اتنے بے شمار لوگوں میں مجھے ”بھلے مانس“ اور ”شریف“ کا اعزاز بخش دیا ہے تو ہم بھی آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ آپ لوگ تشریف رکھیں بندہ حاضر ہے۔“

”ٹھیکس.....“ وہ بہت بے تکلفی سے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی تھی جبکہ باقی چار پیچھے اسے گھورتی ہوئی خاموشی سے بیٹھ چکی تھیں۔ البتہ ان کے چہروں سے ناپسندیدگی واضح تھی۔

”میں آپ لوگوں کو اغوا کر کے بھی لے جاسکتا ہوں۔“ اس نے یونہی شرارت سے کہا۔ ”آف کورس لے جائیں..... صرف ایک فون کال پر سارے لاہور کی پولیس سڑکوں پر نکل آئے گی اور پھر یہ پانچ لڑکیاں آپ کے لئے پانچ فتنے ثابت ہوں گی کیونکہ ان میں سے ایک کے والد آئی جی ایک کے آرمی میں اعلیٰ عہدے پر دود کے جٹوں اور ایک کے منسٹر واقع ہوئے ہیں۔“ وہ اپنی بات کے اختتام پر کھکھلا کر ہنسی۔

”ڈونٹ وری! جو آپ کو اغوا کر کے لے کر جائے گا اختیارات کی جنگ میں وہ بھی کسی

سے کم نہیں! اس کے والد ایم این اے چچا ایم پی اے بھائی اپنے علاقے کا ناظم آباد اجداد جاگیردار اور چیف آف آرمی سٹاف کا تعلق بھی اسی کے خاندان سے ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔ اب کہ اس نے تھوڑا سا مڑ کر بڑے غور سے اسے دیکھا۔ وائٹ کلف لگے شلواری قمیص میں بیٹھے ہوئے بھی اس کا قد خاصا دراز محسوس ہو رہا تھا۔ صاف شفاف برادری آنکھیں مغرور ناک اور گھنی مونچھوں کے نیچے اس کی مسکراہٹ خاصی متاثر کن تھی۔ بائیں ہاتھ میں قیمتی گھڑی وینڈ سکرین کے پاس بے پروائی سے پڑے دو موبائل فون اور اس کے لباس سے اٹھتی بھینسی سی خوشبو کی قیمتی کلون کا پتا دے رہی تھی۔

”دیش گریٹ!“ وہ توصیفی لہجے میں بولی تھی۔ ”ہم اغوا ہونے کے لئے تیار ہیں! کیوں گرلز.....؟“ وہ پیچھے مڑ کر اپنی فرینڈز کی طرف دیکھ کر بولی تھی جبکہ لہجے میں شرارت کا عنصر نمایاں تھا۔

”ہونہہ سنا تھا کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور جب جاگیرداروں کی شامت آتی ہے تو وہ کیا کرتے ہیں؟ اس کا اندازہ آج ہو گیا ہے۔“ ان میں سے ایک خاصے ترش انداز میں بولی تھی۔ بلاول شاہ کے چہرے سے مسکراہٹ ایک لمحے میں غائب ہو گئی۔

”محترمہ..... آپ نے شاید جاگیرداروں کے بارے میں سنا ہے! ان سے واسطہ کبھی نہیں پڑا ہوگا ورنہ ان کے علاقوں میں جیسی ان کی حکومت ہوتی ہے حکومت، وقت کو بھی وہاں پر مارنے کی مجال نہیں ہوتی اور جن عہدوں کی آپ بات کر رہی ہیں ایسے کئی“ کئی آفیسر ہماری حویلیوں میں صرف سلام کرنے اور حاضری دینے کے لیے صبح شام آتے ہیں۔“ وہ خاصے تلخ لہجے میں جواب دے کر اپنی گاڑی کی سپیڈ بڑھا چکا تھا۔

”آئی ایم سوری..... ارم کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔“ اس نے فوراً نشتر منہ لہجے میں صفائی دینے کی کوشش کی جبکہ وہ خاموش رہا۔ فورٹریس کی پارکنگ میں گاڑی ٹوک چکی تھی۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔

”آپ لوگوں کا تعلق جتنی بھی ہائی اتھارٹیز سے ہو لیکن میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آئندہ ایسے کسی سے لفٹ لینے سے پہلے ہزار دفعہ سوچ لیا کریں! کیونکہ لڑکی کی عزت خاصی قیمتی اور انمول ہوتی ہے خواہ وہ کسی جیشن یا بریگیڈیئر کی بیٹی ہو یا کسی مزارع یا موچن کی! وہ ایک دفعہ

چلی جائے تو دنیا کی کوئی اتھارٹی اسے واپس نہیں لاسکتی اور شیطانی لوگ کسی قانون یا عہدے کو نہیں دیکھتے۔“ وہ رکا اور پھر سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”اور ضروری نہیں ہوتا کہ ہر دفعہ آپ کو مجھ جیسا بندہ ہی ملے جو آپ کو واقعی آپ کی منزل پر پہنچا دے۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں! بہت تیزی سے گاڑی کو بیک کیا اور اگلے ہی لمحے وہ اسے جہاز کی طرح اڑائے جا رہا تھا جبکہ سائیڈ مرر سے ان پانچوں کے ہکا بکا سخت زدہ چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

درانی ہاؤس میں آج جشن برپا تھا۔ سفید ٹائلوں والے اس بنگلے کی ڈیکوریشن فنکشن کے حوالے سے قابل دید تھی۔ روشنیوں کا ایک سمندر تھا اور پورے شہر کی کریم جیشن نعمان درانی کے وسیع و عریض لان میں ”ڈنز“ کے لیے اکٹھی تھی۔ یہ فنکشن جیشن نعمان کے بڑے بیٹے عائش درانی کے سی ایس ایس میں ٹاپ کرنے کی خوشی میں منعقد کیا گیا تھا۔

بنگلے کے باہر گاڑیوں کی ایک طویل قطار تھی۔ ڈنکا کا اہتمام اگرچہ لان میں تھا لیکن بنگلے کے شاندار ڈرائنگ روم میں بھی کچھ خاص الخاص مہمان خوش گپیوں میں مگن تھے۔ بڑا سا ہال کرا جہاں چار قسم کے قیمتی صوفہ سیٹ رکھے تھے انتہائی خوبصورت بلیو اور وائٹ پھولوں والے کارپٹ سے ہم رنگ پردے اور چھت پر قیمتی فانوس لٹک رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کے کارنر شیڈ پر لگی بیش قیمت تصاویر درانی فیملی کے عمدہ ذوق کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔

”خدا کا خوف کرو تا باب! تم پچھلے ایک گھنٹے سے میک اپ کرنے میں مگن ہو اور وہاں ریسپشن پر ماما کوئی ہزار دفعہ تمہارا پوچھ چکی ہیں اور میں بہانے بناتا کرتنگ آ گئی ہوں۔ بند کرو یہ لیپا پوتی اور شرافت سے نیچے چلو۔“ رملہ دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ آتے ہی ڈرائنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی اور اپنی بہن کی میک اپ کٹ کو بند کر دیا۔

”یار کیا پرابلم ہے تم دو منٹ انتظار نہیں کر سکتیں۔“ وہ اب بہت مہارت سے آنکھوں پر آئی لائٹر لگا رہی تھی جبکہ لہجے میں بیزاری اور کوفت تھی۔

”جسٹ شٹ اپ! کوئی دو منٹ اور نہیں! میں ورنہ جا کر عائش بھیا کو اوپر بھجواتی ہوں! حد ہو گئی سارے مہمان حاضر ہیں اور میزبان غائب.....“ رملہ نے بے تحاشہ غصے میں تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا آئی لائٹر ٹیبل پر پٹا اور خونخوار نظروں سے اپنے سے دو سال بڑی بہن کو دیکھا۔

”نیچے لان میں ماما پاپا عائش بھیا، رمیض اور تم سب موجود ہو۔ میں نے آ کر کون سے جھنڈے گاڑنے ہیں یا اکیس توپوں کی کسی کو سلامی دینی ہے۔“ وہ ایک دفعہ پھر مسکارا لگانے میں مصروف ہو گئی۔

”مردم! میں جا کر ماما کو بھیجتی ہوں۔“ وہ غصے میں داک آؤٹ کر گئی۔

نایاب نے میک اپ کٹ بند کر کے دراز میں رکھ دی اور ہنر برش اٹھا کر اپنے کھلے سلی بالوں میں پھیرا۔ اسی لمحے دروازہ ایک دفعہ پھر کھلا۔ نایاب کا دل دھک کر کے رہ گیا، لیکن اس دفعہ ماما کے بجائے اپنے گروپ کی امبر اور ارم کو دیکھ کر اس کی سانس بحال ہو گئی۔

”خدا کی قسم! آفت لگ رہی ہو۔“ امبر نے رشک آمیز انداز میں کہا جبکہ ایک تقاخر آمیز مسکراہٹ نے نایاب کے چہرے پر بسیرا کر لیا تھا۔ نایاب نے ایک دفعہ پھر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھا۔ ”بلیک شارٹ سیلوئس شرٹ اور ٹراؤزر میں اسکی چھب نرالی تھی۔ چہرے کے دلکش نقوش کو اس نے آج میک اپ کے ذریعے خوب ابھارا تھا۔

”اب اگر آپ اپنا حسن مجسم دیکھ کر تھک چکی ہوں تو نیچے لان میں تشریف لے آئیں۔ وہاں ہم نے ایک ایسی ہستی کو تشریف فرما دیکھا ہے جسے دیکھتے ہی اس دن والی ذلت کی یاد تازہ ہو گئی..... ہم نے سوچا کہ اس کا رخیر میں صرف ہم کیوں جلیں، آپ کو بھی شامل کیا جائے۔“ ارم کے شرارتی لہجے پر نایاب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں سمجھی نہیں.....“ وہ ان کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی تھی۔

”ساری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی محترمہ جلدی کیا ہے؟“ ارم نے اپنے مخصوص طنزیہ

لہجے میں کہا۔

”بکواس بند کرو اور آرام سے بتاؤ کس کی بات کر رہی ہو۔“ وہ حقیقتاً نہیں سمجھی تھی۔

”اندازہ کرو! اتنے ایجوکیٹڈ والدین کی اولاد کا انداز گفتگو کیسا ہے؟ انکل نعمان سن لیں تو تمہیں فوراً قتل کر دیں اور عائش بھیا اپنی سی ایس ایس کی پوزیشن کو چھپاتے پھریں کہ بہن کتنی جاہل اور..... بدزبان اور.....“

”اچھا! اچھا اپنی فضول باتیں بند کرو۔“ نایاب نے امبر کو درمیان میں ہی ٹوکا۔

وہ لوگ روشنیوں اور برقی قہقروں سے سجے لان میں پہنچ چکی تھیں۔ ”ڈراسوئنگ پول کے پاس بیٹھے گروپ کو غور سے دیکھو۔“ امبر نے ایک درخت کی اوٹ میں ہوتے ہوئے

دانت دھیسے لہجے میں کہا۔

”کہاں.....؟“ وہ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسٹیج پر موجود سنگرز کا گروپ دھیمی موسیقی سے سب کو لطف اندوز کر رہا تھا۔

”اوٹ کی طرح گردن اٹھا کر مت دیکھو جاہل لڑکی۔“ امبر نے ڈانٹا۔

”تو پھر کیسے دیکھوں، ہر طرف تو مجھے پاپا اور ماما کے ملنے جلنے والے نظر آ رہے ہیں۔“ اس نے قدرے ناراض لہجے میں کہا۔

”یار سوئنگ پول کے دوسرے کنارے پر موجود ٹیبل پر بیٹھے لوگوں کو غور سے دیکھو تمہارے کزن اشعر کے ساتھ والی چیز پر بلیک ڈنرسوٹ میں کون ہے؟ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو ویسے ہینڈم اور سارٹ گائیز تمہیں دو میل دور سے بھی نظر آ جاتے ہیں۔“ امبر جھنجلا کر بولی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ نایاب کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ ”یہ تو وہی ہے لینڈ کرہزر والا.....“ اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

”جی جناب! اب تمہارے دیدے پورے کھلے ناں جس کی پرسنالٹی اور گاڑی دیکھ کر تمہاری رال فیک پڑی تھی اور محترمہ نے ارم سے پورے پانچ ہزار کی شرط لگائی تھی کہ اسی گاڑی میں تمہیں فورٹریس لے کر جاؤں گی۔“ امبر نے یاد دلایا۔

”اور وہ جاتے جاتے خاصی بے عزتی بھی کر کے گیا تھا، یہ بھول گئیں؟“ ارم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں یار لیکن یہ عائش بھیا کے بیٹ فرینڈ اشعر کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟“ نایاب نے جھنجلا کر پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا کہ کیا کر رہا ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ اگر اس نے ہمیں دیکھ کر اشعر بھائی اور عائش بھائی کو اس دن والا واقعہ سنا دیا تو پھر گھر والوں کی چھترول سے کیسے بچتا ہے۔“ امبر کی پریشانی بجا تھی۔

”یہ البیشہ اور منائل کہاں ہیں؟“ نایاب کو اچانک یاد آیا کہ ان کے گروپ کے دو اہم ممبر غائب ہیں اور اشعر بھائی تو منائل کے بڑے بھائی بھی تھے۔

”وہ دونوں لان کے دوسرے کنارے پر نسبتاً تاریک ٹیبل پر بیٹھی ہیں تاکہ اس منحوس کی

نظر نہ ان پر پڑ جائے اور تمہیں تو پتا ہی ہے کہ منائل کی اپنے بڑے بھائی سے جان جاتی ہے اور وہ دونوں اس وقت سے تمہیں اور ارم کو کوس رہی ہیں کہ اس دن والے انڈونچر کے پیچھے سراسر تم دونوں کا ہاتھ تھا۔“ امبر نے اطلاع دی۔

”یار! اتنے ہینڈم اور ڈشنگ بندے کو کم از کم میرے سامنے تو منخوس نہ کہو قسم سے میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔“ نایاب کے چہرے کی رنگت بحال ہو چکی تھی اور وہ امبر کے جھانپڑ پر اپنے بازو کو سہلاتے ہوئے خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”یہ تمہاری حسن پرست فطرت کسی دن ہمیں مردائے گی۔“ امبر نے چبا کر کہا۔

”لو ارم اپنے ایمان سے بتاؤ اس ٹیبل پر اس کے علاوہ کوئی اور بندہ اتنا ڈشنگ ہے۔“ وہ اتنی دور سے اس کے چہرے کے نقوش کی خوبصورتی کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے اشعر بھائی کی بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔

”تم جاؤ اور اس یونانی اپالو کو خراج تحسین پیش کرو اور مزید اس سے بے عزتی کرو۔“ میں اور ارم وہاں منائل لوگوں کی ٹیبل پر جا رہے ہیں۔“

”اچھا! اچھا زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ذرا لان کے پیچھے والی سائیڈ سے چلتے ہیں۔ منائل کی تو جان نکل رہی ہوگی۔ وہ تو ہے ہی ڈرپوک اور چڑیا جتنا اس کا دل ہے۔ اسے تو یہی لگ رہا ہوگا کہ وہ اتنی دیر سے اس کے بھائی سے انہی کے متعلق باتیں کر رہا ہوگا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

راستے میں اپنے ملنے والے لوگوں سے ہیلو ہائے کرتی وہ لوگ اپنی مخصوص ٹیبل پر پہنچیں تو واقعی منائل کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ ہراساں نظروں سے اسی ٹیبل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر نایاب کھلکھلا کر ہنسی اور اسی لمحے اشعر بھائی اور اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ نایاب کا قہقہہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔ وہ اپنا کھلا منہ بند کرنا بھول گئی تھی جبکہ اشعر بھائی اس کے ساتھ وہیں آ رہے تھے۔

”لو مارے گئے۔“ ایبہ کے منہ سے نکلا۔

”یہ کم بخت ہمیشہ مرواتی ہے“ کبھی لفٹ لے کر اور کبھی منہ پھاڑ کر جالوں کی طرح قہقہے لگا کر۔“ منائل تیزی سے بولی تھی۔

”آل ٹو جلال ٹو۔“ امبر زیر لب یہ ورد کرنے لگی۔

”ہائے گرلز! ہاؤ آر یو ایوری باڈی۔“ اشعر بھائی نے خوش دلی سے انہیں مخاطب کیا جبکہ ان پانچوں نے بھی چونکنے کی ایکٹنگ کی اور زبردستی مسکرائیں۔

”بلاول یہ میری چھوٹی سسٹر منائل ہے جبکہ یہ چاروں اس کی فرینڈز امبر، ایبہ اور نایاب ہیں۔“ اشعر بھائی نے آتے ہی ان کا تعارف کروایا۔ وہ تھوڑا سا سرخم کر کے مسکرایا جبکہ آنکھوں میں شناسائی کی کوئی چمک نہیں تھی۔

”اور یہ“ نایاب“ ہیں عائش کی سب سے چھوٹی سسٹر“ آج کل ماس کیونیکیشن میں ماسٹرز کر رہی ہیں۔“ اشعر بھائی نے شاید عائش بھائی کے حوالے سے اس کا تعارف کروانا ضروری سمجھا تھا۔

”گڈ۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد یہ بھی اپنے بھائی کی طرح سی ایس ایس میں ٹاپ کریں گی۔“ وہ پرسکون انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔

”سوری! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو ماسٹرز بھی پاپا اور ماما کے ڈر سے کر رہی ہوں۔“ اس کے صاف گوئی سے کہنے پر سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور کچھ اس کے چہرے پر شناسائی کا کوئی بھی رنگ نہ دیکھ کر ان پانچوں کی رنگت بحال ہو چکی تھی۔

”سوری اشعر بھائی! آپ نے ان کا تعارف نہیں کروایا؟“ نایاب نے بھی اجنبیت کی انتہا کر دی۔

”اوہ وہاں یہ میرا بہت اچھا دوست بلاول ہے۔ میرے ساتھ ہی اس نے ایل ایل بی کیا تھا۔ کچھ عرصہ ہم باہر بھی اکٹھے رہے اور آج کل یہ پنجاب یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کر رہا ہے۔ ملتان سے تعلق ہے۔ ایک دفعہ ہم لوگ اس کی حویلی بھی گئے اور ان کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آج یہ میرے بے انتہا اصرار پر یہاں آیا ہے۔“ اشعر بھائی بہت محبت بھرے انداز میں اس کا تعارف کروا رہے تھے جبکہ وہ بے پروائی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”کم بخت! پورا ایکٹر ہے۔“ امبر نے سرگوشی کی۔

”اوکے جی ٹائکس ٹو میٹ یو۔۔۔۔۔۔“ وہ تھوڑا سا جھکا۔ اشعر بھائی کو اپنے ایک اور ملنے والے نظر آ گئے تھے وہ اسے لے کر آگے بڑھ گئے۔

”یار! اس منخوس نے تو ہمیں پہچانا ہی نہیں۔“ امبر کو خاصا صدمہ ہوا تھا۔

وہ اس وقت سے خود کو کوس رہی تھی جب اس نے ملازمہ کی بات سن کر بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی کرنے کا بے وقوفانہ فیصلہ کیا تھا، مگر اب فیصلے کی ریٹیم ڈور اس کے ہاتھوں سے پھسل چکی تھی اور وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ یہ گھناؤنی حرکت کرنے کا مقصد کیا تھا اور اسے کرنے والے کون لوگ تھے۔ بابا سائیں کے سیاسی مخالفین، یا حیدر لالہ کا کوئی اوجھا دشمن.....؟

کوٹھری کا دروازہ چرچا ایا..... مومنہ کا دل دھل اٹھا۔ اس نے چونک کر کھڑکی کی سلاخوں سے دیکھا سامنے دائیں جانب بنی کوٹھری سے ایک پچاس بچپن سالہ بوڑھی عورت سٹیل کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا لباس میلا بال اُلجھے ہوئے اور پڑا گندہ تھے۔ ناخن گندے اور آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے بند ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے پیچھے اسی کی عمر کا ایک بوڑھا تھا، لیکن اس کی جسمانی حالت خاصی قابل رشک تھی۔ وہ اس عمر میں بھی خاصا توانا اور چوکس لگ رہا تھا۔ اس کے کندھے پر رائفل تھی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ وہ بوڑھی عورت سٹیل کے ٹرے جگ چارپائی پر رکھ کر مڑی تو مومنہ نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بوڑھا دروازے میں ہی کھڑا تھا، لیکن اس کی تیز اور عیار آنکھیں مومنہ پر تھیں۔

”تم کون ہو؟ مجھے کس نے یہاں قید کیا ہے؟ مجھے نکالو یہاں سے“ میرا دم گھٹ جائے گا۔“ وہ دل گرفتگی سے اس کے کندھے کو تھام کے لجاجت سے بولی تھی۔ اس بوڑھی نے پاٹ چہرے سے اسے دیکھا، وہ بالکل خاموش تھی۔

”مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو؟ مجھے کس نے یہاں رکھا ہے؟ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں سید سجاد حسین شاہ کی بیٹی ہوں، وہ یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ ساری انتظامیہ کو ہلا دیں گے۔ وہ ایسی حرکت کرنے والوں کو گھناؤنی سزا دیں گے۔“ وہ ہڈیانی کیفیت میں تھی۔ ان دونوں کی خاموشی اس کے اشتعال میں اضافہ کر رہی تھی۔ بوڑھی عورت نے انتہائی سردمہری سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا تھا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ گونگی اور بہری ہے اور اس کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس لیے وہ اپنی توانائی ضائع نہ کرے۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی..... بے یقینی سے اس نے بوڑھی عورت کو دیکھا۔ اسی لمحے اس بوڑھے نے ذرا سختی سے بازو پکڑ کر اس عورت کو باہر کی طرف کھینچا اور باہر نکال کر کمرے کی کنڈی لگا کے مضبوط سا تالا لگا دیا۔ وہ دونوں اسی کوٹھری میں پھر غائب ہو چکے تھے۔

”دفع کرو پتا نہیں کتنی آیتیں پڑھ پڑھ کر اس کم بخت پر میں نے پھونگی تھیں کہ اس کی آنکھوں میں موتیا اتر آئے۔ اس کا ذہن کام کرنا چھوڑ دے..... ورنہ اگر وہ اشعر بھائی کے سامنے کچھ پھوٹ دیتا تو میری ٹانگوں کی گاڑی کوئی نہیں دے سکتا تھا۔“ منال نے اس کے جاتے ہی بے تکلفی سے کہا۔ اس کا دل اب جا کر کہیں ٹھکانے پر آیا تھا۔ لیکن نایاب اور امبر کو اس کی کمزور یادداشت پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔

* * *

ایک طویل کنھن اور صبر آزمائیاں کا اختتام ہو چکا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں، ہتھیلیوں اور چہرے پر بارش کے پانی کی طرح برس کر اب ختم ہو چکے تھے تیز روشنیوں والا دن طلوع ہو چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت نے ہر چیز کو روشن کر دیا تھا۔ ایک اضطراب سا اس کے قلب میں پنا تھا۔

اس نے دیکھا یہ ایک پرانا اور اجڑا سا مکان تھا۔ جس کے درو دیوار میں خشکی کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کو جس کمرے میں بند کیا گیا تھا اس کی واحد کھڑکی کے آگے چھوٹا سا برآمدہ اور برآمدے کے آگے مختصر سامکن تھا۔ محن کے دائیں جانب ایک چھوٹی سی کوٹھری اور سامنے ہی بینڈ پمپ تھا۔

بینڈ پمپ کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا پیا، بلکہ اب پیاس کی شدت سے اسے اپنے ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے صرف رات کا خوفناک واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے بھائی کی حویلی میں ان کے پوتے کا حقیقہ اٹینڈ کرنے اپنی بہنوں عروہ اور اریبہ، پھپھو حیدر لالہ اور کچھ ملازمین کے ساتھ آئی تھی اور کھانے سے کچھ دیر پہلے ایک ملازمہ نے اسے کہا کہ باہر حویلی میں اس کے حیدر لالہ اسے بلارہے ہیں۔ کوئی بہت ضروری کام ہے۔ اسے خاصی حیرانی ہوئی، لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر فوراً وہ اس ملازمہ کے ساتھ حویلی کے نسبتاً سنسان گوشے کی طرف چلی آئی جہاں ان کی لینڈ کروزر سے ملتی جلتی گاڑی کھڑی تھی اور گاڑی سے کچھ فاصلے پر ہی کسی نے پیچھے سے اچانک آ کر ایک رومال اس کی ناک پر رکھا۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی، لیکن آہنی ہاتھوں نے اس کو مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ خوف اور دہشت سے بے ہوش ہو گئی اور جب آنکھیں کھلیں تو اس کی قسمت سوچتی تھی اور وہ اس ویران کھنڈر نما گھر میں قید تھی۔

”میں جانتی ہوں پتر! میرے ان بوڑھے ہاتھوں میں ہلی ہے۔ تم شاہ کی باتوں کا برا مت مناؤ۔ وہ غصے میں تو اپنے گئے باپ کا بھی لحاظ نہیں کرتا تھا۔ ایک تو چار بہنوں کی ذمہ داری اور پھر آگے سے خدا نے تین بیٹیاں دے دیں بس انہی باتوں نے اس کے اندر تلخی اور گھٹن بڑھا دی ہے۔“ ماں جی نے دانستہ بیٹے کی طرف سے صفائی دی۔

”میں جانتی ہوں بے جی! لیکن یہ دیکھیں کہ چوبیس سال ہو گئے ہیں مجھے لال حویلی میں آئے ہوئے۔ میں نے بھی کسی تکلیف پر اُف نہیں کی۔ وہ شادی کے تیسرے سال ہی میرے اوپر سوکن لے آئے، لیکن میں چپ رہی۔ مدیحہ آپ کے سامنے ہی میرے ساتھ کتنا برا سلوک کر جاتی ہے، لیکن میں نے اور میری بیٹیوں نے کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ وہ بیٹے کی ماں بن کر سمجھتی ہے کہ اس نے ساری دنیا خرید لی ہے۔ یہ تو میرے مولا کے کام ہیں وہ جس کو مرضی جس چیز سے نوازے، لیکن انسانوں کو تو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے ہی جیسوں کی زندگیوں کو تنگ کر دیں۔“ گلشن شاہ نے پہلی دفعہ ساس کے سامنے شکوہ کیا تھا۔ بے جی کم صم اسے دیکھے گئیں۔ وہ رو دینے کو تھیں۔

”میری بچی کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے حویلی کی روایات کے برعکس باپ سے ضد کر کے کالج میں داخلہ لیا۔ آپ کے سامنے پردے والی جیب میں وہ چار سال کالج جاتی رہی اور کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ تو چار سالوں میں پہلی دفعہ اس بچی کی کیمپلی حویلی دیکھنے کے شوق میں زبردستی ساتھ چلی آئی اور جاتے ہوئے بے پروائی سے اپنا موبائل فون بھول گئی۔ وہ بھی فوراً مومنہ نے لاکر حیدر کو دیا کہ اس کے گھر ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دے اور مدیحہ نے میری بچی پر بہتان لگا دیا کہ یہ اس نے خود رکھا ہوگا اور اب کالج ختم ہونے پر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی ہوگی، اس لیے واپس بھجوا رہی ہے۔“ گلشن شاہ کے لہجے اور آنکھوں سے نئی چمک رہی تھی۔

”بس پتر! رقابت کی آگ بندے کو بہت جلاتی ہے۔ ایک ہل کو سکون نہیں لیتے دیتی۔ اللہ اسے عقل دے۔ صبر سے کام لو اور دعا کرو کہ اللہ ظالموں کے دل میں رحم ڈال دے۔“ بے جی نے بہت مدہم لہجے میں اپنی بہو کو تسلی دی۔

”یہ اربہ اور عروہ کہاں ہیں؟“ انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بے بسی سے کمرے کے کونے میں ٹوٹے دروازے والے گندے واش روم کو دیکھا، جس کے ٹل سے پانی کے بجائے شوشوں کی آوازیں آتی تھیں۔ سٹیل کا گندا سا گلاس اٹھا کر اس نے پانی ڈالا اور ہاتھ دھوئے۔ اپنی چادر سے ہاتھ صاف کر کے وہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ چکی تھی۔

گلشن شاہ اپنے ہی خیالوں میں گم تخت پر انگلیوں سے ان دیکھی لکیریں کھینچ رہی تھیں۔ آج کل وہ بیٹھے بیٹھے سوچوں میں گم ہو جاتی تھیں۔ ہر گزرتا دن دل میں ایک نیا دوسرہ جگتا تھا اور ہر رات ہزار اندیشے لیے ایک آسیب کی طرح سینے پر سوار ہو جاتی تھی۔ اب تو خوش گمانیاں بھی دم توڑنے لگی تھیں۔ بے جی نے تاسف بھرے انداز سے لال حویلی کی بڑی بہو کو دیکھا۔

”بیٹا! ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ میرے دل کو ہول اُٹھ رہے ہیں؟ بچیاں کہاں ہیں؟“ بے جی نے تھکر بھرے انداز میں پوچھا تو وہ چونک اٹھیں۔

”بے جی! دن پردن گزرتے جا رہے ہیں اور میری معصوم بچی کی کوئی اطلاع ہی نہیں۔ اللہ جانے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ اب تو ہر دن یکساں لگتا ہے بوجھل، نمناک اور مضطرب۔“

”پتا نہیں لال حویلی کی لڑکیوں کا مقدر اتنا ٹھنڈا کیوں ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ تقدیر ہر بار ہمیں ہی کیوں چنتی ہے؟ کیا فلک کو بجلی گرانے کے لیے ہمارا ہی آشیانہ ملتا ہے۔“ بے جی ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔

گلشن شاہ نے ایک نظر اپنی مہربان سی ساس کے زرد چہرے پر ڈالی۔ گہری پڑتی شام میں ان کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دکھائی دینے لگے۔ ان پر عجیب سی بے بسی طاری تھی۔

”خدا کی قسم ماں جی! میری مومنہ ہر گز آوارہ اور بدچلن نہیں۔ ایک تو پہلو بھی کی اولاد تھی اور پہلی اولاد ہونے کے ناتے شاہ جی بھی نظر کرم اس پر ڈال لیا کرتے تھے۔ کچھ ہماری لاڈلی تھی، اوپر سے طبیعت میں شوخی اور بے پروائی زیادہ تھی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ شاہ جی اس کے بارے میں اتنے گھٹیا الفاظ استعمال کریں گے۔“ بے جی کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔

”بس اندر کہیں چھپ کر بیٹھیں ہوں گی۔ شاہ جی نے دونوں کا سکول اور کالج جانا بند کر
کر دیا ہے۔ دونوں بچیاں خاصی خوفزدہ ہیں۔“

”اور روبینہ بھی کہیں نظر نہیں آ رہی؟“ انہوں نے اپنی بیٹی کا پوچھا۔

”وہ بد قسمت آج کل صنفیہ کے کمرے سے باہر نہیں نکلتی۔ شاہ جی آتے جاتے اسے کھا
جانے والی نظروں سے دیکھتے ہیں۔“ کلفتہ شاہ کے دکھ بھرے لہجے پر بے جی کے چہرے پر
کرب کے سائے پھیل گئے۔

”واہ مولا چار بیٹیاں دیں اور چاروں کی قسمت پر سیاهی پھیر دی۔ سب سے بڑی
روبینہ کی شادی کی۔ دو بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود اس کا میاں ایک سٹیج کی اداکارہ کو اس
کی سوکن بنا لایا اور بیوی کو طلاق دے کر خاندانی دشمنیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر
دیا۔ اس سے چھوٹی کی شادی کی۔ اس نے شادی کے تیسرے سال ہی کنوئیں میں چھلانگ لگا
کر زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اس سے چھوٹی کے لیے خاندان میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ باپ اور بھائی
نے جائیداد بچانے کے چکر میں اس کی شادی ”قرآن پاک“ سے کر کے اسے زندہ درگور کر
دیا اور چوٹی.....“ وہ ابھر کر خاموش ہو گئیں۔ آنسو خود بخود آنکھوں سے پھسل گئے تھے۔

”بے جی! بڑے کمرے میں دلاور آیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ بڑی بی بی نے بلایا ہے۔“
سلطانی بوانے باہر سے اطلاع دی تو انہوں نے چونک کر آنکھیں صاف کیں۔

”ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں اور پھر کچھ چونک کر پوچھنے
لگیں۔ ”یہ تمہارے شاہ جی تو دینا پور گئے ہوئے ہیں اور حیدر سائیں زمینوں پر۔“ سلطانی بوا
نے جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آج وہ دلاور سے تفصیلی بات کرنے کے موڈ
میں تھیں۔ اس حویلی میں دلاور واحد بندہ تھا جسے شاہ جی کا رائج پنڈ ہونے کا اعزاز حاصل
تھا۔ اس کے والدین کسی خاندانی دشمنی میں مارے گئے تھے۔ سید محمد شاہ بچپن میں پہلے
لودھراں گئے اور واپسی پر تین سال کا دلاور ان کے ساتھ تھا۔ وہ اسی حویلی میں پلا بڑھا تھا۔ وہ
حیدر شاہ سے آٹھ سال بڑا تھا لیکن دونوں میں خاصی دوستی تھی اور اب تو اس کا شمار حویلی کے
مالکان میں ہی ہوتا تھا۔

”دلاور! مومنہ کا کچھ پتا.....؟“ بے جی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے تاب سے
پوچھا۔ سفید گرتہ شلوار اور پٹواری چپل میں لمبوس دلاور کے چہرے پر مایوسی اور ناامیدی کے

رنگ نمایاں تھے۔

”بے جی بس دعا کریں۔ میں شاہ جی اور حیدر سے چھپ کر اپنی پوری کوشش کر رہا
ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔“

”ایک عجیب سی مایوسی نے بے جی کو اپنے محاصرے میں لے لیا تھا۔

ہاتھ میں جھاڑن پکڑے اٹھارہ سالہ الہزی ”رسلی“ نے بہت اشتیاق کے ساتھ حیدر
سائیں کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ ایک عجیب سی سرشاری اس کے انگ انگ سے نمایاں
تھی۔ بوسیدہ اور پھیکے سے کاشن کے سوٹ میں بھی اس کی جوانی چھلکی جا رہی تھی۔ حالانکہ
ہرے رنگ کا یہ سوٹ کثرت دھلائی کی وجہ سے خاصا بدرنگ ہو چکا تھا۔ بے پروائی سے
اوڑھنی اوڑھے ہاتھ میں جھاڑن پکڑے اس نے پوری حویلی میں اپنے سب سے پسندیدہ
کمرے میں قدم رکھا۔ میرون نرم نرم قالین پر پاؤں رکھتے ہی اسے عجیب سی طمانیت کا
احساس ہوا۔

پورا کمرہ اس وقت بے ترتیبی سے الٹا ہوا تھا۔ سلک کی بیڈ شیٹ بری طرح سلوٹ زدہ
تھی۔ بیڈ شیٹ پر کئی جگہ سگریٹ کی راکھ ایک لائٹرن مل کا پیکٹ، گیلا توپیا اور پرفیوم کی بوتل
اونٹھی پڑی تھی۔ سائینڈ نیبل پر بے شمار فلمی میگزین کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ رسلی نے ہاتھ میں پکڑا
میلا پکڑا ایک طرف پھینکا اور انتہائی اشتیاق سے سب سے اوپر پڑا فلمی میگزین کھولا جس میں
اسٹیج کی ایک تھرڈ کلاس اداکارہ کے بہت عامیانہ قسم کے پوز تھے۔ بہت دلچسپی سے وہ انہیں
جلدی جلدی دیکھنے لگی۔ اسے رنگ برنگے اور بھڑکیلے لباس والی فلمی ہیروئینیں بہت اچھی لگتی
تھیں بلکہ ایک میگزین سے تو کچھ صفحات پھاڑ کر وہ چوری چوری اپنے گھر بھی لے آئی تھی اور
جب کبھی اماں اور ابا گھر پر نہیں ہوتے تو وہ بہت اشتیاق سے انہیں دیکھا کرتی۔ ایک دفعہ تو
حیدر سائیں جلدی میں ٹی دی بھی چلتا ہوا چھوڑ گئے تھے اور رسلی نے پورا ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر وہ
انڈین فلم بہت شوق سے دیکھی تھی۔ وی سی ڈی کے ذریعے مووی چلانا اسے آتی نہیں تھی ورنہ
حیدر سائیں تو اپنے کمرے سے صبح کو نکلنے تو رات گئے ہی لوٹتے تھے اور حویلی میں ملازمین کی
اتنی تعداد تھی کہ ایک آدھ کی کئی گھنٹے غیر حاضری کا اندازہ مشکل ہی ہوتا تھا۔

رسلی کی والدہ راجوبی بی اور باپ غلام محمد کا شمار حویلی کے پرانے اور وقار ملازمین میں

ڈال لیے تھے۔ اس کے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں کی تمازت سے رسیلی نے گڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ قدرے متحیر ہو کر حیدر سائیں کو دیکھا اور بے چینی سے، بیڈ پر پڑی اپنی میلی اوڑھنی اٹھا کر تیزی سے لپیٹ لی۔ حیدر کو ایک ہل کے لئے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ رسیلی اس کی نگاہوں کی حدت سے گھبرا کر لمحہ بھر کے لیے سہم گئی۔

”حیدر سائیں مجھے اماں نے کمرے میں صفائی کرنے اور جھاڑو لگانے بھیجا تھا۔ میں بس جانے والی تھی۔“ اس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

”چلی جانا، جلدی کیا ہے۔“ وہ بہت تیزی سے اس کے راستے میں آیا تھا۔ رسیلی کو اپنی سانس بحال کرنا دشوار ہونے لگا۔ حیدر سائیں کا رویہ اسے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ ان کی معنی خیز نظریں اور گہرا لہجہ اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکال رہا تھا۔

”سائیں! غلطی ہو گئی۔ آئندہ جلدی چلی جایا کروں گی۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔

”کیوں مجھے نہیں ملا کرو گی۔“ وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لا کر ذومعنی لہجے میں بولا تھا۔

ایک بے خودی کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ وہ بری طرح گھبرا کے کمرے سے نکلنے لگی اور اسی لمحے وہ ہوش میں آیا۔

”رسیلی!.....“ اب کہ اس نے تحکمانہ انداز میں اسے پکارا۔

”جی سائیں!.....“ وہ خوفزدہ انداز میں ہلکی۔ خوف و سراسیمگی نے اس کے گرد حصار سا کھینچ دیا تھا۔

”یہ ڈیرنگ ٹیمبل سے نیلے رنگ کی خوشبو کی بوتل اٹھاؤ اور لے جاؤ۔ آئندہ جب میرے کمرے میں آؤ تو یہی خوشبو لگا کر آنا۔ مجھے خوشبو خوشبوؤں میں بسی اچھی لگتی ہے۔“ اس کے لہجے میں نہ جانے کس جذبے کی حدت تھی۔ رسیلی کو یوں لگا اس کا دل پسلیوں کو توڑ کر باہر آ جائے گا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کمرے سے نکلی اور حویلی کی طویل راہراری سے بھاگتی ہوئی پچھلی سائیڈ پر بنے اپنے گھر میں جا کر ہی دم لیا۔ اس کا چہرہ سرخ اور سانسیں کنٹرول سے باہر تھیں۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے اماں کا جہیز کا پرانا لوہے کا ٹریک کھولا اور ڈھیرے سارے کپڑوں کے نیچے اس نیلی بوتل کو چھپا دیا۔ چارپائی پر لیٹتے ہوئے اس کا دماغ، سرور کے انوکھے نشے میں ہلکورے کھانے لگا۔

ہوتا تھا۔ وہ حویلی کے پیچھے بنے کوارٹرز میں کئی سالوں سے مقیم تھے۔ رسیلی کی پیدائش بھی اسی حویلی میں ہوئی تھی۔ اس نے فلمی میگزین دیکھ کر فوراً کمرے کا حلیہ درست کیا۔ تمام چیزیں اپنے ٹھکانوں پر رکھیں۔ بیڈ شیٹ بدل کر قالین صاف کیا اور اس کے بعد میلے کپڑے سے کمرے کا فرنیچر اور ڈیکوریشن میں اچھی طرح صاف کیے۔ کمرہ آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد ہی چم چم کرنے لگا تھا۔ اس کے بعد اس نے گرین چینی کے ٹائلوں والا اسٹائلس سا ہاتھ روم صاف کیا۔ واش بیسن پر پڑے رنگ برنگے مہنگے صابن دیکھ کر اس کا دل بچل اٹھا۔

دو ہٹا اتار کر اس نے بیڈ پر رکھا اور خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا۔ ڈیرنگ ٹیمبل کے شیشے میں اپنا صاف شفاف چہرہ دیکھ کر وہ شرمائی۔ میمر برش سے بال سیدھے کیے اور سامنے پر فیوژر کے ڈھیر میں سے اس نے گولڈن چمکتی ہوئی شیشی اٹھا کر سونے کی ڈھیر میں سے نئے سے مسحور ہو کر بے اختیار اپنے اوپر دیوانہ وار چھڑکاؤ کرنے لگی۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا بادامی کلف لگے سوٹ میں تیزی سے اندر آتا ہوا حیدر شاہ بری طرح ٹھکا۔ ڈیرنگ ٹیمبل کے شیشے کے آگ دوپٹے سے بے نیاز رسیلی کا خوف سے رنگ اڑ گیا۔

حیدر شاہ کے غصے سے تو حویلی کے سارے ملازمین کانپتے تھے۔ وہ حد درجہ مغرور اکھڑ اور خطرناک حد تک غصیلا مشہور تھا۔ رسیلی کی ٹانگیں کا اپنے لگیں۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ بیڈ پر سے اپنا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ لے۔ پورے کمرے میں ایک مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”یا خدا! آج بچا لے آئندہ حیدر سائیں کے کمرے میں قدم نہیں رکھوں گی۔“ کانپتے

دل کے ساتھ وہ یہی دعا کیے جا رہی تھی۔

حیدر بند مٹھی لبوں پر جمائے غصہ ضبط کرنے کی سعی کرنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ گویا دہکتے لاؤ کے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔ کنپٹی کے قریب کی رگ بڑی طرح پھڑک رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بازو پکڑ کر اس دو ٹکے کی نوکرانی کو کمرے سے نکالتا۔ وہ کچھ قدم آگے بڑھا۔ رسیلی کی سانسوں کے زیر و بم نے اسے وہیں رک جانے پر مجبور کر دیا۔ ایک آتش فشاں جسم اور مدہوش الحظ جوانی نے ایک لمحے میں اس کے گرد ایک سحر انگیز حصار باندھ دیا تھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ آنکھوں میں غصے اور اشتعال کی جگہ ”نرمی“ اور ”اشتیاق“ نے ڈیرے

پی سی بھورین کے اس خوبصورت کانفرنس ہال میں ”پاکستان کا سیاسی ارتقاء اور پریس“ کے حوالے سے ہونے والی کانفرنس کا آخری دن تھا۔ پرنٹ میڈیا کے حوالے سے مختلف اخبارات، میگزین اور رسائل کے چیف ایڈیٹرز، مالکان اور مختلف نمائندے پورے ملک سے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ اس وقت ہال میں حکومتی عہدیداران، سیاسی پارٹیوں کی اہم شخصیات، سیاسی مبصرین اور ذرائع ابلاغ کے مختلف نمائندے موجود تھے۔ کانفرنس کی لمحہ بہ لمحہ کوریج کے لیے فوٹو گرافرز، کیمرہ مین اور صحافیوں کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔ روزنامہ ”سیاست“ کے چیف ایڈیٹر کے خطاب کے بعد ہفت روزہ ”مشعل“ کی میگزین انچارج ”سروی“ کی آمد نے پورے کانفرنس ہال میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ اس وقت ہال میں سناٹا تھا اور مائیک پر سروی کی پڑ اعتماد آواز اور جارحانہ انداز نے ایک لمحے میں حکومتی عہدیداران کے چھکے اڑا دیئے تھے۔ پورے کانفرنس ہال میں لوگوں کی نگاہیں اس تجسس چوبیس سالہ خوبصورت اور خطرناک حد تک بولڈ لڑکی کے وجود پر مرکوز تھیں جو اپنے ازلی بے پردہ انداز میں گویا تھی۔

”پاکستان میں صحافت کا سفر زبان بندی کے حکومتی ہتھکنڈوں اور مصالحت پسندی کے صحافتی رویوں کے نشیب و فراز کا سفر ہے۔ اس سفر میں کبھی آمر حکمرانوں نے اخبارات کو بزور طاقت خاموش کر دیا اور کبھی صحافت نے ضمیر فروشی، جاہ پرستی اور کاسہ لیس کی شرمناک مثالیں قائم کیں۔“ سروی نے ایک لمحے کا توقف کیا۔

کانفرنس ہال کی دائیں رو میں تیسرے نمبر پر بیٹھے ہفت روزہ ”مشعل“ کے چیف ایڈیٹر شیخ ضمیر الدین احمد کے چہرے پر غصے اور تشویش کے طے جلے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طرح اسٹیج پر موجود سروی کا بازو پکڑ کر نیچے اتار دیں اور اس کے ہونٹوں پر ٹیپ لگا دیں۔ وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو چکی تھی۔

”جمہوریت ہمارے لئے اوپر سے نافذ کیا جانے والا ایسا نظام ہے جس کا عمل دخل محض سیاسی ڈھانچوں تک محدود ہے جس کی روشنی ہماری روزمرہ زندگیوں تک نہیں پہنچتی۔ ہم اس سیاسی ڈھانچے میں رہتے جاگیرداری، ذات، برادری اور مذہبی تنگ نظری کی آبیاری کرتے ہیں۔“ شیخ ضمیر الدین نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھے حکومتی منسٹر کے ماتھے کے بلوں کو بہت آسانی سے گن سکتے تھے۔ ان کا چوتھی دفعہ پہلو بدلنا بھی

ان کی زیرک نگاہوں سے نہیں چھپ سکا تھا۔

”حکمران طبقہ جو بندوق سے ”خیال“ ختم نہیں کر سکتا، وہ اب ”خیال“ اور ”خبر“ کے ذرائع پر اجارہ چاہتا ہے۔ جموٹ اور غلط بیانی کے سیلاب میں سچ کی ناؤ کو ڈبونا چاہتا ہے جو کام سنسر کی نیلی پنسل نہ کر سکی وہ وہاں بکا ہوا قلم آزمانا چاہتا ہے۔“ سروی کی گونج دار آواز پورے ہال پر چھائی ہوئی تھی۔

”کون ہے یہ لڑکی.....؟ کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟“ منسٹر صاحب کی جھنجھلائی ہوئی آواز میں کی جانے والی سرگوشی نے شیخ ضمیر الدین کی پریشانی اور تشویش میں اضافہ کر دیا تھا۔ یہ سروی کے صحافتی سفر کا آغاز تھا اور جس جارحانہ طریقے سے اس نے اپنے صحافتی سفر کا آغاز کیا تھا شیخ صاحب کی دور رس نگاہوں نے اس کا خطرناک انجام بھی دیکھ لیا تھا۔

* * *

”ناں بی بی! میں ایسی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔“ ماتھے پر ہل ڈال کر وہ خاصے بیزار لہجے میں بولے تھے۔

”سر میرا نام بی بی نہیں، سروہی جلال الدین ہے۔“ وہ خفا سے لہجے میں بولی۔
 ”ہاں بی بی مجھے معلوم ہے۔ آپ سامنے رکھی کرسی پر تشریف رکھیں۔ مجھ ناچیز کو بہت اچھی طرح علم ہے کہ آپ کا نام سروہی جلال الدین ہے..... اور سروہی کا مطلب ”خنجر کی کاٹ“ ہے، لیکن یہ خنجر میرے ہی گلے پر چلے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ ویسے تو میرے ستارے اسی وقت گردش میں آگئے تھے جب میں نے آپ کے باوا سے پچھلی بیس سالہ دوستی کے صدقے آپ کو اس جاب کی آفر دی تھی۔“ وہ قدرے رکھائی سے اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

”لیکن سر آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ خاصے بھولپن سے پوچھ رہی تھیں۔
 ”یہ بتاؤ کہ کیا نہیں کیا؟“ وہ جھنجھلا کر بولے تھے۔ ”جس دن محترمہ نے میرے میگزین کے لئے پہلا فچر لکھا اس کے اگلے دن میرے دفتر پر فائرنگ ہو گئی، دوسری دفعہ ایک سیاستدان کا انٹرویو اتنے بے باک انداز میں لکھا اس کے چھپنے کے فوراً بعد میرے آفس کی کھڑکیاں، فرنیچر اور اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ تیسری دفعہ کالم لکھا تو میرے اخبار کے اشتہار آنا بند ہو گئے اور میری قسمت خراب کہ اس کے بعد میں بے وقوف آپ کو اتنے ہائی لیول کانفرنس میں لے گیا، جہاں قلم کے بعد آپ کی زبان کے جوہر کھلے اور میں ہکا بکا رہ گیا۔ آپ نے حکومتی عہدیداران کی ایسی تیسری کردی اور اب وہ میری ایسی کی تیسری کرنے کے چکر میں ہیں۔ یہ دیکھیں محترمہ میرے حال پر رحم کریں۔ میرے پاس مزید کوئی اور چیز لوٹانے کیلئے نہیں ہے۔“ انہوں نے باقاعدہ زنج ہو کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”سریہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ حقیقتاً شرمندہ ہو گئی تھی۔
 ”اور کیا کروں..... آپ خود بتا دیں.....؟“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر اکتائے ہوئے لہجے میں بولے تھے۔

”لیکن سر! اب ہوا کیا ہے؟“ وہ قدرے خائف ہو کر پوچھ رہی تھی۔
 ”ہوتا کیا ہے.....؟ مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں کہ یا تو اپنے ہفت روزہ مشعل کو بھی اپنے روزنامے کی طرح بند کرادو یا پھر سروہی بی بی کی زبان بند کرادو۔“

”سر آخر آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے؟ جب سے ہم بی بی سی بھوربن کی وہ کانفرنس اینڈ کر کے آئے ہیں آپ نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔ سارا راستہ بھی مجھ سے بات نہیں کی اور اب آفس آ کر بھی مجھے مسلسل اگنور کر رہے ہیں۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟“ سروہی کے صبر کا پیمانہ آج لبریز ہو ہی گیا تھا۔ شیخ ضمیر الدین کے موڈ کا اندازہ تو اسے کانفرنس والے دن ہی ہو گیا تھا، لیکن اس کی مدت اتنی طویل ہو گئی یہ معلوم نہیں تھا اور پھر آج وہ دودن کی چھٹی کے بعد ”ہفت روزہ مشعل“ کے آفس میں آئے تھے، لیکن چہرے پر ”نولفٹ“ کا بورڈ آج بھی آویزاں تھا۔ شیخ صاحب سپاٹ چہرے کے ساتھ ریو الونگ چیئر پر جمبول رہے تھے۔ سروہی کو اندازہ تھا کہ وہ یہ کام صرف سخت ٹینشن میں کرتے تھے۔ ان کے خشک روپے پر وہ ایک دفعہ پھر گویا ہوئی۔

”میں مانتی ہوں سر کہ اس دن کانفرنس میں میرا انداز کچھ جارحانہ تھا، لیکن دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف سے بتائیں کہ میں نے کوئی ایسی غلط باتیں بھی نہیں کی تھیں۔“ اس کے ”کچھ“ کہنے پر شیخ صاحب کی جمبولی چیئر رک گئی۔ وہ شعلے برساتی نظروں سے اسے گھورنے لگے۔ چہرہ کچھ اور تن گیا تھا۔

”بتائیے نا سر آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے؟ اور پچھلے ایک ہفتے سے آپ ہمارے گھر بھی نہیں آئے۔ بابا بھی بار بار پوچھ رہے تھے اور آپ نے کانفرنس کی جو رپورٹ میں نے لکھی تھی وہ بھی نہیں لگائی..... آخر ہوا کیا.....؟“ وہ خاصی فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے ایک خفا سے نظر اس پر ڈالی جو سارے زمانے کی مصوویت خود پر طاری کئے کھڑی تھی۔

”آپ مجھ سے خفا ہیں ناں.....؟“ اس نے اپنے اندازے کی تصدیق چاہی۔

”ناں بی بی! میں ایسی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔“ ماتھے پر ہل ڈال کر وہ خاصے بیزار لہجے میں بولے تھے۔

”سر میرا نام بی بی نہیں، سروہی جلال الدین ہے۔“ وہ خفا سے لہجے میں بولی۔
 ”ہاں بی بی مجھے معلوم ہے۔ آپ سامنے رکھی کرسی پر تشریف رکھیں۔ مجھ ناچیز کو بہت اچھی طرح علم ہے کہ آپ کا نام سروہی جلال الدین ہے..... اور سروہی کا مطلب ”خنجر کی کاٹ“ ہے، لیکن یہ خنجر میرے ہی گلے پر چلے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ ویسے تو میرے ستارے اسی وقت گردش میں آگئے تھے جب میں نے آپ کے باوا سے پچھلی بیس سالہ دوستی کے صدقے آپ کو اس جاب کی آفر دی تھی۔“ وہ قدرے رکھائی سے اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

”لیکن سر آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ خاصے بھولپن سے پوچھ رہی تھیں۔
 ”یہ بتاؤ کہ کیا نہیں کیا؟“ وہ جھنجھلا کر بولے تھے۔ ”جس دن محترمہ نے میرے میگزین کے لئے پہلا فچر لکھا اس کے اگلے دن میرے دفتر پر فائرنگ ہو گئی، دوسری دفعہ ایک سیاستدان کا انٹرویو اتنے بے باک انداز میں لکھا اس کے چھپنے کے فوراً بعد میرے آفس کی کھڑکیاں، فرنیچر اور اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ تیسری دفعہ کالم لکھا تو میرے اخبار کے اشتہار آنا بند ہو گئے اور میری قسمت خراب کہ اس کے بعد میں بے وقوف آپ کو اتنے ہائی لیول کانفرنس میں لے گیا، جہاں قلم کے بعد آپ کی زبان کے جوہر کھلے اور میں ہکا بکا رہ گیا۔ آپ نے حکومتی عہدیداران کی ایسی تیسری کردی اور اب وہ میری ایسی کی تیسری کرنے کے چکر میں ہیں۔ یہ دیکھیں محترمہ میرے حال پر رحم کریں۔ میرے پاس مزید کوئی اور چیز لوٹانے کیلئے نہیں ہے۔“ انہوں نے باقاعدہ زنج ہو کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”سریہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ حقیقتاً شرمندہ ہو گئی تھی۔
 ”اور کیا کروں..... آپ خود بتا دیں.....؟“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر اکتائے ہوئے لہجے میں بولے تھے۔

”لیکن سر! اب ہوا کیا ہے؟“ وہ قدرے خائف ہو کر پوچھ رہی تھی۔
 ”ہوتا کیا ہے.....؟ مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں کہ یا تو اپنے ہفت روزہ مشعل کو بھی اپنے روزنامے کی طرح بند کرادو یا پھر سروہی بی بی کی زبان بند کرادو۔“

”واٹ.....؟“ وہ حیرت سے چلائی۔

”تمہارے خیال میں میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ بکواس کر رہا ہوں۔“ وہ اشتعال میں آگئے تھے۔ سروہی کو غصہ تو بہت آیا، مگر اسے بے وقت کے غصے کو پینا بھی آتا تھا۔

”آخر سروہ کون لوگ ہیں؟“ وہ قدرے سنبھل کر بولی تھی۔

”وہی جن کی شان میں اس دن آپ نے آدھا گھنٹا خراج تحسین پیش کیا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی دجیاں بکھیر کر خود کو سقراط کی جتنی ثابت کر رہی تھیں۔ وہی معظم علی شاہ صاحب تشریف فرما تھے جو آج کل آپ کا شجرہ نسب کھنگال رہے ہیں ہر تیسرے دن فون آ جاتا ہے کہ شاہ صاحب کو سروہی بی بی کا سیل فون اور گھر کا ایڈریس چاہئے۔“

”کیا.....؟“ سروہی کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا دوسرے ہی پل وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ ”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کیا کہا تھا؟“ وہ تھوڑا سا دھمے ہوئے۔

”ہمیشہ دوستی اور مرقت میں مارا جاتا ہوں۔ اگر تم میرے جگری دوست کی بیٹی نہ ہوتیں تو کب کا دے کر جان چھڑا چکا ہوتا۔ مگر رونا تو یہ ہے کہ تم بھی مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہو یہ اور بات کہ تمہیں اپنے باپ جیسے انکل کے سفید چوڑے کا کوئی خیال نہیں..... جہاں تمہارا قلم نہ چلے وہاں اپنی زبان کے تیر چلا کر مجھ مسکین کے لئے سیاپے اکٹھے کر لیتی ہو۔“ انہوں نے سخت شاکی نظروں سے سامنے بیٹھی سروہی کو دیکھا۔ ان کے تیور خاصے اکھڑے اکھڑے سے تھے۔

”لیکن سرقیتل شفا فی بھی تو کہہ گئے ہیں۔“

قیتل اس سا منافق نہیں کوئی شخص

جو ظلم تو سہتا ہے، بغاوت نہیں کرتا

وہ بڑے بڑے جوش انداز میں بولی تھی۔ شیخ صاحب نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”اور سر! یہ ہمارا حکمران اور جاگیردار طبقہ ہی تو ہے جو قدم قدم پر ہمارا استحصال کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں موسم بدلتے ہیں، حکمران بدلتے ہیں، آئین بدلتے ہیں، شناختی کارڈ اور تاریخ تک بدلتی ہے لیکن ”عام“ آدمی کے حالات نہیں بدلتے۔ قومی چکی کے دو نہیں کئی

پاٹوں میں پس رہی ہے حکمران طبقہ مدہوش ہے جب کہ عام آدمی کے ہوش اڑے ہوئے ہیں۔“ وہ جذباتی انداز میں ایک دفعہ پھر شروع ہو چکی تھی۔ شیخ صاحب نے سخت مایوسی کے عالم میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

* * *

اسے اس تاریک، ویران اور بوسیدہ گھر میں قید ہوئے پورے تین دن گزر چکے تھے..... اب تو وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکی تھی..... بس سورج کے نکلنے سے دن کا احساس ہوتا اور وہ چپ چاپ خاموشی سے کئی کئی گھنٹے چار پائی پر لیٹی رہتی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے سے بھی وہ خاصی تنگ آ چکی تھی۔ باہر محن میں موجود تمام چیزیں اسے ازبر ہو چکی تھیں۔ رات کی تاریکی میں درختوں سے ٹکراتی ہوا کا شور بعض اوقات سماعتوں پر خوف طاری کر دیتا تھا۔

دن میں دو دفعہ گوشتی اماں کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھ جاتی۔ خاموش اور سپاٹ چہرے والی اس خاتون کو دیکھ کر اسے کچھ زندگی کا احساس ہوتا، مگر وہ بہ مشکل ایک منٹ کیلئے آتی اور ٹرے رکھ کر پرانے اور گندے برتن اٹھا کر مشینی انداز میں واپس لے جاتی۔ اب تو مومنہ نے اسے مخاطب کرنا ہی چھوڑ دیا تھا..... آج تین دن کے بعد وہ کھانے کی ٹرے کے ہمراہ کپڑوں کا ایک شاپر بھی ساتھ لائی تھی، جس میں اس کے ناپ کے ماسوٹ تھے۔ صاف ستھرے کپڑے دیکھ کر اسے اپنے جسم پر موجود میلے لباس کا احساس ہوا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی نفیس طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اپنا پہنا ہوا سوٹ اتار کر دوسرا سوٹ زیب تن کر لیا۔

اسے وہاں آئے پورے چھ دن گزر چکے تھے اور اعصاب پر پڑھنے والا بوجھ اب خاصا کم ہو گیا تھا، کیونکہ اس نے خود کو مقدر کے حوالے کر دیا تھا..... اسے معلوم تھا کہ حویلی میں ایک قیامت آ کر گزر چکی ہوگی..... اس کی سوتیلی ماں مدیحہ شاہ نے تو اپنی فحش کا جشن منایا ہوگا، البتہ حیدر لالہ کے غصے کا اندازہ وہ کر سکتی تھی..... اس کی اکھڑ مزاجی اور بد مزاجی تو پورے گاؤں میں مشہور تھی۔

”آخر مجھے انگو اکس نے کروایا ہے؟“ وہ سیکڑوں دفعہ سوچ چکی تھی۔

”بابا جان کے کسی سیاسی حریف نے؟“

”حیدر لالہ کی کسی دشمنی کا نتیجہ.....؟ یا پھر کسی اور نامعلوم رنجش کا خلیازہ.....؟“ ایک گہرے تفکر نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ اس کے جسم کا سارا خون خڑچکا تھا اور وہ ہنوز سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ ادھر حویلی میں بھی اس کے لئے زندگی پھولوں کی بیج تو نہیں تھی، مگر اسے معلوم تھا بابا جان اور حیدر لالہ نے عروہ اور اربیبہ پر زندگی خاصی تنگ کر رکھی ہوگی۔ مومنہ کا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

ساتویں دن اس ویران سے ڈیرے میں بنے گھر کے باہر رکنے والی جیب کی آواز مومنہ کی سماعتوں کو خاصا چونکا گئی..... اسے ایک دم اپنے ارد گرد زندگی کا احساس ہوا تھا۔

”کون ہوگا یہ.....؟“ جیب کا دروازہ کسی نے بہت زور سے بند کیا تھا۔ مومنہ کا دل بے اختیار دھڑکا..... وہ ایک سرعت سے اٹھ کر بیٹھی..... اور لپک کر اس نے کھڑکی سے جھانکا۔ کوئی بلاسٹ نہیں ہوا تھا..... لیکن وہ بھونچکی سی سامنے اندر آتے بندے کی شکل دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو تیزی سے ملا جیسے دیکھنے میں مغالطہ ہوا ہو۔

”کیا ہوا مومنہ پیر محمد شاہ! اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کیا.....؟“ چڑا دیے والے لہجے میں دریافت کیا گیا تھا۔ ”بہت مان تھا تمہارے باپ کو لال حویلی کے مالک ہونے کا۔ اتنا صدمہ تو اسے اپنے انکیشن ہارنے کا نہیں ہے جتنا لال حویلی کی سید زادی کے اغوا کا ہے۔ اس کے پالتو کتے پاگلوں کی طرح تمہاری تلاش میں ہیں۔“ اس کا انداز دل جلانے والا تو تھا ہی، لیکن لہجہ اس سے بھی زیادہ تیکھا تھا۔

”کیوں کیا تم نے سجاد لال ایسا.....؟“ مومنہ کی بمشکل آواز نکلی تھی۔ جان ٹانگوں کی حد تک تو نکل ہی چکی تھی۔ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

”کیوں کیا.....؟“ سجاد لال شاہ نے تیزی سے بات کاٹی اور طنزیہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ ”مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا.....؟ ذرا اس لال حویلی کے خدائی فوجدار سے جا کر پوچھو اس کے نام نہاد گھنٹیا اصولوں نے مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کیا۔ اس کو شوق سے لال حویلی کے اندر خواتین کا جمعہ بازار لگانے کا..... پہلے میری ماں کو اپنی ضد اور جھوٹی اتا کی وجہ سے طلاق دلوائی، پھر ذکیہ خالہ کی شادی ان سے بیس سال چھوٹے بچے کے ساتھ کر کے انہیں خود کشی پر مجبور کیا، پھر آمنہ خالہ کی شادی قرآن پاک سے کردی اور اب

”رنگ پور“ میں پیغام بھجوائے جا رہے تھے کہ سجاد لال شاہ کو کہو کہ مومنہ کو فارغ کر دے۔ میں بچپن کے نکاح کو نہیں مانتا۔ ہونہہ!“ اس نے تنفر سے تھوکا تھا۔

”میں سب کچھ ہو سکتا ہوں لیکن بزدل اور بے غیرت نہیں.....“ وہ انتہائی تنفر بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”لیکن اس میں میرا کیا قصور.....؟“ مومنہ کی آنکھوں سے اشک بہنے لگے۔

”تم جو چاہو مرضی سوچو، میں کوئی لمبی چوڑی بات یا تقریر نہیں کروں گا۔ لال حویلی واپس جانے کا خیال دل سے نکال دو۔“ سجاد لال شاہ کے لہجے میں غضب بلا کا، مگر انداز دھیمہ تھا۔ آخر کچھ بھی تھا اسے اپنی یہ نازک اور دلکش خدو خال کی کزن عزیز بہت تھی۔

”لیکن مجھے یہاں نہیں رہنا۔“ وہ روتے روتے زور سے چیخی۔

”ٹھیک ہے.....“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”تم شہر میں رہ لینا.....!“ وہ چھیڑنے کے انداز میں مسکرایا تھا جب کہ مومنہ نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس ایک نظر میں دکھ، غم، گلا اور ہزاروں شکوے تھے۔

* * *

مخدوم پیر محمد شاہ رات گئے لال حویلی پہنچے تھے۔ مدیحہ شاہ گہری نیند سوئی ہوئی تھیں دستک پر وہ اوجھتی ہوئی انھیں اور دروازہ کھول کر ایک دفعہ پھر بستر پر لیٹ گئیں۔ مخدوم صاحب بہت احتیاط سے وارڈ روب سے اپنا لباس نکال کر واش روم میں چلے گئے۔ واپس آئے تو ہاتھوں میں گولڈ کے کف لنکس اور گولڈن رسٹ واچ تھی، جو انہوں نے بے پروائی سے سائیڈ ٹیبل پر پھینکنے کے انداز میں مٹی۔ مدیحہ شاہ نے شور کی آواز پر ناگواری سے آنکھیں کھولیں اور سستی سے لمبی جھائی لی۔

”دینا پور سے آرہے ہیں.....؟“ اس کی نیند سے بھری آواز کمرے میں گونجی۔

”ہوں.....“ انہوں نے ہلکا سا ہنکارا بھرا۔

”اور اس کم بخت کا کچھ پتا چلا.....؟“ مدیحہ شاہ کی آواز نیند کے سبب بھاری تھی۔

”پتا چلتا تو صبح اس منخوں کے قتل ہوتے۔“ مخدوم صاحب نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

مدیحہ شاہ کی نیند آنکھوں سے بھک کر کے اڑ گئی وہ کہنیوں کے بل تھوڑا سا اوپر ہو کر اپنے مجازی خدا کو دیکھنے لگیں جن کا چہرہ سپاٹ البتہ آنکھوں میں عجیب سی سرد مہری تھی۔

”طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“ مدیرہ بیگم نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔
 ”کچھ نہیں ہوا مجھے، تم سو جاؤ اب اس سے بڑھ کر مزید کیا ہوگا؟“ مخدوم صاحب کے
 لہجے میں تاسف بھی تھا اور برہمی بھی۔

”آخر اس غصے سے کب چھٹکارا ملے گا آپ کو؟ وہ جو منہ کالا کر کے گئی..... وہ کہیں
 عیاشی کر رہی ہوگی اور آپ نے اوپر جینا حرام کر رکھا ہے.....“ مدیرہ شاہ خاصی منہ پھٹ تھیں
 اس کا اندازہ مخدوم صاحب کو اچھی طرح تھا۔ اوپر سے ان کے اکلوتے بیٹے کی ماں ہونے کا
 زعم بھی خاصا تھا۔

”تم اپنی بیکواس بند کرو اور منہ بند کر کے سو جاؤ۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ مجھے کیا
 کرنا ہے۔ اب اگر زبان کھولی تو میں ہر گز لجا نہیں کروں گا۔“ مخدوم صاحب نے غصے سے
 اپنی ”لاڈلی“ شریک حیات کو دیکھا۔ شدید غصے سے ان کی بھویں تنی ہوئی اور آنکھوں سے
 جیسے آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔

”اس بے حیا“ بے غیرت“ خبیث اور ملعون نے باپ دادا کی عزت کو نیلام کر دیا۔ کہیں
 مل جائے تو اس کی کھال ادھیڑ دوں گا“ میں تو اس کوشش میں ہوں کہ اس منحوس کا لعنتی چہرہ مجھے
 کہیں دکھائی دے تو کتے چڑھوا دوں گا اس پر زمین میں زندہ دفن کر دوں گا۔“ شاہ جی کی
 سانس دھکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ان کی بیزار خفا آواز نے مدیرہ شاہ کی ساری طاقت نچوڑ لی
 تھی، جبکہ شاہ صاحب ہنسیاں بھیجے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”تم اپنے بھائی سے بات کرو۔ میں عروہ کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتا ہوں۔“ شاہ
 صاحب نے اپنی گھنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا تو مدیرہ شاہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”اچھا..... آپ تو پہلے کہتے تھے کہ وہ بی اے کر لے پھر سوچیں گے۔“

”اتنے تماشے کے بعد بھی کیا ڈگریوں کی ضرورت ہے.....؟“ شاہ صاحب نے طنز یہ
 انداز میں اپنی بیگم کو یوں دیکھا، جیسے خرابی دماغ کا یقین آ گیا ہو۔ مدیرہ شاہ سنبھل کر بیٹھ گئیں
 ان کی آنکھوں میں ایک دم چمک سی آگئی تھی۔

”کیا کلفت مان جائے گی اس رشتے کے لئے.....؟“

”کیوں..... اسے کیا تکلیف ہے؟“ وہ بولے نہیں پھنکارے تھے۔

”پھر بھی شجاعت لالہ اور عروہ کی عمر میں خاصا فرق ہے پھر یہ ان کی تیسری شادی

ہوگی۔“ مدیرہ نے ابھی بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ اپنے سارے اندیشے دور کر لینا چاہتی
 تھیں تاکہ کل کو بھائی کے سامنے شرمندگی نہ ہو اور ویسے بھی یہ خیال انہوں نے خود ہی مخدوم
 صاحب کے ذہن میں ڈالا تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر تنہی سے بولے تھے۔

”میں لالہ حویلی کی عزت ان چھٹانک بھرتیوں کے ہاتھوں میں نہیں دے سکتا۔ ایک
 بے غیرت غائب ہوئی اب کیا باقی دونوں کو بھی چھوٹ دے دوں، گولی مار دوں گا جس نے
 بھی اعتراض کیا۔“ مدیرہ شاہ کے دل میں ڈھیروں پھول کھلے تھے۔ کلفتہ شاہ کے ساتھ حسد
 اور دشمنی کا رشتہ روز بروز ان کے دل و دماغ میں مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مخدوم پیر محمد شاہ کی
 دوسری اور لاڈلی بیگم مشہور تھیں لیکن اپنی ہزار چالاکیوں اور سازشوں کے باوجود انہیں وہ مقام
 حاصل نہیں ہو سکا تھا جو لالہ حویلی میں مخدوم صاحب کی پہلی بیوی کلفتہ کو حاصل تھا۔ مخدوم
 صاحب کی والدہ اور دونوں بہنوں نے انہیں بیٹے کی ماں ہونے کے باوجود وہ حیثیت نہیں دی
 تھی جس کا خواب لے کر وہ لالہ حویلی میں داخل ہوئی تھیں۔ حالانکہ اس وقت کلفتہ دو بیٹیوں
 کی ماں بن کر مخدوم صاحب کے زیر عتاب تھی..... اور پھر تیسری بیٹی کی پیدائش نے مخدوم
 صاحب کی نظر میں ان کی رہی سہی اہمیت بھی ختم کر دی تھی۔

”میں کل ہی دینا پور کا چکر لگا کر شجاعت لالہ سے بات کرتی ہو۔ اچھا ہے یہ نٹا جتنی
 جلدی ختم ہو جائے اس کے بعد میں دیکھوں گی کلفتہ شاہ کی نظریں کیسے نیچی ہوتی ہیں۔“ وہ
 بے خیالی میں اپنے ساتھ بیڈ پر لیٹے مخدوم صاحب کو دیکھتے ہوئے دماغ میں کھجوری پکا رہی
 تھیں جب کہ مخدوم صاحب سارے دن کے تھکے ہارے نہ جانے کب نیند کی وادیوں میں کھو
 چکے تھے۔ مدیرہ شاہ نے بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ استحقاق بھرے انداز سے اپنا بازو
 مخدوم صاحب کے چوڑے سینے پر رکھ کر بڑے سکون سے آنکھیں موند لی تھیں۔

* * *

فلکشن میں معززین شہر کی خاصی تعداد موجود تھی۔ حویلی کے اندر رونقیں عروہ پر تھیں۔
 نوکروں نے حویلی کے اندر تک کی روش خوب جگمگا رکھی تھی۔ آج کی تقریب معظم علی شاہ کے
 صوبائی منسٹر بننے کی خوشی میں رکھی گئی تھی۔ حالانکہ جو ڈیپارٹمنٹ ان کے حصے میں آیا تھا وہ قطعی
 غیر معروف اور دوسرا وزراء کی اس میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی، لیکن معظم علی شاہ کو
 دوسرے وزراء کی طرح اپنے ڈیپارٹمنٹ سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں تھا وہ تو بس ”منسٹر“ بننے کے

نشے میں سرشار تھے۔ شاعر سے ڈنر کے بعد رنگارنگ اسٹیج شو کا اہتمام تھا جس میں خاصے معروف فنکار مدعو تھے۔ اس وقت حویلی کا لان معززین شہر سے بھرا ہوا تھا۔ معظم علی شاہ اور ان کے دونوں بیٹے سجاد شاہ اور بلاول شاہ اپنے اپنے مہمانوں کو کہنی دینے میں مصروف تھے۔

معظم علی شاہ کی تیسری بیوی جو ایک مشہور صنعتکار کی بیٹی تھیں کالج کے کسی پروگرام میں جہاں معظم شاہ مہمان خصوصی کے طور پر مدعو تھے اور ایک جھلک دیکھتے ہی ان کے دیوانے ہو گئے تھے۔ معظم شاہ کی وارفتگیوں اور خوبصورت باتوں کے جال میں الجھ کر بائیس سالہ ماہ رخ نے اپنے سارے خاندان سے ٹکر لے کر بیالیس سالہ معظم سے شادی کر لی تھی اور اب وہ معظم علی شاہ کی چار سالہ بیٹی کی ماں تھیں جب کہ معظم کی دوسری بیوی اس شادی کے منظر عام پر آنے کے بعد احتجاجاً حویلی چھوڑ کر اپنے والدین کے گھر میں پچھلے تین سال سے مقیم تھی چونکہ دوسری بیوی سے معظم شاہ کے کوئی بچہ نہیں تھے اس لئے شاہ صاحب کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ویسے بھی ایک عالم جانتا تھا کہ معظم شاہ کی خواتین کے معاملے میں دلچسپیاں بڑی تیزی سے تبدیل ہوتی تھیں۔ وہ حد درجہ رومانوی طبیعت کے ساتھ ساتھ ”دل پھینک“ شہرت کے حامل تھے۔

”معظم شاہ کی نئی گرل فرینڈ دیکھی.....؟“ بیش قیمت لباس اور جیولری کے ساتھ موجود خواتین کی پہلی صف میں سے کسی نے بلند آواز میں سرگوشی کی۔

”ہیں.....؟ اب کون؟“ آوازوں میں حیرت نمایاں ہو رہی تھی۔

”ہائیں..... کیا آپ کو نہیں معلوم۔“ ایک سریلی آواز نے تعجب کا اظہار کیا۔ کچھ فاصلے پر بلیک شیفون کی ساڑھی میں موجود ماہ رخ کے کان کھڑے ہوئے اس نے اپنی اڑھائی سالہ بیٹی مائم کو اس کی گورنس کے حوالے کیا اور خود کونشس ہو کر بیٹھ گئیں پچھلے کچھ عرصے سے وہ کچھ سستی اور کچھ مائم کی بیماری کی وجہ سے فنکشنز اور پارٹیز میں جانے سے گریز کرتی تھیں لیکن معظم علی شاہ کی نگرانی سے کبھی نہیں چوکتی تھیں۔

”یار آج کل معظم اس ماڈل گرل ارماتھان کی زلفوں کا اسیر ہے سنا ہے کہ خاصی مہنگی اور نخرے والی لڑکی ہے۔“ کسی نے بلند آواز میں سرگوشی کی۔

”ریلی.....!“ کافی ساری آوازوں میں تجسس اور سسپنس نمایاں تھا۔

”ارے یہ سب تو چلتا ہے، کون سی نئی بات ہے اور ہماری کلاس میں تو یہ فیئر ز بھی اسٹینڈ سیمبل بن گئے ہیں۔ خود میرے میاں کا مجھ سے شادی کے بعد آٹھواں اسکینڈل سامنے آ چکا ہے اور اس سوسائٹی میں یہ قطعاً معیوب بات نہیں سمجھی جاتی، بلکہ پچھلے دنوں معلوم ہوا کہ حبیب کمپنیز کے ڈائریکٹر حبیب صاحب اور ان کے جوان بیٹے میں ایک لڑکی کی وجہ سے خاصا جھگڑا ہوا۔ حبیب صاحب بھی اسی لڑکی کو اپنی سیکرٹری رکھنا چاہتے تھے اور ان کا بیٹا بھی.....“ ایک خاتون خاصی بلند آواز میں قصہ سن رہی تھیں۔

”اچھا..... پھر کیا ہوا؟ جیت کس کی ہوئی؟“ موضوع میں دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔

”حبیب صاحب کی۔“ وہ خاتون قہقہہ لگا کر نہیں۔

”کیسے.....؟“

”حبیب صاحب نے اسے عاق کرنے کی دھمکی دے دی تھی۔“ وہ اب اور اونچی آواز میں ہنس رہی تھیں۔ ماہ رخ نے تھوڑا سا رخ موڑ کر دیکھا وہ بریگیڈیئر ثناء اللہ کی مسز تھیں اور اپنے سرکل میں چلتا پرزہ مشہور تھیں۔ آج کل اپنی تین عام سی شکل صورت کی بیٹیوں کے رشتوں کیلئے خاصے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔

”اور سنائیں مسز ثناء اللہ آپ کی بڑی بیٹی کا کہیں رشتہ ہوا؟“ کسی نے ان کی دکھتی رنگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

”ہاں..... بہت جلد ہو جائے گا۔ ایک دو بہت اچھی فیملیز میں بات چیت چل تو رہی ہے۔“ مسز ثناء اللہ نے بہت پر اعتماد انداز میں جواب دیا تھا۔

”یہ معظم صاحب کے دونوں بیٹوں کی کہیں بات چیت طے ہے کہ نہیں۔“ دونوں ہی

باپ کی طرح خاصے اسماٹ اور ہینڈسم ہیں۔“ چودھری وجاہت علی گردیزی کی بیوی نے قدرے دھیمی آواز میں تجسس سے پوچھا۔ ماہ رخ کے ایک دفعہ پھر کان کھڑے ہوئے۔ وہ اس گروپ سے قدرے فاصلے پر ذرا اندھیرے میں اکیلے بیٹھی تھیں۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ جان بوجھ کر مہمانوں سے ملنے سے کتر رہی تھیں۔

”بڑے والے کا مخدوم پیر محمد شاہ کی بیٹی مومنہ سے نکاح ہو چکا ہے جب کہ چھوٹے بیٹے بلاول کے بارے میں سنا ہے کہ خاصا ریزرو اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔“ مسز رؤف نے سنجیدہ لہجے میں وضاحت دی۔ ان کا معظم شاہ کی حویلی میں خاصا آنا جانا تھا اور ماہ رخ سے بھی

خاصی بے تکلفی تھی۔

”یہ مومنہ معظم شاہ کی پہلی بیوی کی بھتیجی ہے ناں جسے وہ طلاق دے چکے ہیں؟“ مسز شاہ اللہ کو ذاتیات میں گھسنے کا خاصا شوق تھا۔

”ہاں..... اسی وجہ سے تو ان کے مخدوم میر محمد شاہ کے ساتھ تعلقات پچھلے کئی سالوں سے خراب ہیں۔ حالانکہ مخدوم صاحب اور معظم صاحب دونوں فرسٹ کزن ہیں پچھا زاد اب تو سجاد اور مومنہ کا رشتہ بھی مشکل سے پروان چڑھے گا۔ سننے میں آیا ہے کہ مخدوم صاحب بچپن کے اس نکاح کو ختم کروانے کے چکروں میں ہیں۔ خاصے اکٹر مزاج، ضدی اور انا پرست مشہور ہیں مخدوم صاحب.....“ مسز وجاہت نے بے لاگ تبصرہ کیا۔ ماہ رخ نے خاصی حیرت اور تاسف بھرے انداز سے ان خواتین کو دیکھا۔ ذاتی طور پر وہ خاصی مختلف اور لیے دیئے انداز والی خاتون مشہور تھیں..... ان کا حلقہ احباب بھی محدود اور گنے چنے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان کے ارد گرد کی خواتین کے نزدیک وہ خاصی ”مغرور“ اور اپنے حسن پر ناز کرنے والی عورت تھیں جب کہ ماہ رخ نے ان باتوں کی کبھی پرواہی نہیں کی تھی۔ وہ چھبیس سال کی انتہائی خوبصورت اور دلکش خدوخال کی حامل آئیڈیل فگر اور آئیڈیل قد کے ساتھ خوبصورتی اور نزاکت کا لا جواب شاہکار تھیں۔ بیٹی کی پیدائش پر ان کا حسن مزید نکھر گیا تھا لیکن اس کے باوجود معظم شاہ ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں آتے تھے۔

”ہائے ماہ رخ.....!“ مسز جہانگیر نے آخر انہیں تلاش کر ہی لیا تھا۔ بڑی گرم جوش سے کہتے ہوئے انوشہ جہانگیر نے جھک کر ان کے گال کا بوسہ لیا۔ وہ بمشکل ہی سنبھل پائیں۔

”کافی دنوں کے بعد دیکھا آپ کو دور سے تو میں پہچان ہی نہیں پائی۔ یہ تو منسٹر صاحب کی تیز نظروں نے اپنی نیگم کو تلاش کیا ہے۔“ وہ معظم شاہ کے ساتھ بہت بے تکلفی سے کھڑی اس سے مخاطب تھیں۔ ماہ رخ کے چہرے پر ایک سایہ سالہا لیا۔

”تم کیسی ہو.....؟“ انہوں نے ساڑھی کا پلوٹیک کرتے ہوئے زبردستی خوشگوار لہجے میں ثروادور کے ساتھ مختصر ٹاپ میں بلبوس انوشہ جہانگیر پر گہری نظر ڈالی۔

معظم شاہ کرشل کے اسٹائلس سے گلاس میں کوئی غیر ملکی مشروب ڈالے بہت مزے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جبکہ ان کی نظریں انوشہ کے مختصر ٹاپ پر جمی ہوئی تھیں۔

”بھئی تمہارا میاں کہاں ہے..... ابھی شادی کو صرف دو ماہ ہی ہوئے ہیں اور میاں

صاحب سے اتنی بے پروائی.....؟“ ماہ رخ نے ہلکا سا طنز کیا۔ انوشہ نے خفت بھری مسکراہٹ کے ساتھ سر کو ہلکا سا جھٹکا۔

”بھئی ان کو میں نے آج آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ جب اگر ذاتی رنگینی اور نظارے ہوں تو کس کم بخت کا دل کرتا ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ جڑا بیٹھا رہے.....“ وہ ایک آنکھ دبا کر بہت کمینگی سے ہنسی تھیں۔

”بہت حوصلہ ہے تمہارا ڈارلنگ.....!“ ماہ رخ نے زبردستی مسکراتے ہوئے نامحسوس طریقے سے معظم علی شاہ کے بازو میں اپنا بازو ڈالا تھا۔ آس پاس کے لوگوں میں معنی خیزی مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا جب کہ انوشہ کے چہرے پر ہلکا سا تاریک سایہ دوڑا تھا۔ جب کہ ماہ رخ اب اسے نظر انداز کئے بہت لگاوت سے معظم کی ٹانگی سے کھیلے ہوئے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہو ہی گئی تھیں۔

”بھئی ڈاکٹر صلاح الدین کو فون کریں مجھے لگتا ہے کہ ماہم کو ٹیپر پکڑ دوا رہا ہے۔“

”اوہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں ابھی فون کرتا ہوں بلکہ سجاد سے کہہ کر کھانا شروع کروانا ہوں پھر دونوں اکٹھے ہی نکلتے ہیں ڈاکٹر صاحب کی طرف.....“ وہ تفکر بھرے لہجے میں مکمل طور پر ماہ رخ کی طرف متوجہ تھے جو ان کی ذرا سی توجہ پا کر کھل سی اٹھی تھیں۔

”یار تم تو آج قیامت لگ رہی ہو۔“ ان کے لہجے میں خوشگوار سی حیرت و وارفتگی تھی۔ پہلے الیکشن اور پھر وزارت کے چکروں میں وہ گھر سے خاصے بے پروا تھے۔ آج کافی عرصے کے بعد انہوں نے اپنی جوان بیوی کے ہوش ربا حسن کو دیکھا تھا۔ ان کا دل ہنسنے لگا بے اختیار ہی۔

”یار یہ فنکشن کب ختم ہوگا؟“ ان کی گہمیر نشیل آواز پر ماہ رخ کا دل بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔ آج کافی عرصے کے بعد انہیں بہت پہلے والے معظم شاہ کی جھلک ان میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا خود بھی دل چاہا کہ یہ تقریب جلد از جلد ختم ہو جائے۔

* * *

”تم بہت مختلف، یونیک اور بولڈ لڑکی ہو۔“ نایاب اور بلاول ریسٹورنٹ میں بیٹھے ڈنر کر رہے تھے۔ بلاول کو آج نایاب اپنے اسٹیش فون کر کے ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔ ایک لمحے کو تو وہ خود حیران رہ گیا۔ یہ نازک سی مگر انتہائی بولڈ لڑکی اسے لمحہ لمحہ حیران کر رہی تھی۔

”میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھے یوں ڈنر پر انوائٹ کرو گی۔“ بلاول نے کانٹے سے مچھلی کے ایک ٹکڑے کو منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیوں.....؟“ نایاب نے نیکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سلا کا ایک پتا اٹھایا۔
 ”بھئی ہماری سوسائٹی میں اتنی بولڈ لڑکیوں کا تصور جو موجود نہیں اور پھر ہماری سوسائٹی میں ایسی بولڈ نہیں صرف لڑکوں کے ساتھ منسوب ہے اس لئے میں تھوڑا سا حیران ہوا تھا، لیکن پھر جب تمہارے بارے میں سوچا تو یہی خیال آیا کہ تم ہر کام کر سکتی ہو۔“

”سوری“ میں ہوائی جہاز نہیں اڑا سکتی.....“ نایاب نے طنزیہ لہجے میں کہا اور چکن منچورین سے چکن کا پیس بڑی نفاست سے منہ میں ڈالا تھا۔

”اچھا..... میرا خیال ہے کہ جہاز بھی اڑا سکتی ہو تم، بس تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔“ اس کے سنجیدہ لہجے پر نایاب نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم مذاق کر رہے ہو؟“

”یار آئی ایم چیج سیریس۔“ بلاول کے بے تکلف انداز نے اسے ایک دفعہ پھر چونکا یا تھا۔

”اٹس او کے۔“ نایاب نے سر جھٹکا۔ ویسے تمہاری اب تک کتنی گرل فرینڈز ہیں.....“ اس نے یونہی پوچھا۔

”ایک بھی نہیں۔“ اس نے نیکیں سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا.....“ نایاب کو شاک لگا۔ اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے.....؟“ وہ کھانا کھانا بھول گئی تھی۔

”یہ کیوں ممکن نہیں ہے.....؟“ وہ اب دونوں بازوؤں کی کہنیاں میز پر ٹکائے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”ایک بندہ جو کہ ”یو کے“ میں کافی عرصہ رہ کر آیا ہو شروع سے کو ایجوکیشن میں پڑا ہو، فوڈل لارڈسٹم کا حصہ ہو وہاں تو ایسی فرینڈ شپ اسٹیشن اسمبل بھی جاتی ہے.....“ وہ سخت حیرانی سے کہہ کر دوبارہ کھانے میں مگن ہو گئی۔

”سوری مس نایاب درانی میں بہت عجیب ٹائپ کا بندہ ہوں اور ایسی خرافات کا قائل نہیں۔“ شروع سے بہت محدود اور سلیکیٹڈ لوگوں کی کہنی میں رہا ہوں۔ اپنی اسٹینڈرز کے دوران

میرے بوائے فرینڈز بھی بہت کم تھے۔ مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ میں اپنی کہنی کو انجوائے کرتا ہوں اور تمہارے لئے یہ حیرانی کی بات ہو گی کہ کافی عرصے میرے ماڈل ناؤں والے گھر میں صرف ایک ملازم تھا۔ مجھے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے الجھن ہوتی ہے اور جو سچ بات ہے کہ اگر تم مجھے خود ڈنر کی آفر نہ کرتیں تو میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا.....“ وہ بہت صاف گوئی سے بتا رہا تھا جبکہ نایاب کے چہرے پر پھیلی حیرت کو اب وہ انجوائے کر رہا تھا۔

”ویری اسٹریٹج.....!“ نایاب نے کندھے اچکائے۔

”ویسے تم نے مجھے ڈنر پر کیوں انوائٹ کیا تھا؟“ وہ اب دلچسپی سے گویا ہوا۔

”اس لئے کہ میں نے اپنی فرینڈز کے ساتھ شرط لگائی تھی۔“ نایاب کے دو ٹوک انداز میں دیئے گئے جواب پر وہ ایک لمحے کو تو ششدر رہ گیا اور اگلے ہی لمحے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
 ”تم واقعی خطرناک حد تک بولڈ لڑکی ہو، بائی داوے تمہاری فرینڈز کو کیا شرطیں لگانے کو میں ہی ملا ہوں.....“ وہ ٹھیک ٹھاک انداز میں مزے لے رہا تھا۔

”نہیں اور بھی بے شمار لوگ ہیں جن پر ہم شرطیں لگا چکے ہیں، لیکن اس دن عائش کے سی ایس ایس میں ٹاپ کرنے پر جو پاپا نے ڈنر دیا تھا اس ڈنر میں آپ کے چہرے پر پھیلی اجنبیت نے میری فرینڈز کو حیران کر دیا تھا اور ان کا ذاتی خیال تھا کہ آپ کو لفٹ والا واقعہ بھول گیا ہوگا، جبکہ میرا کہنا تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ بہت مگن انداز میں فرائیڈز رائس کھاتے ہوئے بولی تھی۔

”وہ کیوں.....؟“ بلاول کی آنکھوں میں دلچسپی ابھری۔

”بھئی نایاب درانی کو بھلانا اتنا آسان نہیں ہے۔“ اس کے پڑ اعتماد انداز میں بلاول کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ واقعی بہت ”پڑ اعتماد“ اور ”خود آگاہ“ لڑکی تھی۔

”بہت خوب.....!“ وہ ایک دفعہ پھر ہنسا تھا۔ نایاب نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”ویسے تم عائش کو کیسے جانتے ہو، اس کی تمام اسٹینڈرز تو باہر ہوئی ہیں؟“ وہ بھرپور طریقے سے کھانا کھا کر اب ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بے پروا لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
 ”پہلے تم یہ فیصلہ کر لو کہ تم نے مجھے ”آپ“ کہنا ہے یا ”تم.....!“ وہ شرارتی انداز میں

گویا ہوا۔

”بھئی یہ آپ‘ آپ کی گردان مجھ سے زیادہ دیر تک نہیں ہو سکتی۔ میں تو عائش بھیا کو بھی جو مجھ سے کم از کم دس سال بڑے ہیں ”تم“ ہی کہہ کر مخاطب کرتی ہوں۔ مجھے فارل انداز گفتگو کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اب کوئی بندہ مجھ سے پہلے دنیا میں آ گیا ہے تو اس میں اس کا کیا کمال ہے یا میں دیر سے آئی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس لئے تم مجھ سے اس چیز کی توقع مت رکھنا کہ میں آپ‘ آپ کر کے تہذیب کے دائرے میں رہوں گی‘ بابا ہم آزاد منش لوگ ہیں ہماری فطرت میں یہ پابندیاں اور فارمیٹیں نہیں ہیں۔“

”تمہاری ماما اس انداز پر تمہیں کچھ نہیں کہتیں.....؟“ بلاول کو حیرت ہو رہی تھی۔

”کہتی ہیں..... لیکن اب کہہ کہہ کر تھک چکی ہیں‘ بلکہ مایوس ہو چکی ہیں۔“ وہ تہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔ ”اصل میں میرے پاپا آزادی مساوات کے علمبردار ہیں ان کی شہ پر ہم چاروں بہن بھائی بقول ماما خاصے بگڑ چکے ہیں..... تم نے بتایا نہیں کہ تم عائش کو کیسے جانتے ہو؟“ اسے اچانک یاد آیا۔

”میں اسے زیادہ نہیں جانتا۔ اکثر فنکشنز وغیرہ میں ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ عائش کا بیٹ فرینڈ اشعر البتہ میرا بہت کلو فرینڈ ہے۔ ہم انگلینڈ میں اکثر ملتے تھے بلکہ اشعر نے تو کافی عرصے میرا قلیٹ بھی شیئر کیا تھا اور عائش اسے وہاں ملتے آتا تھا ایک دفعہ ہم چار فرینڈز مل کر سڈنی میں کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے تھے۔ ارادہ تو عائش اور اشعر کے فرینڈز کا تھا‘ لیکن اشعر مجھے زبردستی لے گیا اور اب بھی اکثر وہی مجھے فنکشنز وغیرہ میں گھسیٹ کر لے جاتا ہے ورنہ مجھے تو گید رنگز سے بہت الجھن ہوتی ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

”اوہ.....!“ نایاب نے حیرت سے سر ہلایا۔

”ہاں اشعر بھائی‘ عائش کے بیٹ فرینڈ ہیں‘ بلکہ اکثر اوقات تو وہ ہمیں اپنی فیملی کا حصہ ہی لگتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی۔

”ہاں وہ اچھا لڑکا ہے ذہین اور مخلص۔“ بلاول نے بھی اس کی تعریف کی۔

”اور ماسٹرز کرنے کے بعد کیا ارادے ہیں؟“ نایاب نے بات بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔

”کچھ نہیں‘ کوئی خاص پلان نہیں..... شاید انگلینڈ شفٹ ہو جاؤں‘ کیونکہ میری طبیعت

اپنے فیوڈل سسٹم کے ساتھ میچ نہیں کرتی‘ لیکن اگر بابا نے اصرار کیا تو شاید یہیں رہ جاؤں‘ لیکن یہ حالات پر منحصر ہے۔“ اس نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اور تم نے زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے.....؟“ بلاول نے اپنے سامنے بیٹھی تازک سی لڑکی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں‘ اصل میں بہت موڈی لڑکی ہوں۔ پھر ہمارے پیرنش بھی ہمیں فورس نہیں کرتے۔ عائش نے اپنی چائس سے سی ایس ایس کیا۔ اس کے بعد رمیض بھی اپنی دلچسپی سے سی اے کر رہا ہے۔ رملہ کی خواہش انگلینڈ میں پڑھنے کی تھی وہ وہیں ہوتی ہے۔ آج کل پاکستان آئی ہوئی ہے۔ میں نے ایف ایس سی کے بعد بی ایس سی کی اور آگے اسٹڈی کا کوئی خاص موڈ نہیں تھا‘ بس پاپا کی خواہش پر ماسٹرز کر رہی ہوں۔“

”حالانکہ تمہارا کہنا ہے کہ تمہارے پیرنش تم لوگوں کو فورس نہیں کرتے۔“ بلاول نے مسکراتے ہوئے یاد دلایا۔

”ہاں تو میں نے کب کہا کہ انہوں نے مجھے فورس کیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ پاپا کی خواہش پر..... اور فورس کرنے اور خواہش میں کافی فرق ہوتا ہے۔ انہوں نے ہلکا سا ذکر کیا تھا۔ میں نے سوچا پاپا خوش ہو جائیں گے ورنہ اگر میں نہیں کرتی تو وہ مجھے کچھ نہیں کہتے.....“ نایاب نے بھی مکمل سنجیدگی سے وضاحت دی۔

”میرا خیال ہے کہ اب چلنا چاہئے.....“ نایاب نے شانے جھٹکتے ہوئے اپنی ازلی بے فکری اور اتاؤ لے پن سے کہا تو بلاول کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”شیوور.....“ وہ بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو پھر آپ اگلی شرط اپنی فرینڈز کے ساتھ کب لگا رہی ہیں؟“ بلاول نے گاڑی جسٹس نعمان درانی کے بنگلے کے آگے روکتے ہوئے شرارتی لہجے میں پوچھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھ سے دوبارہ ملنا چاہتے ہیں۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھے ہینڈ سم بندے کو دیکھا۔

”اف یو ڈونٹ مائنڈ.....!“ بلاول نے بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس اوکے.....! لیکن شرط یہ ہے کہ آپ آئندہ پہچاننے سے انکار نہیں کریں گے۔“ نایاب نے مسکراتے ہوئے اپنی گھنیری پلکوں کی چٹن اٹھائی اور بلاول کی آنکھوں میں بکھری

کا دماغ تو پھٹ ہی جائے گا۔

کتنے لمحے بیت گئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کئے بے آواز اپنی حرماں نصیبی پر آنسو بہاتی رہی۔ وہ تقدیر کے عجیب سے موڑ پر آن کھڑی ہوئی تھی۔

”لال حویلی“ کے کینوں سے اسے بے شمار شکایتیں اور گلے تھے اور وہ اکثر وہاں سے دور جانے کے خواب دیکھا کرتی تھی لیکن ان خوابوں کی تعبیر ایسی ہوگی اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ حالانکہ شگفتہ شاہ اسے بتاتی تھیں کہ پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے شاہ جی اسے اکثر پیار کر لیتے تھے جبکہ عروہ اور اریبہ کے حصے میں تو وہ تھوڑا سا پیار بھی نہیں آیا تھا۔

اسے یاد تھا کہ اس نے ضد کر کے ملتان شہر کے کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ شاہ جی پہلے پہل تو بالکل نہیں مانے تھے لیکن پھر بڑی ماں کی سفارش پر ان کا دل کچھ نرم ہوا تھا اور مومنہ کے بعد عروہ کا ایڈمیشن بھی وہاں ہو گیا تھا..... ویسے تو دونوں بہنوں کا ہاسٹل میں بھی کمر تھا لیکن شاہ جی کے غصے کو دیکھتے ہوئے وہ صرف امتحانوں کے دنوں میں وہاں ٹھہرا کرتی تھیں اور روزانہ صبح ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے ڈرائیور انہیں کالج چھوڑنے آتا تھا اور جتنی دیر وہ دونوں بہنیں گھر سے باہر رہتیں ان کے لہجے میں عجیب سے کھٹک اور چہرے پر بڑی پُرکشش سی چمک ہوتی، مگر لال حویلی میں داخل ہوتے ہی ان کے چہرے سہم جاتے۔ مدیحہ شاہ جو کہ شاہ جی کی دوسری اور لاڈلی بیگم ہونے کی وجہ سے حویلی کے معاملات پر بری طرح حاوی تھیں ان کی مرضی کے بغیر حویلی میں پتا تک نہیں ہلتا تھا۔

حیدر لالہ جو کہ شاہ جی کے اکلوتے فرزند ہونے کی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کی ضد اور خود سری کی داستانیں ملازمین تک مزے لے لے کر سناتے تھے۔ روینہ شاہ جو خاندانی تنازعات اور رنجشوں کی وجہ سے طلاق کا جھومر سجائے ایک دفعہ حویلی میں داخل ہوئیں تو پھر باہر کا راستہ ان پر بند ہو گیا۔ منیہ پھوپھو قرآن پاک کی شادی کی رسم کی جھینٹ چڑھیں اور کئی کئی مہینے دروازہ بند کئے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ رہیں۔

حویلی میں وہ تینوں بہنیں مومنہ، عروہ اور اریبہ تھیں جن کیلئے زندگی خاصی مشکل اور اذیت ناک تھی۔ مومنہ کا نکاح روینہ پھوپھو کے بیٹے سجاد کے ساتھ بچپن میں ہی ہو گیا تھا جبکہ عروہ کی بات بلاول سے طے تھی لیکن وہ شاہ جی نے بہن کی طلاق کے ساتھ ہی ختم کر دی تھی جبکہ سجاد کا سلسلہ وہ چاہتے ہوئے بھی ختم نہیں کروا سکے تھے۔

جبکہ گھٹ اور واضح شرارت کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے وہ بھی کھل کر مسکرا دی۔

”آپ کا دماغ ٹھیک ہے؟ آخر آپ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟ کس گناہ کی سزا آپ مجھے دے رہے ہیں۔ پہلے اس اجازت ویران اور بیابان جنگل میں قید کر کے رکھا ہوا تھا اب دماغ میں نہ جانے کیا سودا سایا ہے کہ اچانک آکر سارا سامان جیب میں رکھا اور اب نہ جانے کس جہنم میں لے جانے کا ارادہ ہے۔“ مومنہ جو بڑی ساری چادر میں اپنا سارا وجود چھپائے جیب کی پچھلی سیٹ پر تھی۔ سجاد شاہ کی مسلسل خاموشی سے تنگ آ کر جھنجھلا کر بولی تھی۔

اگلی سیٹ پر سجاد کا ڈرائیور اور گن مین بیٹھے ہوئے تھے۔ آج صبح پانچ بجے وہ اچانک آگیا تھا اور آتے ہی گونگی بوا اور روشن چاچا کو اشاروں کی زبان میں کوئی حکم دیا تھا جس کے بعد انہوں نے مستعدی سے سارا سامان پیک کیا تھا اور ویسے بھی وہاں تھا ہی کیا۔

اب پچھلے دو گھنٹے سے وہ لوگ مسلسل سفر میں تھے..... گاڑی انجان راستوں پر بھاگ رہی تھی اور سجاد اپنے ہونٹ سختی سے بچھنے، آنکھیں بند کئے اس سے بے پروا سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ مومنہ اپنی سیاہ چادر سے چہرہ چھپائے..... ناراض نظروں سے وقفے وقفے سے اسے دیکھ لیتی تھی۔ جیب میں بیٹھے ہی اس نے سجاد کو مخاطب کرنا چاہا مگر اس کی تنبیہی نظروں سے گھبرا کر چپ کر گئی۔ مگر جوں جوں سفر لمبا ہوتا جا رہا تھا اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”آخر ہم جا کہاں رہے ہیں.....؟“ آخر کار مومنہ نے ڈرائیور اور گن مین کی موجودگی کا لحاظ چھوڑ کے ڈھیٹ بن کے پوچھ ہی لیا۔

”لاہور.....“ سجاد شاہ نے آنکھیں بند کئے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن کیوں.....؟“ وہ سخت خوفزدہ ہوئی۔ سجاد شاہ نے آنکھیں کھول کر ایک نظر اسے دیکھا۔ مومنہ نے اس کی آنکھوں میں غصہ، جھنجھلاہٹ اور کوفت کا ٹھانٹھا مارتا ہوا سمندر دیکھا تھا..... ساری رات کی جاگی آنکھیں اس وقت سرخ ہو رہی تھیں۔

”یہ تمہارا نہیں میرا مسئلہ ہے.....!“ سجاد شاہ کا سخت، تنبیہی لہجہ اسے خاموش رہنے پر مجبور کر گیا تھا۔ دل گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگا تھا کہ سوچ سوچ کر اس

سجاد شاہ کے لئے مومنہ کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا اور خود بھی اپنے بابا کے فیصلے کے خلاف تھی۔ ایک دفعہ تو سجاد اسے کالج میں دھڑلے سے ملنے چلا آیا تھا اور وہ بوکھلا گئی تھی، لیکن خوبصورت وجاہت کا مالک اور بے باکی اور دھڑلے سے گفتگو کرنے والا سجاد بڑی خاموشی سے اس کے دل کا مکین بن گیا تھا، لیکن اس نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا جیسا سجاد کر رہا تھا۔

”شاہ جی گلبرگ جانا ہے یا ماڈل ٹاؤن؟“ ڈرائیور کی مؤدب آواز پر اس نے بے اختیار آنکھیں کھولیں۔ لاہور آچکا تھا۔ مومنہ نے ادھر ادھر تیزی سے بھاگتے دوڑتے ٹریفک کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔

”ماڈل ٹاؤن.....!“ سجاد شاہ نے مختصر جواب دیا۔ مومنہ نے خفگی بھرے انداز میں اسے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے اب پھر بہت پرسکون حالت میں تھا۔ گاڑی پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک خوبصورت کوٹھی میں داخل ہو رہی تھی۔ کوٹھی جس قدر باہر سے خوبصورت تھی، اس قدر اندر سے کشادہ اور ویل ڈیکورڈ تھی۔ بہترین فرنیچر اور انٹریئر سے مزین اس کی آرائش و زیبائش قابل دید تھی۔

”یہ رہا تمہارا بیڈ روم.....!“ سجاد نے سنجیدگی سے دروازہ کھولا، کمرے میں قدم رکھتے ہی خوشگوار مہک اس کی سانسوں کو معطر کر گئی۔ مومنہ نے بیڑاری سے دیکھا۔ اسکاٹائی بلیو کالر کے وال پیینٹ کے ساتھ پنک کمر کے پردوں کا کامینیشن بے پناہ خوبصورت تاثر دے رہا تھا۔ کمرے میں زیادہ اشیاء کی بھرمار نہیں تھی۔ نازک ونیس چیزوں سے کمرہ کھلا کھلا اور روشن لگ رہا تھا۔

”یہ ہم دونوں کا بیڈ روم ہے۔“

سجاد کے شوخ لہجے پر اس نے چونک کر بے اختیار اسے دیکھا..... دل عجیب سی لے پر دھڑک رہا تھا۔

”مجھے یہاں نہیں رہنا.....“ وہ ایک دم بھڑک اٹھی تھی۔

”کیوں.....؟“ وہ دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر سختی سے جما کر غصے سے بولا تھا۔

”تم آخر چاہتے کیا ہو؟ کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا؟“ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ سجاد کے ہاتھوں کی گرفت میں ایک

دم نرمی آگئی تھی۔ بہت اہمیت کے ساتھ اپنی ہانپیں اس کے گرد حائل کرتے ہوئے کانوں کے قریب سرگوشی کی۔

”تم میری کزن ہونے کے علاوہ منکوحہ بھی ہو اور شاہ جی ان دونوں رشتوں سے ہی انکاری تھے۔ مجھے علم ہوا تھا کہ وہ خلع کیلئے تمہاری طرف سے کیس دائر کرنے والے تھے اور تم سے دستبردار ہونا نہ تو میری غیرت گوارا کرتی ہے اور نہ محبت.....!“ اس کا لہجہ لمحے بھر میں مخمور ہوا تھا۔ وہ اس کی گرم سانسوں کی تپش سے جھلنے لگی۔ وہ ایک دم ہی اپنے آپ میں سمٹ گئی تھی۔ اس کا چہرہ یک دم سرخ ہوا تھا اور نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے بے ساختہ سجاد شاہ کے کشادہ سینے میں منہ چھپا لیا تھا۔ اس کی اس بے ساختہ حرکت نے سجاد شاہ کے اندر فخر و غرور سا بھر دیا تھا۔

* * *

لال حویلی کی یہ صبح بھی انتہائی افسردہ اور بے شمار غم اپنے اندر سیٹھ ہوئے تھی۔ گلشن شاہ کی نیند شاید کہیں گم ہو گئی تھی۔ رات کو سونے کیلئے لیٹتیں تو مومنہ کا معصوم اور بھولا بھالا سا چہرہ آنکھوں کے آگے آ جاتا۔ شاہ جی نے رات ہی عروہ کی شادی طے ہو جانے کی خبر سنا کر ان کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔

ان کی آنکھوں کے آگے بار بار مدیحہ شاہ کا بھاری بھر کم بھدے جسم والا اچھی خاصی عمر کا حامل بھائی شجاعت آ رہا تھا، جس کی عیاشیوں کے قصے پورے گاؤں میں مشہور تھے اور اوپر سے یہ اس کی تیسری شادی تھی۔ ان کی آنکھوں کے آگے اپنی خوبصورت، معصوم اور نازک سی انیس سالہ بیٹی عروہ کی تصویر بنتی تو اگلے ہی لمحے شجاعت کا خباثت سے بھر پور چہرہ سامنے آ جاتا۔ وہ نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے اپنی ساس کے کمرے میں آئیں۔

رنگین پاپوں والے پنک پر بے جی سستی سے نیم دراز تھیں جبکہ ریلی ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ بلیک رنگ کے پرانے سے سوٹ میں بھی اس پندرہ سولہ سالہ لڑکے کا گورا رنگ خوب دک رہا تھا۔ گلشن شاہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بھر پور نظر سے اس کا جائزہ لیا۔

”رہی.....! ہزار دفعہ تجھے کہا ہے کہ اوڑھنی ڈرا بوی لے کر حویلی میں آیا کر.....!“ گلشن شاہ نے ڈپٹ کر اسے کہا تو وہ خواہ مخواہ ہنسنے لگی۔ بے جی نے آنکھیں کھول کر اسے غور سے دیکھا۔

قریب کو پہلی دفعہ برت رہی تھی اور مرد کی محبت کا نشہ تو دیسے بھی عورت کے حواسوں پر چھا جاتا ہے اور وہ اس کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے لگتی ہے اور اس کے کانوں سے سننے لگتی ہے۔
 ”تم میری امانت ہو، خود کو میرے لئے سنبھال کر رکھنا رسیلی۔“ وہ حیدر کے لہجے کی پھوار میں بھینکنے لگی لیکن باہر سے مدیحہ شاہ کے بولنے کی تیز تیز آواز نے دونوں کو حقیقت کی دنیا میں لا چٹا تھا۔ حیدر نے بہت تیزی سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

* * *

وہ آداری میں ہونے والے سیمینار کی کورس کے لئے شیخ ضمیر الدین کے ہمراہ ہال میں موجود تھی اور آنے سے پہلے شیخ صاحب نے اسے زباں بندی کیلئے پورے ایک گھنٹے کا لیکچر دیا تھا اور اسی کے زیر اثر سروہی خاموشی سے نہ چاہتے ہوئے بھی دھڑ دھڑ نوٹس لکھنے میں بڑی تھی۔

”سریہ سیاستدان اتنے جھوٹ کیسے بول لیتے ہیں؟“ شیخ صاحب کی سنجیدگی اور تنبیہی نظروں کے باوجود سروہی کی زبان پھسل پڑی تھی۔
 ”یہ میں آپ کو آفس میں جا کر بتاؤں گا۔ پہلے آپ کھوسہ صاحب کی تقریر غور سے سنیں۔“ شیخ صاحب کے لہجے میں چھپی دھمکی کو سمجھتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر زبردستی اپنی ڈائری پر جھک گئی۔

”یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔“ سروہی کی بڑبڑاہٹ پر شیخ صاحب نے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کا گلا بڑی صفائی سے کاٹا تھا۔ اس وقت ان کی ڈراسی نرمی اسے اچھی خاصی شہ دے سکتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ دانستہ سنجیدہ تھے۔

سیمینار کے دوران چائے کا وقفہ سروہی کے لئے عید سے کم نہیں تھا۔ اس نے واش روم میں جا کر بڑے سلیقے سے لیا ہوا اسکارف اتارا اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنی آنکھوں پر مارے۔

”ہتا نہیں یہ فضول“ بے ہودہ اور بکواس سیمینار کب ختم ہوگا۔ میں نے کہا بھی تھا بخاری صاحب کو ان جھوٹے دعا باز لوگوں کے فراڈ بیانات سننے کیلئے کم از کم مجھے نہ بھجوا کر۔ ہماری عوام تو بے وقوف ہے ہی، لیکن مجھے اچھا خاصا اپنا آپ بھی اتنا قانعہ سا لگنے لگتا ہے۔“ بلیک عبایا میں ایک اور لڑکی نشو سے منہ صاف کرتے ہوئے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

وہ بھرے بھرے جسم والی رسیلی جو کہ عین شباب کے دور میں بس ہر وقت چھلکنے کو بے تاب دکھائی دیتی تھی۔ بھرے بھرے سرخ رخسار، موٹی موٹی آنکھیں، بھر پور جسم اور اوپر سے اس کا بے پروا اور الٹرا انداز..... بے جی نے اب دلیل کے اسے دیکھا۔

”رسیلی! اپنی ماں کو آج میرے پاس بھیجنا، ذرا تیرا علاج کرتی ہوں۔“ بے جی کا لہجہ فکر میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ رسیلی نے ان کے لہجے اور جملوں کی نزاکت کو محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ شگفتہ شاہ نے اسے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”چلو اٹھو یہاں سے..... مجھے بے جی سے کچھ بات کرنی ہے۔ ذرا باورچی خانے میں جا کر انوری کا ہاتھ بٹاؤ، آج مہمان خانے میں شاہ جی کے کچھ شہرے خاص مہمان آئے ہیں اور کنیز کو بھی دیکھو، کہاں مرگئی ہے۔ صبح سے اس کو نہیں دیکھا اور ادھر ادھر گھومنے کی ضرورت نہیں، جا کر باورچی خانے میں بیٹھو۔“ رسیلی نے بے پروائی سے پٹنگ سے چھلانگ لگائی اور بے جی اور شگفتہ شاہ کی سخت نظروں سے بے پروا فوراً کچن کی طرف قدم بڑھائے۔ حویلی کی لمبی سی گیلری میں چلتے چلتے وہ ایک غسل خانے میں کھسی، جلدی جلدی پانی کے چھپکے منہ پر مارے۔ اپنے گریبان میں چھپائی پرانی سی لپ اسٹک کا ڈھکن کھول کر انگلی سے ہلکی سی لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر دوپٹہ گلے میں ڈالا اور اب اس کے تیز تیز قدم حیدر لالہ کے کمرے کی طرف تھے۔

اس نے بہت استحقاق بھرے انداز سے دروازہ کھولا تھا۔ واش روم سے نہا کر نکلتے ہوئے حیدر نے اسے دیکھ کر تو لیا بے پروائی سے بیڈ پر پھینکا تھا۔ حیدر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھری تھی۔ اس نے دعوت دیتے جسم کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

”کہاں رہ گئی تھی میری شہزادی.....؟“ حیدر نے آگے بڑھ کر بے تکلفی سے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا؟ رسیلی کے اندر ایک برقی روسی دوڑ گئی تھی، وہ خود کو ماورائی مخلوق سمجھنے لگی تھی۔

”میری جان! تمہیں تو لگتا ہے کہ اوپر والی ذات نے خصوصی طور پر میرے لئے بنایا ہے۔ تم بھلا اس دنیا کی کہاں لگتی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ جنت سے کوئی حور راستہ بھول کر ادھر دنیا میں آ نکلی ہو۔“ حیدر شاہ کی محبت کے جوش میں اتنی طفیلی تھی کہ وہ الٹرا ڈشیزہ اس میں بہتی جا رہی تھی۔ رسیلی کو یوں لگا تھا جیسے ساری دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہو، وہ مرد کی محبت اور

وہ دونوں باہر نکلیں تو سیمینار اختتامی مراحل میں تھا۔ شیخ صاحب کسی اخباری نمائندے کے ساتھ مصروف تھے جبکہ اسٹیج پر کوئی منظر خطاب میں مصروف تھا۔

”بہت خبیث روح ہے یہ؟“ زرش نے آہستگی سے سرگوشی کی۔

”وہ تو شکل ہی سے لگ رہا ہے لیکن یہ ہے کون؟“ سروعی نے حیرانی سے پوچھا۔

”معظم شاہ.....“

”کیا..... یہ معظم شاہ؟“ جوش میں اس کی آواز قدرے اونچی ہو گئی تھی، کچھ لوگوں نے مرکز پر ساختہ انہیں دیکھا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ سروعی نے معذرت خواہ لہجے میں کہا تو زرش اس کا بازو پکڑ کر ہال سے باہر نکل آئی۔

”اب بتاؤ تم نے اتنی حیرت کا اظہار کیوں کیا؟“ وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”یار کچھ عرصہ پہلے بمبورین میں ہونے والی کانفرنس میں میں نے کچھ سخت الفاظ استعمال کر دیئے تھے جس پر موصوف نے خاصا مائنڈ کیا تھا اور سننے میں آیا تھا کہ موصوف میرا شجرہ نسب کھنگال رہے تھے اور فون نمبر وغیرہ کی تلاش تھی.....“ سروعی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”پھر.....؟“ زرش سخت بے تابی سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حد درجہ سنجیدگی تھی۔

”پھر کچھ نہیں، مجھے تو علم نہیں بس خمیر صاحب نے کچھ کہہ کھلا کر معاملہ ختم کروا دیا تھا۔“

سروعی نے بھی بات بتائی۔

”بہر حال تم اس خبیث روح سے ذرا بچ کر رہنا۔“ اس کے پرخوس لہجے پر سروعی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیوں.....؟“

”تم بہت خوبصورت ہو اور حسن کسی بھی شکل میں ہو، سید معظم شاہ کی کمزوری ہے، آن دی ریکارڈ وہ تین جبکہ آف دی ریکارڈ وہ چھ یا سات شادیاں کر چکا ہے۔“

”تم کیسے جانتی ہو؟“ سروعی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس لئے کہ اس کی پانچویں یا چھٹی بیوی میری بیوی بہن تھی جسے اس نے کسی کالج

”آپ کس اخبار سے ہیں؟“ سروعی نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”یارتی وی چینل سے ہوں۔“ وہ بے تکلفی سے بول رہی تھی۔

”اور تم؟“

”میں ہفت روزہ میگزین ”مشعل“ سے ہوں جو بقول ہمارے چیف ایڈیٹر کے میری وجہ سے بہت جلد بند ہو جائے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“ وہ سخت حیران ہوئی۔

”بھئی ہمارے چیف ایڈیٹر کا کہنا ہے کہ مجھے دو چیزوں پر کنٹرول نہیں ایک قلم اور دوسرے میری زبان اور میری ان دو چیزوں کی وجہ سے انہیں کافی نقصانات اٹھانا پڑے۔ کیونکہ میں اپنے میگزین میں ہر ہفتے ایک زبردست سافینچر مکمل معلومات اور سچائی کے ساتھ لکھتی ہوں اور آج کل کے دور میں لوگوں کو سچ ذرا مشکل سے ہی میسر ہوتا ہے۔“ سروعی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”دش گریٹ..... کیا نام ہے تمہارا.....؟“ وہ تو صغنی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”سروعی.....!“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”کیا مطلب ہے بھئی اس کا“ میری اردو بہت کمزور ہے۔“

”خجری کاٹ۔“ سروعی اپنا اسکارف سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

”زبردست.....!“ اس لڑکی کا چہرہ بے ساختہ مسکراہٹ سے چمکنے لگا تھا۔

”کون؟ میں یا میرا نام.....؟“ وہ ہلچلی۔

”دونوں.....!“ اس نے کھلے دل سے کہا۔

”پور گڈ نیم؟“ سروعی نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

”زرش فاطمہ.....!“

”بھئی کیا مطلب ہے تمہارے نام کا؟“ سروعی نے بھی ہنستے ہوئے پوچھا۔

”چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی۔“

”شاندار.....“ سروعی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”کون؟ میں یا میرا نام.....؟“ وہ شرارت سے پوچھ رہی تھی۔

”دونوں ہی.....!“ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

فنکشن میں دیکھا تھا اور پھر تین مہینے عیاشی کرنے کے بعد طلاق دے دی اور وہ عبرت کا نشان بن کر ہمارے گھر میں ہے۔“ وہ خاصے تلخ لہجے میں بولی نہیں پھنکاری تھی۔ سروہی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے سن کر دھچکا ہی تو لگا تھا۔ وہ بے خیالی میں تیز تیز قدم اٹھا کر ہال کی طرف جاتی زرش کو دیکھنے لگی۔

”محترمہ! اگر آپ اپنا منہ بند کر کے پھر دوبارہ کھول کر بتا دیں کہ اندر کس ہال میں سیمینار ہو رہا ہے تو آپ کی انتہائی مہربانی ہوگی۔“ پولیس یونیفارم میں ملیوس نو جوان نے اس کے آگے ہاتھ لہرایا تھا۔ سروہی نے خونخوار نظروں سے اسے سامنے کھڑے نو جوان کو دیکھا جس کی آنکھوں میں خاصی شرارت تھی۔

”آپ کے کندھے پر لگے پھول سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اچھی خاصی ڈے دارانہ پوسٹ پر ہوں گے اور اس پوسٹ پر رہتے ہوئے اگر آپ اپنی آنکھوں کا بھی استعمال کر لیں تو بہت سارے لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔ یہ جو اتنے بڑے بڑے بینر یہاں لہرا رہے ہیں یہ انتظامیہ نے ہوا دینے کیلئے نہیں لگائے۔ ان کا مقصد آنے والوں کو گائیڈ کرنا ہے۔“ سروہی نے اپنے اذلی پڑا اعتماد لہجے میں سامنے مسکراتے ہوئے بندے کو ٹھیک ٹھاک جھاڑا تھا۔

”محترمہ! یہ بینر تو مجھے دور ہی سے نظر آ گئے تھے۔ میں اصل میں آپ کے کھلے ہوئے منہ کو بند کروانا چاہ رہا تھا تاکہ کوئی اللہ کی مخلوق اندر گھس کر آپ کی نازک طبیعت کو بوجھل نہ کر دے، لیکن آپ تو مائنڈ ہی کر گئیں۔“

”دیکھیں مسٹر.....!“ سروہی نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

”مابدولت کو اے ایس پی عائشہ درانی کہتے ہیں۔“ اس نے بات کاٹ کر کہا۔

”آپ بے شک اے ایس پی ہوں یا آئی جی پنجاب، بھاڑ میں جائیں اور مجھے یہاں سے چلتے پھرتے نظر آئیں۔ میں یہاں منہ کھول کر کھڑی ہوں یا ایک ٹانگ پر..... آپ کو کیا مسئلہ ہے؟“ وہ حسب عادت بھڑک اٹھی تھی۔ بلیک اسکارف میں اس کا چہرہ سرخ و سپید ہو کر دھک رہا تھا، جیکسی ٹاک اور بادامی آنکھوں میں غصے کے شعلے لپک رہے تھے۔ اس نے اپنے گلابی لب بے ساختہ کچلے تھے۔

”دیکھیں بی بی! میرا تعلق پولیس سے ہے اور پولیس کا ہے فرض مدعوام کی۔“ عائشہ

نے سراسر اسے چھیڑا تھا۔

”آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑا کا انداز میں بولی تھی۔

”مسئلہ میرے ساتھ نہیں، آپ کے ساتھ ہے جو اچھے خاصے A.C والے ہال کو چھوڑ کر یہاں باہر گرمی میں کھڑی ہیں۔“ عائشہ کو اس نازک سی لڑکی میں خواخوہ و لچھی پیدا ہو رہی تھی۔

”مجھے کوئی ضرورت نہیں اندر جا کر جموٹے لوگوں کی بکواس سننے کی۔ عوام کو بے وقوف

بناتے ہیں یہ بے ہودہ لوگ۔ یہ سمجھتے ہیں کہ عوام بے وقوف اور احمق ہے جو ان کی باتوں میں

آ جائیں گے۔ جائیں آپ بھی اندر تشریف لے جائیں۔ آپ کی کمی تھی جو پوری ہو جائے

گی۔ اس قوم کا اللہ ہی حافظ ہے۔“ اس نے کہیں کا غصہ کہیں نکالا تھا۔ عائشہ درانی نے سر اٹھا

کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ریڈ کلر کے سوٹ میں بلیک اسکارف سلیقے سے لئے

تر و تازہ چہرہ بہار کی نئی ٹوبلی کرنوں کی طرح دکھ رہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ آپ نے فریش ماس کیونٹیکشن میں ماسٹرز کر کے کوئی اخبار یا چینل

جوائن کر رکھا ہے۔“ عائشہ کا پڑ سکون لہجہ سروہی کے لئے حیرت کا باعث بن گیا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا.....؟“ وہ ششدر سی اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

”مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ آپ اندر ہونے والی تقریروں اور کھوکھلے دعوؤں سے بیزار ہو

کر احتجاجاً یہاں باہر آ کھڑی ہوئی ہیں، کیونکہ بول تو آپ اندر سکتی نہیں سوچا ہو گا کہ باہر

کھڑے ہو کر دل کی بھڑاس نکال لوں۔“

”ادہ مائی گاڈ..... کس غصب کا چہرہ شناس، کھوجی اور خطرناک بندہ ہے۔“ سروہی نے

بے اختیار سوچا، لیکن اس کی بات کی تائید کرنے کی طبیعت اجازت نہیں دے رہی تھی، تبھی وہ

شک انداز میں بولی۔

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں..... میں تو اپنی فرینڈ سے بات کرنے کیلئے آئی تھی۔“ وہ

قہقہہ لگا کر بے ساختہ ہنسا تھا، جبکہ سروہی سخت خفت کا شکار ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”یقین کریں مس جموٹ بولنے کیلئے ابھی آپ کو بہت پریکٹس کی ضرورت ہے۔ اپنی

ہاؤ آپ سے ملاقات اچھی لگی۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیجیے گا اگر کبھی ضرورت پڑے تو یاد کر لیجیے گا۔

مجھے خوشی ہوگی۔“ اس نے زبردستی ایسے لہجے میں کہا تھا کہ سروہی نہ چاہتے ہوئے بھی کارڈ

پکڑنے پر مجبور ہو گئی۔

”ویسے آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں میں.....؟“ وہ بہت سادہ لہجے میں مسکراتے ہوئے

بولتا تھا۔ سیمینار ختم ہو چکا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت باہر شروع ہو چکی تھی۔

”سروی جلال الدین..... میرا تعلق ہفت روزہ مشعل سے ہے۔“ اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ کاریڈور میں گزرتے ہوئے ایک گروپ کے لیڈر نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ وہ بہت تیزی سے پیچھے مڑا۔

”اوہ..... تو آپ ہیں مس سروی جلال الدین.....!“ معنی خیز لہجے نے ان دونوں کو چوٹکا دیا تھا۔ عائش نے سخت ناگواری سے اپنے سامنے کھڑے سید معظم علی شاہ کو دیکھا تھا۔

”آپ کی تعریف.....؟“ سروی نے اسے ایک لمحے میں پہچان لیا تھا، لیکن انجان بن کر دریافت کیا۔

”مجھے سید معظم علی شاہ کہتے ہیں، میں بہت عرصے سے آپ کی تلاش میں تھا۔ اب تو کتوؤں میں ہانس ڈلوانے کی کسر رہ گئی تھی۔“ سید معظم علی شاہ نے نظر بھر کے سروی کے دلکش چہرے کو دیکھا۔ اس کے جسم پر جیسے جھوٹیاں سی ریگنے لگی تھیں۔ سروی نے انتہائی بیزاری کو فٹ اور جھنجھلاہٹ سے اپنے سامنے کھڑے بندے کو دیکھا اسے معظم شاہ کے دیکھنے کے سائل سے آگے ہی تو لگ گئی تھی۔

”سروی آپ اندر چلو، میں ذرا معظم صاحب سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔“ عائش کے خشکی سے بھرپور سنجیدہ لہجے پر معظم شاہ نے چونک کر اس کے پاس کھڑے بندے کو دیکھا تو غصت زدہ ہو کر اپنا ہاتھ مصافحے کیلئے آگے بڑھا دیا۔

”مجھے عائش درانی کہتے ہیں۔ اے ایس پی عائش درانی۔ جشن نعمان درانی میرے قادر کا نام ہے اور میں فخر کا مران درانی کا بھتیجا ہوں۔ یہ سروی میری کزن ہیں۔ آپ کس سلسلے میں ان سے ملنا چاہتے تھے؟“ عائش کے پڑا اعتماد اور کچھ جھکاتے ہوئے لہجے پر معظم علی شاہ کے چہرے کے تاثرات میں بہت واضح چیخ آیا تھا۔

سروی نے حیران نظروں سے عائش درانی کو دیکھا جس کے ساتھ آج اس کی پہلی ملاقات تھی۔ وہ اس کے بولے گئے جھوٹ کو سمجھنے سے قاصر تھی، لیکن اس کی تردید کرنے کا حوصلہ بھی دل میں پیدا نہیں ہو رہا تھا۔

معظم علی کے چہرے پر پھیلتا تاریک سایہ عائش کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ انہوں نے سروی کے دلکش سراپا پر جمی اپنی بے خود نگاہیں بھر بھی نہیں ہٹائی تھیں۔ وہ بلا کے متناسب جسم اور دلکش خدوخال کی مالک تھی اور اس وقت الجھن اور بے نیازی کے تاثرات کے ساتھ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ معظم علی کی تجربہ کار نگاہوں نے اندازہ لگایا تھا۔ یہ نازک سی گڑیا خامے آہنی ارادوں کی حامل ہے اور آسانی کے ساتھ اپنا ساتھ اور قربت کے قیمتی لمحے دینے پر آمادہ نہیں ہوگی۔

”معظم صاحب میرا خیال ہے کہ سوچ بچار کے لیے یہ جگہ قطعاً مناسب نہیں، انشاء اللہ بہت جلد کسی اچھے ماحول میں ملاقات ہوگی۔“ عائش نے طعنیہ لہجے میں اب انہیں براہ راست مخاطب کیا تھا۔ معظم نے بہت تیزی سے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا تھا اور اب وہ ہر قسم کے احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر سیمینار روم سے نکلتی لڑکیوں کا جائزہ لیتے ہوئے زبردستی مسکرائے تھے۔

”ضرور سائیں..... ملاقات ہوگی۔“ معظم نے بہت پڑجوش انداز میں عائش سے ہاتھ ملایا تھا اور ایک بھرپور نگاہ اب سروی پر ڈالی تھی جو کوفت زدہ انداز سے شیخ خمیر الدین کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ معظم کی نگاہوں سے حد درجہ خائف ہو رہی تھی۔

”شکد کریں کہ آج میں نے آپ کو بچا لیا اور آئندہ برائے مہربانی اپنے پروفیشن کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں۔ میں لڑکیوں کی اس قسم کی جائزہ کے سخت خلاف ہوں.....“

معظم کے گروپ کے جاتے ہی عائش نے سنجیدگی سے اسے مشہدہ دیا۔ اس نے تھملا کر اپنے سامنے کھڑے مہذب پڑا اعتماد اور شریف بندے کو دیکھا جس کی شرافت پر تو اسے قطعاً شک نہیں تھا، لیکن ”ڈھٹائی“ پر داد دینے کو دل کر رہا تھا۔

”دیکھیں.....!“ اس نے خفگی بھرے انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ”یہ میرا انتہائی پرسنل معاملہ ہے اور کسی کی ذاتیات میں دخل اندازی میں قطعاً مناسب نہیں سمجھتی۔ یہ اخلاقیات کے منافی ہے اور میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے کون سی جاب کرنی چاہیے اور کون سی نہیں.....“ وہ انتہائی بد اخلاقی سے بولی تھی۔ عائش نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

”اٹس او کے میم“ میرا مقصد آپ کو پر خلوص مشورہ دینا تھا، اپنا فیصلہ زبردستی لاگو کرنا نہیں۔ آپ یقیناً بہت بہتر طور پر جانتی ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے؟ لیکن آپ یہ ہرگز نہیں جانتیں کہ جس میدان میں آپ قدم رکھ چکی ہیں وہاں لڑکیوں کی ”زباں بندی“ کے لئے جو طریقہ ”رائج“ ہے۔ اس پر عمل درآمد سے نقصان صرف اور صرف لڑکی کے حصے میں آتا ہے۔ اپنی ہاؤ..... ٹیک کیر.....!“ وہ تلخی کی حد تک سچ بول کے رکا نہیں تھا۔ سروہی اُلجھی سی گئی تھی۔ کاریڈور کی حدت میں ایک دم اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر ایک دفعہ پھر شیخ ضمیر الدین کی تلاش میں ہال کی طرف چل پڑی تھی۔ اس کی چال میں کوفت، بیزاری اور جھنجھلاہٹ دوری ہی سے محسوس ہو رہی تھی۔

* * *

حیدر کے مسکراتے لب یکدم سنائے میں آگئے تھے۔ برق رفتاری سے اس نے ریلی کا نرم وجود خود سے الگ کیا تھا۔ جوانی کے نشے سے چور یہ بدن جو اسے پر لطف فضاؤں میں گھما رہا تھا۔ مدیحہ کی آواز نے سارا نشہ اور گداز پن ایک لمحے میں ختم کر دیا تھا۔

”امی ادھر آ رہی ہیں خبردار ہاتھ روم سے اس وقت تک باہر مت نکلتا جب تک میں آواز نہ دوں۔“ مدیحہ نے بہت تیزی سے دروازہ بجایا تھا۔

حیدر نے خود کو سنبھالتے ہوئے فوراً دروازہ کھولا تھا۔ سامنے ہی مدیحہ بیگم ناراض تیوروں کے ساتھ کھڑی تھیں۔

”کیا ہے اماں.....؟ کیا باہر قیامت آگئی ہے ہزار دفعہ کہا ہے کہ میرے کمرے کا دروازہ ملک الموت کی طرح مت بجایا کرو.....“ حیدر نے ہاتھ میں پکڑا میجر برش مصنوعی غصے سے اپنے بیڈ پر پھینکا تھا۔ مدیحہ بیگم کے چہرے پر پھیلے تاثرات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی تھی۔ بیٹے کی بد تیزی اور زبان درازی سے وہ خود بھی خائف رہتی تھیں۔ اب بھی قدرے

نرم لہجے میں وہ گویا ہوئیں۔

”مجھے لگتا ہے کہ شاہ جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بیٹی کے گھر سے بھاگنے کا ان کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ تبھی اٹلے سیدھے کام کر رہے ہیں۔“ حیدر نے مدیحہ بیگم کے خرابی موڈ کی اصل وجہ کا اندازہ لگاتے ہی اطمینان بھری سانس لی۔ وہ شاہ کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اسی کے پاس آیا کرتی تھیں۔ حویلی میں وہ اپنے سکے بیٹے کے علاوہ کسی پر بھی اعتماد کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔

”کیا ہوا اماں؟“ حیدر نے چور نظروں سے ہاتھ روم کا بند دروازہ دیکھتے ہوئے بے پردائی سے ماں سے پوچھا جو بیڈ روم میں پڑے صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گئی تھیں۔

”ہونا کیا ہے..... اب اس حویلی میں لگتا ہے کہ نیا تماشہ ہوگا۔ آج تک یہ شاہ جی کے رنگ ڈھنگ میں نے نہ تو دیکھے اور نہ سنے تھے.....“ وہ ہنوز خفگی سے بولی تھیں۔

”اوہ اماں..... آخر ہوا کیا ہے؟ جوان پتر کی ماں ہے بن ٹھن کے رہا کر.....“ حویلی میں حیدر نے لہجہ حتی المقدور خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

”دفع کر میری ایسی قسمت کہاں..... جب کبھی لگتا ہے کہ شاہ جی میری مٹھی میں ہیں اس سے اگلے دن وہ ریت کی طرح مٹھی سے پھسل جاتے ہیں۔“ مدیحہ بیگم خاصی دل گرفتہ تھیں۔

”آخر ہوا کیا ہے؟ کون سا آسمان ٹوٹ پڑا جو تو ہر بات میں فلسفے کا تڑک لگا رہی ہے۔“ حیدر نے بیزاری سے جم کر بیٹھی اپنی اماں کو دیکھا اور جھنجھلا کر بولا۔

”آسمان ہی ٹوٹا ہے شاہ جی تیری بڑی اماں کو بیٹیوں سمیت شہر شاپنگ کے لیے لے کر گئے ہیں۔ صبح سے کھفتہ کی ہنسی ہی دانتوں سے جدا نہیں ہو رہی تھی اور تو اور وہ تیری دادی جو پوری پچھا کٹھی ہے وہ صبح صبح ناشتے پر فرمائشیں کر رہی تھی کہ میرے لیے دو چار سوکس لان کے سوٹ لے آنا۔“ مدیحہ بیگم نے غصے سے اپنی ناک چڑھائی تھی۔

”کیا.....؟ شاہ جی کہیں سٹھیا تو نہیں گئے۔ دماغ ٹھیک ہے ان کا؟“ حسب عادت بھڑک کر اس نے اپنی ماں کا چہرہ حیرت سے دیکھا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں جموٹ بول رہی ہوں.....؟“ وہ یکدم حلق کے بل پچھاڑی تھیں۔ ان کا رد عمل اتنا غیر متوقع تھا کہ حیدر ایک لمحے کو چپ رہ گیا۔ کمرے میں چند لمحے بڑی خاموشی مگر معنی خیزی سے گزر گئے۔

”کیا کہا ہے دینا پور والوں نے.....؟ کب لے کر آ رہے ہیں بارات؟“ چند لمحے بعد حیدر کو خیال آیا۔

”اگلے ہفتے“ اسی کے سلسلے میں تو بازاروں کے چکر لگ رہے ہیں۔“ مدیحہ بیگم کی اطلاع پر حیدر نے یوں ماں کی طرف دیکھا جیسے ان کے خرابی دماغ کا یقین آ گیا ہو۔

”تو پھر تمہیں بھانجڑ کس خوشی میں لگ رہے ہیں۔ دفع کرو! خواخواہ طوفان اٹھا رکھا ہے۔ میں سمجھا پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اب اتنا حق تو عروہ کا بنتا ہے۔ آخر کو مامے کی تیسری بیوی بننے کے لیے کچھ حوصلہ تو چاہیے.....“ وہ بے باکی سے ہنسا تھا۔ مدیحہ بیگم نے انتہائی ناگواری سے اسے دیکھا اور غصے سے کھڑی ہو گئیں۔

”ہاں ہاں تمہیں بھی باپ کی طرح میرا ہی دماغ خراب لگے گا۔ اب چیپٹی کو تو فوراً جیب میں بیٹھا لیا“ اتنا نہ ہوا کہ جموٹے منہ ہی مجھے بھی آنے کو کہا ہو..... آخر کو میرے بھائی کی بھی تو شادی ہے۔ یہ شاہ جی بھی بعض دفعہ مجھے دودھ سے کھسی کی طرح نکال دیتے ہیں۔ سوچا تھا کہ کچھ دیر بیٹے کے پاس بیٹھ کر دل ہلکا کروں گی مگر.....“ وہ انتہائی غصے سے کمرے سے نکل گئیں۔

حیدر نے لپک کر دروازہ بند کیا اور اچھی طرح لاک لگا کر ہاتھ روم کا دروازہ کھولا۔ رسیلا پسینے سے شرابور بجلی کی طرح باہر نکلی تھی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے لمبے لمبے سانس لیے اور دوپٹہ جھٹکے سے اتار کر پھینکا اور عین اے سی کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے تپتے، سلکتے جسم کو ایک دم ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔

”توبہ توبہ آج تو مالکین نے مروا ہی دیا تھا۔ اندر بھی میرا دل سوکھے پتے کی طرح کا پتا رہا۔“ حیدر نے ایک بھر پور نظر اس کے سراپا پر ڈالی۔ اس کے دلکش سراپا پر حیدر کی بے خود نگاہوں کا پہرہ تھا۔ اس نے بہت استحقاق بھرے انداز سے رسیلا کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا۔ رسیلا ہلکی ہوئی ڈال کی طرح اس کے اوپر آ گری تھی۔ حیدر نے تڑپ کر اسے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ پیار کا ساون ٹوٹ کر برسا تھا۔

حیدر کا نشہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور کیف و سرور کی لہریں جسم و جان کو اپنے غلبے میں لے رہی تھیں جبکہ رسیلا کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہو رہی تھیں۔ وہ اس لمحے خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔

* * *

مومنہ نے بیڈ روم کی کھڑکی کھولی تو ٹھنڈے رخ ہوا کے جھونکے نے اس کا استقبال لیا۔ اسے اس کوٹھی میں آنے ایک ہفتہ ہونے کو تھا۔ سجاد تو اسے چھوڑ کر ایک گھنٹے بعد ہی جو روانہ ہوا اب اسے گئے آج ساتواں دن تھا۔ اس وسیع و عریض کوٹھی میں وہ گونگی بوا اور بوڑھے ملازم کے علاوہ ایک چوکیدار تھا۔ کوٹھی ہر قسم کی آسائشات اور سہولیات سے آراستہ تھی۔ ڈیڑھ ڈیکڑی سی ڈی اخبارات، میگزین، رسائل غرض کہ تفریح کا سامان خاصا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنے بڑے گھر میں فون کی سہولت یا تو میسر نہیں تھی یا پھر اس کی آمد کے بعد اسے ختم کر دیا گیا تھا۔ مومنہ سارا سارا دن پوری کوٹھی میں گھومتی رہتی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جھانکنے کا شغل پہلے تو اس کے لیے دلچسپی کا باعث تھا، لیکن اب وہ اس سے خاصی اکتا گئی تھی۔ لان سے آگے گیٹ تک جانے کی اسے اجازت نہیں تھی۔ پٹھان چوکیدار سے زیادہ بلیک کلر کا خونخوار کتا اسے زیادہ خوفزدہ کرتا تھا۔

اس دن شام سے اسے بے چینی لاحق تھی۔ لان میں لگے درختوں میں سائیں سائیں کرتی شام تاریکی میں ڈھل چکی تھی۔ کہیں بجلی کڑکی تھی اور بادلوں کی زوردار گرج نے ماحول کو سہا کر رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس نے تشویش بھرے انداز سے گر جتے برستے آسمان کو دیکھا اور اسی وقت کوٹھی کے بلیک گیٹ کے کھلنے کی آواز اور سجاد کی جیب کی آواز نے اسے کچھ سکون بخشا تھا۔

”اس بندے کو بھی سکون نہیں ہے۔“ اس نے اپنے خوبصورت بالوں کو گول مول انداز میں جوڑے میں قید کرتے ہوئے بے اختیار سوچا اور دوپٹہ پھیلا کر لے لیا۔

پانچ منٹ کے بعد کچھ بندوں کے چلتے پھرنے کی آوازیں ٹی وی لاؤنج میں گونجی تھیں سجاد اونچی آواز میں ان کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص ڈرائیور اور گن بن کے بغیر کہیں نہیں نکلتا تھا۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا۔ سجاد بہت تیزی سے اندر داخل ہوا تھا۔ مومنہ کو اسے دیکھتے ہی جھٹکا لگا۔ اس کا دل کسی نے اپنی ٹٹھی میں جکڑ لیا۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟“ مومنہ حیران پریشان اور ہراساں نظروں سے اپنے سامنے نظر آ کر اندر آتے ہوئے سجاد کو دیکھ رہی تھی۔

”ہوتا کیا ہے؟ بس ٹانگ پر گولی لگی ہے اور ٹریٹمنٹ کروا کر ادھر ہی آ رہا ہوں۔ ڈاکٹر

”ہاں تمہارا حیدر لالہ.....“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔
”کک..... کیا ہوا تھا؟“

”ہونا کیا تھا“ وہ اور جو اس کے ساتھ ایک پالتو کتا ہوتا ہے دلاور۔ کچھ دن سے خاصے اچھل رہے تھے وہ حیدر تو بیچ گیا، البتہ اس دلاور کے ایک گولی بازو پر لگی ہے۔ اب دونوں میرے راستے میں آنے سے پہلے کم از کم ایک دفعہ تو ضرور سوچیں گے۔“ سجاد کے انتہائی تنفر بھرے انداز پر مومنہ کا نازک سادل سہم گیا۔

”سجاد پلینز مجھے لال حویلی چھوڑ آئیں۔ میں شاہ جی کے پیروں میں گر کر معافی مانگ لوں گی، پلینز.....“ وہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔

”کیوں..... مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے جو میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں۔ بھول جاؤ“ اپنی اس لال حویلی کو جہاں تمہارے باپ نے ساری نفسیاتی مریض عورتیں اکٹھی کر رکھی ہیں۔“ وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔

”آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان نفسیاتی مریض عورتوں میں ایک عورت آپ کی ماں بھی ہے۔“ مومنہ بھی اچانک غصے میں آ گئی تھی۔

”وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ رہ کر آدمی پاگل تو ہو چکی ہیں۔“ سجاد کے گستاخ لہجے پر مومنہ نے تاسف بھرے انداز سے اسے دیکھا۔

”مجھے انتہائی افسوس اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میرے باپ نے مجھے اس شخص کے نکاح میں باندھا ہے جسے اپنی ماں کے بارے میں بھی بات کرنے کی تہیز نہیں.....“

”بکو اس بند کرو..... ورنہ میں تمہارا وہ حشر نشر کروں گا کہ ساری زندگی یاد رکھو گی۔ میں تمہارے اس پاگل باپ سے تو اچھا ہوں جس کے پاگل پن اور جھوٹی انا نے کسی کا بھی گھر بسنے نہیں دیا اور تم بھی کسی بھول میں مت رہنا۔ وہ باپ جسے اپنی اولاد کی فکر میں زہر و آسمان ایک کر دینا چاہیے وہ آج بے فکر ہو کر لال حویلی میں تمہارے ختم کی دیکیں پکوا رہا ہے۔ لال حویلی کے کاغذوں میں تمہارا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا ہے اور اس وقت سب لوگ تمہارے قل کے چاول کھا کے لال حویلی میں بڑے سکون سے سو رہے ہوں گے۔“ سجاد نے زہریلے لہجے پر وہ سن ہو کر رہ گئی۔

”نہیں یقین آ رہا ناں تو لال حویلی کا نمبر ملاؤ اپنے کسی خیر خواہ سے پوچھ لو.....“

نے پندرہ دن کا بیڈ ریست بتایا ہے۔“ اس کا لہجہ بے پروا لیکن چہرے کے نقوش میں تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ بمشکل بیڈ تک پہنچا تھا۔

”لیکن آخر کیسے.....؟“ وہ بدحواس ہو کر اس کے پاس پہنچی اور بے ساختہ اسے لیٹنے میں مدد کرنے لگی۔ اس کے اس غیر ارادی فعل پر سجاد کے چہرے پر بہت محفوظ ہونے والی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”بھئی دن رات تو تم مجھے کونسی ہوگی، بدو عادی ہوگی، بس اللہ نے کوئی بدو عا سن لی ہو گی۔“ چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے شوخی سے کہا۔

”میں ایسی فضول حرکتیں نہیں کرتی۔ پتا نہیں کہ کون سے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ لوگ تو اپنی دشمنیاں بھی بڑے اعزاز کے ساتھ نبھاتے ہیں۔“ اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے اپنا چہرہ پونچھا۔ نہ جانے کیوں آنسو اُٹا رہے تھے۔ سجاد کے لیے خود پر ضبط کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

”اودہ میری نازک چڑیا جیسے دل والی منکوحہ دشمنیاں نہ ہوں تو جینے کا کیا مزہ.....“ اس نے چٹکارہ اور کہنیوں کے بل تھوڑا سا اونچا ہو کر ریڈ کاشن کے سوٹ میں دلکش خدوخال کی حامل مومنہ کو دیکھا، جو اس کی حالت سے ایک دم گھبرا گئی تھی۔ مومنہ نے شکوہ کنال نظروں سے اس دشمن جاں کو دیکھا۔ وہ اس کی حالت سے اچھا خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”میں کیا آپ کو لپیٹنے سار ہی ہوں؟“ وہ ایک دفعہ چڑ کر بولی تھی۔

”جان من! آدمی تکلیف تو تمہیں دیکھ کر اور باقی تمہاری پریشانی دیکھ کر ختم ہو گئی ہے۔“

”ہاں..... ساری زندگی بس مجھے ہی تکلیف دیجئے گا۔“

”ارے تکلیف کے لیے حضور ہم جو ہیں۔“ اس نے بے تکلفی سے اس کا بازو کھینچا تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے چھڑایا تھا۔ وہ دور کھڑی اب فنگلی بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”شکر کرو کہ تمہارے صدقے میں نے آج تمہارے چڑی مار بھائی کو چھوڑ دیا۔ ورنہ وہ پلے کا بچہ میرے ہاتھوں بارا جانا تھا۔“ سجاد کے فخریہ لہجے پر مومنہ کا دل تیزی سے دھڑکا اس نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کون حیدر لالہ.....؟“

سجاول نے اپنا سیل فون اس کی طرف اچھالا تھا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے سیل فون کو دیکھا۔ اس کے ذہن و دل میں دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ بے یقین نظروں سے سجاول کی طرف دیکھ رہی تھی جس نے کچھ لمحے پہلے زہریلا مواد اس کی ساعتوں میں انڈیلا تھا۔

آج درانی ہاؤس کے کچن کی رونقیں عروج پر تھیں۔ ملازمین مسز نعمان کی موجودگی میں خاصے متحرک رہا کرتے تھے حالانکہ وہ اپنی جاب کلینک اور کلب کی معروفیات کی بناء پر گھر میں کم ہی ٹکا کرتی تھیں۔

”پاپا یہ اتنا اہتمام کس خوشی میں؟ اور آج ماما بھی گھر پر ہیں۔ کہیں عید کا دن تو نہیں.....؟“ نایاب اپنے نائٹ ڈریس میں ہی منہ ہاتھ دھوئے بغیر آگئی تھی۔ اس وقت پاپا کے ساتھ ماما کو بھی گھر میں دیکھ کر فطری سی مسرت کا احساس اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔

”ارے پاپا کی جان! اتنے گندے اور رف حلیے میں..... بہت بری بات.....“ نعمان نے شفقت بھرے لہجے میں نایاب کو ڈانٹا تھا۔ جب کہ وہ گھریلو حلیے میں بھی انتہائی نک سک سے اپنے باپ کی گردن میں بازو ڈالے ان سے لاڈ کرنے میں مگن تھی۔ مسز نعمان نے مسکراتے ہوئے یہ منظر دیکھا۔

”نیا ڈارلنگ! اٹھو بیٹا! پاپا سے لاڈ بعد میں کرنا“ پہلے فریش ہو کر آؤ۔ میں ناشتہ ٹیبل پر لگوا رہی ہوں۔ ابھی رملہ اور عائش بھی آ جائیں گے اور رمیز کو بھی دیکھو کہاں ہے؟“ مسز نعمان گرے ساڑھی میں انتہائی پُر وقار انداز سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ نیا نے انتہائی محبت سے پاپا کے ماتھے پر پیار کیا۔ وہ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے اپنے باپ کی خاصی لاڈلی بیٹی تھی۔

”اوہوں ماما! فریش تو بعد میں بھی ہو جاؤ گی! پاپا کون سا روز روز ہاتھ لگتے ہیں۔“ وہ اب صوفے پر ان کے برابر میں ان کے کندھے پر سر رکھ کر بڑے لاڈ سے بولی تھی۔

”نایاب.....!“ ماما نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”میں کہیں نہیں جا رہی.....“ وہ بھی ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔

”بھئی ڈاکٹر صاحبہ رہنے دیں! آپ کا کیا جاتا ہے۔ کیوں باپ بیٹی کی محبت سے جھلس

ہو رہی ہیں۔“ جسٹس نعمان نے انگلیں اخبار پڑھتے ہوئے بیٹی کو شہ دی۔ وہ مسلسل مسکرا رہے تھے۔ نایاب اب اور زیادہ جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

”پاپا آپ ماما کو بتائیں کہ اب وہ وقت نہیں رہا۔ یاد ہے بچپن میں انجکشن کا ڈورا دے کر ہمیں ماما کتنا ڈراتی تھیں اور میں تو اپنے روم میں کئی کئی گھنٹے چھپ کر بیٹھ جاتی تھی۔“

”یس بیٹا! یہی بات تو میں اکثر آپ کی ماما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ نعمان صاحب نے ہلکے پھلکے لہجے میں تھوڑا سا جھک کر بیٹی کے کان میں سرگوشی کی۔ مسز نعمان نے بہت محبت سے یہ منظر دیکھا تھا۔

جسٹس نعمان اور ان کی مسز میں کمال کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ان کے سوشل سرکل میں دونوں کی محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اس ہنستے مسکراتے، خوب صورت کھل کو دیکھ کر اکثر لوگ حسد اور رشک کے طے جلے جذبات کا شکار ہو جاتے تھے۔ وہ دونوں جس محفل میں جاتے، لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ وہ پچھلے کئی سال سے ”بیٹ کھل آف دی ایئر“ کا اعزاز بڑے فخر سے وصول کرتے آ رہے تھے۔

مسز نعمان نے ناشتہ ٹیبل پر لگوا دیا تھا اور عائش اور رملہ ڈائننگ ٹیبل پر کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے جب کہ رمیز آج جلدی اٹھنے کی وجہ سے کچھ جھنجھلایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

”نایاب تمہارا آج کیا پروگرام ہے؟“ ماما نے بہت محبت سے جیم سلاکس پر لگاتے ہوئے اس سے پوچھا، جو ابھی بھی باپ کے کندھے کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

”پہلی دو کلاسز تو گزر گئیں جبکہ تیسری میرے یونیورسٹی جاتے جاتے شروع ہو جائے گی اور چوتھی لینے کا موڈ نہیں.....“ اس نے جمائی لیتے ہوئے بے پروائی سے کہا تو رملہ نے انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ نایاب کے مقابلے میں بالکل فریش، تروتازہ اور ایکٹیو تھی، بلیو شارٹ سیلیولس شرٹ اور ٹراؤزر میں ایک دم فٹ لگ رہی تھی۔

”میرے خیال میں تمہیں تو اپنی پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ ہو جانا چاہیے۔ اب تم بچی نہیں رہی ہو۔ تمہاری غیر مستقل مزاجی تمہاری سب سے بڑی خامی ہے، تمہیں اس پر قابو پا لینا چاہیے۔“ رملہ کے سنجیدہ لہجے پر جسٹس نعمان نے تو صلی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔

وہ دونوں بہنیں ہی ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ رملہ حد درجہ سنجیدہ، حساس، ذمے دار اور اپنے کیریئر کے معاملے میں حد درجہ کانشس..... جبکہ نایاب حد درجہ غیر سنجیدہ، بے پروا اور

موڈی ہونے کے ساتھ ساتھ ہر معاملے میں غیر مستقل مزاج۔ رملہ کو ذہانت باپ اور اماں کی طرف سے ورثے میں ملی تھی اور وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ نایاب ذہین تو تھی لیکن اس کی ذہانت شرارتوں اور غیر سنجیدہ کاموں میں استعمال ہوتی تھی۔

”نایاب میں تم سے کہہ رہی ہوں.....“ رملہ نے حد درجہ ناراضی سے اسے دیکھا جو ناشتہ کرتے ہوئے پاپا کے سیل فون سے اپنی پسندیدہ ٹونز پر تبصرہ کرنے میں مگن تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے ہی کہہ رہی ہو..... لیکن پلیز یار تم میرا موازنہ کم از کم اپنے ساتھ مت کیا کرو۔“ وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہہ کر ایک دفعہ پھر سیل فون کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ رملہ نے شکوہ کنناں نظروں سے پہلے ماں اور پھر باپ کو دیکھا جو بے بسی سے کندھے اچکا کر رہ گئے تھے۔

”تم کیوں بھینس کے آگے ٹین بجارہی ہو.....“ عائش بھیمانے اسے چھیڑا جبکہ وہ ہنوز سیل فون کے ساتھ مصروف تھی۔

”نایاب تمہیں عائش بھیمانے کہہ رہے ہیں.....“ رمیض نے اسے بھڑکانا چاہا۔
 ”نیورمانڈ.....! آئی نو ہو آئی ایم؟“ (میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں) اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا..... وہ خاصی خود پسند تھی۔

”اما آج مناہل کا برتھ ڈے ہے پنی سی میں اور رات ڈنر پر آپ بھی انوائٹڈ ہیں۔“ نایاب کو اچانک یاد آیا تھا۔ مسز نعمان نے اسے غور سے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کے آرام سے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ نایاب نے چونک کر دیکھا، سبھی اس کی طرف متوجہ تھے۔ وہ خفت زدہ انداز میں کندھے اچکا کر سامنے بڑے اٹلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نعمان صاحب نے اپنی مسکراہٹ کا گلا بڑی خوب صورتی سے گھونٹا تھا۔

”بیٹا آج کے سارے لٹچ اور ڈنر کینسل کر دو آپ کو احساس ہونا چاہیے کہ آج آپ کی بہن اور بھائی کی فلائٹ ہے اور آج شام میں آپ کے پاپا ہمیں ایک فیملی ڈنر دیں گے اور اس کے بعد میں آپ کے پاپا اور عائش..... چاروں رملہ اور رمیض کو سی آف کرنے ایئرپورٹ جائیں گے.....“ مسز نعمان کے سنجیدہ لہجے پر نایاب ایک دم چوکی۔

”اوہ..... اب میں سمجھی آپ اور پاپا گھر پر کیوں ہیں ہر سال کی طرح ان دونوں کے جانے پر ایمرضی لگی ہوئی ہے۔ ویسے اما آپ جتنی دیکھنے میں ماڈرن لگتی ہیں اندر سے وہی

بمچکل، اپنے بچوں اور گھر سے محبت کرنے والی خاتون ہیں آئی لو یو ٹوچ.....“ نایاب نے فوراً جھک کر اپنے بائیں جانب بیٹھی ماما کے چہرے پر بے اختیار پیار کیا تھا۔ ماما کا چہرہ ایک لمحے میں سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی، اپنے ہر جذبے کا بے اختیار اظہار کرنے والی۔

”توبہ توبہ اتنا مکا“ بھئی رملہ آج کل کھن کیا مفت مل رہا ہے۔“ عائش بھیمانے ایک دفعہ پھر چھیڑا جبکہ وہ بے پروائی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”آج آپ جتنا مرضی مجھے بھڑکالیں، لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ آج رملہ کے ساتھ نہیں لڑتا، آخر کو میری بہن آج واپس جا رہی ہے..... اس کے بعد اس گھر میں میرے اٹھنے بیٹھنے، سونے، جاگنے پر اعتراض کرنے والا کوئی نہیں ہوگا..... تھینکس گاڈ! اللہ نے میری سن ہی لی۔ پلیز رملہ اب جلدی مت آنا۔“ وہ شرارتی لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ رملہ نے کھا جانے والی نظروں سے اپنی غیر سنجیدہ بہن کو دیکھا۔

”پاپا! اس پر کچھ سختی کریں، بلکہ اگلے سال اسے بھی انگلینڈ بھجوا دیں، میں دیکھتی ہوں کہ کیسے نہیں سدھرتی۔“ رملہ نے سنجیدہ انداز میں اسے دمکی دی جبکہ وہ ایک دفعہ پھر پاپا کا سیل فون اٹھا کر ٹونز سننے میں مگن ہو چکی تھی۔

* * *

”بے جی آخر آپ شاہ جی سے بات کیوں نہیں کرتیں؟“ گلختہ شاہ صبح سے تیسری دفعہ ایک ہی آس لیے ان کے کمرے میں آ رہی تھیں۔ ایک دہلی دہلی سی سانس بے جی کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔

”بھئی آخر کیا بات کروں، گلختہ تم اچھی طرح ان کے مزاج سے واقف ہو۔“ بے جی کے لہجے میں چھپی مایوسی گلختہ کو اور زیادہ بیزار کر گئی تھی۔ ان کے ماتھے پر ناگواری کی ہلکی سی ٹھنک ابھری تھی۔

”آخر آپ شاہ جی سے پوچھیں تو سبھی عروہ اور شجاعت کا بھلا کہاں سے جوڑ بنتا ہے؟ کہاں میری انیس سال کی نرم و نازک سی بیٹی اور کہاں وہ بیالیس سال کا خزانہ سا شجاعت.....؟“ وہ تاسف بھرے انداز میں بولی تھیں۔

”بیٹا بات تو کی تھی میں نے.....“ بے جی کے چہرے پر رخ پھیلنے لگا۔

”پھر.....؟“ گلختہ شاہ کی متا بے چین ہو گئی۔

”بس بیٹا تمہیں پتا تو ہے کہ شاہ کہاں کسی کی بات سنتا ہے۔ اللہ بخشے تمہارے سر بھی اسی کی طرح بات بات پر بھڑک اٹھتے تھے، تبھی تو خاندانی دشمنیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ وراثت میں چھوڑ گئے ہیں۔“

”پھر بھی بے جی یہ میری بیٹی کی زندگی کا معاملہ ہے۔ میری زندگی سے چین آرام تو اسی دن نکل گیا تھا جب سے میری مومنہ غائب ہے۔ خدا غارت کرے، میرے کلیجے میں ہاتھ ڈالنے والوں کو اور اب کیا عروہ کو بھی جیتے جی سولی پر چڑھا دوں.....؟“ گلغتہ تڑپ کر ان کے پاس آن بیٹھی تھیں۔

”اے بیٹا.....! تمہاری بیٹیاں میری بھی کچھ لگتی ہیں۔ پہلے اپنی بیٹیوں کے غم ساری زندگی دیکھے اور اب پوتیوں کو اسی لائن میں کھڑا دیکھ رہی ہوں۔ پتا نہیں اللہ نے لال حویلی کی ساری بیٹیوں کی قسمتیں ایک ہی قلم سے لکھ دی ہیں۔“ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

”پھر بھی بے جی آپ میری خاطر ایک دفعہ پھر شاہ جی سے بات کر کے دیکھیں۔ خدا کی قسم میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔

”اچھا، اب زیادہ پریشان نہ ہو، آج آتا ہے تو بات کرتی ہوں۔“ اندر باہر عجیب سی بے رونق پھیلی ہوئی تھی۔

گلغتہ کے رونے پر انہیں اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسی وقت سلطانی بوا ہانپتی ہوئی وہاں آئی۔

”بڑی بی بی ذرا اپنی صفیہ بی بی کے حجرے میں جا کر دیکھیں، ان کی آنکھیں ابل گئیں ہیں اور ہاتھ ہڈی مڑ گئے ہیں، پھر.....“ وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بول رہی تھیں۔

”اوہ..... خدا خیر کرے!“ بے جی دہل کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئی تھیں۔ گلغتہ بھی اپنا رونا بھول کر فوراً لپک کر باہر نکلیں۔ ان کے قدم اپنی نند صفیہ کے کمرے کی طرف تھے۔ تنگ اور تاریک کمرے میں عروہ اور اربہ اپنی نیم بے ہوش پچھو کو سنبھالنے کے چکر میں تھیں۔ روبینہ پچھو..... کے چہرے کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔

”کیا ہوا صفیہ کو؟ ذرا ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈالو.....“ گلغتہ نے پاس کھڑی ملازمہ کو فوراً ٹھنڈے پانی کے لیے کچن میں دوڑایا۔

”عروہ ان کی چادر سر سے اتار دو، گرمی تو بے تحاشا ہے۔ ہزار دفعہ شاہ جی سے کہا ہے

کہ اس کے کمرے میں بھی اے سی لگوا دیں، مگر انہیں دوسری بیوی کے خمرے اٹھانے سے فرصت ملے، تب ناں.....“ گلغتہ سخت جھنجھلا رہی تھیں۔

”چھوڑیں بھابی ٹھیک ہو جائے گی۔ لال حویلی کی لڑکیوں کی قسمت میں باعزت موت نہیں ہے اور یہ اتنی آسانی سے نہیں مرتی۔“ روبینہ سخت اور تلخ لہجے میں بولی تھیں۔ عروہ نے بے بسی سے اپنی دونوں پھوپھوں کو دیکھا۔

”آخر ہوا کیا اس بد نصیب کو؟ صبح میں نے کمرے میں جھانکا تو قرآن پاک پڑھ رہی تھی اور اب آنا فانا کیسے.....“ بے جی سخت تشویش زدہ لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ گلغتہ نے آگے بڑھ کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنی نند کے منہ پر مارے تھے۔ وہ تھوڑا سا کسمائی۔

”بے جی آپ دلاور کو آج بلا لیں اور فوراً اس کمرے میں اے سی لگوائیں۔ قبر میں تو جب پڑنا ہے، تب پڑنا ہے..... جیتے جی تو اس بد نصیب کو قبر میں نہ ڈالیں.....“ گلغتہ کو آج نہ جانے کیوں غصہ آ رہا تھا۔

”میں نے تو پچھو سے کہا تھا کہ ہمارے کمرے میں آ جائیں، مگر وہ کہتی ہیں کہ مجھے اس کمرے کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی.....“ عروہ نے رنجیدہ لہجے میں کہا تو بے جی نے چونک کر اپنی اس پوتی کو دیکھا، جس کے نقوش میں اپنی سب سے چھوٹی پچھو کی شاہت بہت زیادہ جھلکتی تھی۔ وہ نظریں چرا کر فوراً صفیہ کو دیکھنے لگیں، جو مکمل ہوش میں آ چکی تھیں اور اب ساٹا چہرے کے ساتھ اپنے کمرے میں کھڑے کینوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”بیٹا، کیسی طبیعت ہے اب؟“ بے جی نے محبت سے پوچھا۔

”زندہ ہوں۔“ چہرے کی طرح اس کا لہجہ بھی ساٹا تھا۔ وہ سب کو نظر انداز کر کے ایک دفعہ پھر وضو کرنے چل پڑی تھیں۔

”مدیح بھابی کیا دینا پور گئی ہوئی ہیں۔ عروہ کی شادی کی تاریخ لینے.....“ روبینہ کے تلخ لہجے پر عروہ نے خوفزدہ نظروں سے ماں کو دیکھا، جن کے چہرے کا رنگ بھی تیزی سے اڑا تھا۔

”پتا نہیں، تمہیں کس نے بتایا.....؟“ گلغتہ نے بے چینی سے پوچھا۔

”ارے بھابی اس بات کو چھوڑیں۔ حویلی میں ہمارے بھی کچھ خیر خواہ موجود ہیں، آپ یہ بتائیں کہ شادی کی تیاری مکمل ہو گئی کیا.....؟“ روبینہ شاہ اس لمحے سب کو بہت سخت دل اور ظالم لگی تھیں۔

”بے جی آپ بات کریں گی ناں آج شاہ جی سے.....؟“ کھفتے نے التجائیہ نظروں سے اپنی ساس کو دیکھا۔ بے جی نظریں چرا کر اپنی لاڈلی بیٹی کے پلنگ کی بدرنگ گھسی ہوئی بیڑیٹ شیت کو غور سے دیکھنے لگیں۔

”بھابی ایک بات کہوں؟“ روبینہ شاہ کی تلخ ہنسی پر کھفتے کا دل کسی نے اپنی مٹھی میں لیا تھا جبکہ کھفتے کے کندھے پر وہ ہاتھ رکھے پر خلوص لہجے میں بولی تھیں۔

”دیکھیں بھابی ذرا عقلمندی کا ثبوت دیں یہ شادی اگر ہوتی ہے تو ہونے دیں۔“ عروہ اور اس کی ماں دونوں نے بدگمان نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

”دیکھیں ناں..... کم از کم عروہ انسانوں میں تو جائے گی ناں کچھ زندگی کا احساس تو ہو گا ناں..... ورنہ شاہ جی صنفیہ کے ساتھ والا کمرہ عروہ کے لیے آباد کر دیں گے اور قرآن پاک سے شادی کر کے اپنے مذہب اور اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑانے سے بہتر ہے کہ یہ انسانوں میں رہے ورنہ یہ اینٹوں سے بنی دیواریں اور تنہائی اسے جیتے جی مار دے گی۔“ روبینہ کے تلخ لہجے پر پورے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ صنفیہ پچھو نے ترحم بھری نگاہوں سے اپنی بھتیجی عروہ کو دیکھا۔ عروہ کی گلابی جلد کے ساتھ گلابی رنگ کھل مل رہا تھا..... لیکن اب اسی رنگت میں زردیاں کھل مل رہی تھیں۔ اس کی سیاہ چمکدار آنکھیں اب ماند پڑ گئی تھیں۔

یہ صبح سے آنے والی پانچویں دھمکی آمیز کال تھی جو سروہی نے اپنے آفس میں اینڈ کی۔ شیخ ضمیر الدین پچھلے تین روز سے اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ جہاں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی غیر موجودگی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے سروہی نے کارروکاری پر اپنا فچر دھڑلے سے شائع کروا لیا تھا۔ حالانکہ شیخ صاحب کے اسٹنٹ مجید صاحب نے دبے دبے لہجے میں اس فچر میں استعمال ہونے والے تلخ الفاظ کی طرف بھی اشارہ کیا تھا، لیکن وہ سروہی ہی کیا جو کسی کی بات مان جائے وہ صرف شیخ صاحب کے قابو میں آتی تھی۔

اس وقت بھی شیخ صاحب سخت جھنجھلائے ہوئے انتہائی غصے سے پورے شاف پر گرج رہے تھے جبکہ اصل مجرم ان کی ڈانٹ کو یوں سن رہی تھی جیسے یہ سارے حسین الفاظ کسی اور کی شان میں کہے جا رہے ہوں۔

”تم اپنا استعفیٰ کل مجھے خود بھجوا دو اور خبردار اس کام کے لیے خود آنے کی ضرورت

نہیں۔“ وہ سخت طیش میں تھے۔

”تو پھر کس طرح بھجواؤں گی آپ کو پتا تو ہے کہ ہم صرف دو بہنیں ہیں میرا کوئی بھائی نہیں۔“ سروہی کے غیر سنجیدہ لہجے پر پورے شاف کے چہروں پر دہلی دہلی مسکراہٹ نے احاطہ کر لیا تھا۔

”میں خود صبح آفس آتے ہوئے استعفیٰ وصول کر لوں گا، تم اس کی ٹینشن نہ لو اور آئندہ مشعل کے لیے کوئی شرانگیز تحریر لکھنے کی ضرورت نہیں میرا میگزین کسی کے بچکانا تجربات کے لیے نہیں ہے۔ غضب خدا کا ایک سے ایک ڈفر بندہ میرے آفس میں بھرتی ہے۔ ذرا سا ادھر سے ادھر ہو جاؤں تو من مانیاں کرنے پر اتر آتے ہیں۔ کچھ خوف خدا ہی نہیں ہے۔ شرم و حیا آنکھوں سے ختم ہو گئی ہے۔“ شیخ صاحب کا غصہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شام کو آفس وین میں بیٹھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیخ صاحب کا موڈ اب اتنی آسانی سے نارمل نہیں ہو گا۔

”گھر جاتے ہی بابا سے بات کرواؤں گی آخر کچھ تو دوستی کا لحاظ کریں گے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ جب سب ایڈیٹر مجید صاحب نے اسے مخاطب کیا۔

”مجھے لگتا ہے کہ شیخ صاحب اس دفعہ ضرورت سے زیادہ ہی مائنڈ کر گئے ہیں..... شاید والدہ کے انتقال کی وجہ سے خود بھی ذہنی طور پر اپ سیٹ تھے۔“

”ہاں شاید۔“ وہ پھمکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”بھئی ان کا مائنڈ کرنا تو بنتا ہے ناں ایک تو اتنے بڑے جذباتی دھچکے سے بٹ کر وہ آفس کئی دنوں بعد آئے اور اوپر سے آتے ہی دھمکی آمیز فون کالز نے ان کا بی پی ہائی کر دیا۔ اب اپنا غصہ انہوں نے کہیں نہ کہیں تو نکالنا تھا۔“ پروف ریڈر ارشد نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تو سروہی نے دل ہی دل میں اس کی دلیل کی تائید کی۔

”ہاں ورنہ شیخ صاحب جتنی سروہی کی فیور کرتے ہیں ہر بندہ جانتا ہے بلکہ آفس کے ایک دو لوگ تو اس چیز کو اچھا خاصا مائنڈ کرتے ہیں۔“ مجید صاحب نے محتاط انداز میں سروہی کی دل جوئی کرنا چاہی۔ وہ سب اس کے ایک دم خاموش ہو جانے پر یہی محسوس کر رہے تھے کہ وہ شیخ صاحب کی ڈانٹ پر افسردہ ہے جبکہ سروہی کا دماغ اپنے اگلے فچر کے تانے بانے بن رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ شیخ صاحب اس موضوع پر اسے کبھی کام کرنے نہیں دیں گے

لیکن اسے اپنا فیچر ہر حال میں چھوڑنا تھا۔ چاہے اس کے لیے آڈٹ داوے ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ آفس وین نے سب سے پہلے ارشد صاحب کو ان کے گھر ڈراپ کیا تھا۔ آفس کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت اس بات کا ثبوت تھی کہ شیخ صاحب اپنے ورکرز کا کتنا خیال رکھتے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ درختوں میں سائیں سائیں کرتی شام تاریکی میں ڈھل رہی تھی۔ وہ مکمل اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جاتی تھی۔ گھر میں بابا اور نور العباب بے چینی سے اس کے منتظر ہوتے۔ وہ بڑی تھی اور نور العباب اس سے چار سال چھوٹی، تھرڈ ایئر کی سٹوڈنٹ تھی۔ اس کی والدہ کا انتقال کچھ سال پہلے ہوا تھا۔ آج نور العباب نے چکن پلاؤ اور کباب بنائے تھے اور اس کو بطور خاص جلد آفس سے آنے کی تلقین کی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ جب مجید صاحب کی تشویش زدہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی، وہ ہائی ایکس دین کے ڈرائیور سے مخاطب تھے۔

”شفیق یہ بلیک شیشوں والی گاڑی بہت دیر سے ہمارے تعاقب میں ہے۔“

”میں جانتا ہوں اور ان کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے دو افراد کے پاس کلاشکوف بھی ہے۔ ابھی مڑتے ہوئے میں نے ایک جھٹک دیکھی ہے۔“ ڈرائیور کی فکر مند آواز پر سروہی کا دل بے اختیار دھڑکا تھا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے اپنے بائیں شیشے سے باہر دیکھا۔ بلیک کاراب بالکل برابر تھی۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے وین کے اندر دیکھا۔ وہ اب صرف تین لوگ تھے۔ مجید صاحب، سروہی اور ڈرائیور جبکہ ارشد عمر اور مشتاق راستے میں اتر گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کا ٹارگٹ مجید صاحب یا سروہی تھے، لیکن مجید صاحب تو ہمیشہ اس پس منظر میں رہ کر کام کرتے تھے۔ پھر.....؟ وہ ان کے مطلوبہ ٹارگٹ کا اندازہ کر چکی تھی۔ اس نے بہت تیزی سے اپنا بیک کھول کر عاکش درانی کا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور بہت سرعت سے اس نے اپنے سیل فون سے اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ وین کا ڈرائیور بہت اضطراری کیفیت میں وین کی رفتار بڑھا چکا تھا۔ وین ابھی مصروف شاہراؤں سے گزر رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے سیل فون کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف فون اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر تیزی سے نمبر ڈائل کیا تھا۔ اب پہلی بیل پر ہی فون اٹھا لیا گیا تھا۔

”عاکش! میں سروہی روزنامہ مشعل سے.....“ وہ بدحواسی سے بولی تھی۔

”ہاں! ہاں کیسی ہیں آپ.....؟“ دوسری طرف سخت حیرانی سے پوچھا جا رہا تھا۔

”ہماری وین کا تعاقب ہو رہا ہے، ہم مال روڈ پر ہیں، بلیک کار میں.....“ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی..... اندھا دھند فائرنگ نے سارا منظر بدل دیا تھا۔ تیزی سے چلتی ہوئی وین کے پیسے تیز آواز سے چڑھائے تھے۔ ڈرائیور کے ہاتھ بے قابو ہوئے تھے، لیکن اس کے حواس کنٹرول میں تھے۔ مجید صاحب کے کندھے پر لگنے والی گولی نے سروہی کو چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا، جبکہ مجید صاحب نے اس کا سرتیزی سے نیچے کر کے ایک اندھی گولی کے تعاقب سے اسے بچا لیا تھا۔ ہائی ایکس وین بے قابو ہو کر سامنے بلیڈنگ سے ٹکرائی تھی۔ بے شمار انسانی چیخوں نے ماحول کو دہشت ناک بنا دیا تھا۔

* * *

وہ دبے دبے قدموں سے حویلی کے زنان خانے کے پیچھے درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہی تھی۔ نومبر کا مہینہ تھا اور اچھی خاصی سردی نے لال حویلی کے تمام ملازمین کو اندر دبک کر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ رات کے ساڑھے دس بجے ہی حویلی میں ہو کا عالم تھا۔ شاہ جی، مدیحہ بیگم کے ساتھ دینا پور گئے ہوئے تھے اور حیدر دودن سے اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کرنے گیا ہوا تھا۔ وہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ صغیہ پھو کے کمرے کی لائٹ ایک دم جلی تھی۔ اس نے تشویش بھرے انداز سے ان کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اب وہ شش و پنج میں مبتلا تھی کہ آگے بڑھے یا پیچھے اپنے بیڈروم میں چلی جائے۔ کمرے کی لائٹ اچانک بند ہو گئی۔ اس نے اطمینان بھرا سانس لے کر قدم آگے بڑھائے۔

جنگلی پھولوں کے جھنڈ میں اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا اور وہ فضا میں پھیلی خوشبو سے اندازہ کر سکتی تھی کہ اندر کون ہے؟ وہ دونوں لال حویلی کی خاموش اور مظلوم سی محبت کے دو کردار تھے۔ ان دونوں کے درمیان بے تحاشا معاشی اور معاشرتی تضاد تھا، لیکن محبت ان تضادات کو کہاں مانتی ہے۔ ان کی خاموش محبت نگاہوں کی زبان سے پردان چڑھی تھی اور جب تک وہ دونوں سنبھلتے، محبت اپنے مضبوط جال میں انہیں جکڑ چکی تھی۔

ایک ٹھنڈا رخ ہوا کا جھونکا اس کے نازک وجود سے ٹکرایا تھا۔ اس پر ہلکی سی کچکی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے بلیک شال کو بہت مضبوطی سے دوبارہ اپنے ارد گرد لپیٹ لیا تھا۔ وہ اب محتاط

انداز سے آگے بڑھ رہی تھی۔ شاہ جی اور حیدر کی غیر موجودگی نے اسے خاصا بے خوف اور مڑ کر دیا تھا۔ حالانکہ حویلی کی تاریخ میں ایسی خاموش محبتوں کا انجام خاصا دردناک تھا، لیکن محبت ان تمام چیزوں کو کہاں مانتی ہے، تبھی وہ دونوں محبت کی اس وادی میں بغیر سوچے سمجھے داخل ہو چکے تھے۔ دونوں اپنے انجام سے بخوبی واقف تھے، لیکن محبت میں خوش فہمی انسان کو آگے سے آگے چلنے پر مجبور کرتی جاتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہوا ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ درختوں کی شاخیں شاخیں ماحول کو خاصا خوفناک بنا رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے اپنے مخصوص گوشے کے پاس جا کر رک گئی۔ اندھیرے میں چاند کی روشنی درختوں کی وجہ سے بہت کم زمین پر پہنچ رہی تھی۔ نیم کے درخت کے پاس حویلی کا گہرا کنواں ہلکی سی چاند کی روشنی میں خاصا پراسرار لگ رہا تھا۔

”کہاں ہو بھئی؟“ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ اس کی سماعت میں کوئی آواز جواب میں نہیں آئی تھی۔ رات کی مدھم ہوا، شہوت کے چٹوں سے ٹکرا کر ہلکی سی آواز پیدا کر رہی تھی۔ ”کہاں ہو بھئی..... کیا نہیں آئے ہو.....؟“ اس کی آواز سرگوشی کے مانند سررائی۔ ”ہمارا ایک اصول ہے کہ ہم وعدے سے نہیں پھرتے، زندگی میں ہمارے پاس الفاظ ہی ہیں، اس کے علاوہ ہے ہی کیا.....؟“ پیچھے سے آنے والی آواز میں ہلکی سی رنجیدگی تھی۔ اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا اور بلیک مردانہ مثال میں اسے دیکھ کر اطمینان بھری سانس لی۔ ہوا ایک دم تیز ہوئی تھی۔ اس نے بے حد سراسیمگی کے عالم میں موسم کے تیور دیکھے۔

”دلاور.....!“ لڑکی کی آواز میں حد درجہ تشویش تھی۔

”ہوں.....“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس کی آواز میں عجیب سی بے چارگی تھی۔ وہ جیسے خود سے بھی نالاں تھی۔ حلق میں آنسوؤں کا نمک سا کھل رہا تھا۔ ضبط کی کوشش میں اسے خاموش ہونا پڑا۔ ”میں ہوں تا تمہارے ساتھ..... پھر ڈر کس بات کا.....؟“ اس کی آواز میں حد درجہ اعتماد تھا۔ دلاور نے بازو سے پکڑ کر اسے پاس کر لیا تھا۔ وہ دونوں اسی کنویں کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ایک دوسرے کو محبت کا یقین دلا رہے تھے جس کنویں میں آج سے کئی سال پہلے شاہ جی کی بہن آمنہ نے کود کر خودکشی کر لی تھی۔

* * *

بلاول نے ختم ہوتے سگریٹ سے نیا سگریٹ سلگانے کے بعد گہرا کش لے کر دھواں فضا میں بکھیرا تھا۔ اس کے پاس کارپٹ پر رکھے ایش ٹرے میں سگریٹ کے بے شمار ٹوٹے بھرے ہوئے تھے۔ اس پورے کمرے میں عجیب سی بے ترتیبی تھی۔ حالانکہ اس کی نفاست اور نازک طبیعت کی معظم شاہ خود مثالیں دیا کرتے تھے، لیکن اس وقت اس کے بیڈ کی آدمی چادر بیڈ پر اور آدمی زمین پر لٹک رہی تھی۔ بک ریک سے نکالے گئے میگزین اور کتابیں کارپٹ پر ڈھیر کی صورت موجود تھیں۔ بے شماری ڈیز اور وی سی ڈیز بھی بے ترتیبی سے ٹی وی کے پاس، پڑی تھیں۔ رات کے کھائے ہوئے کھانے کے خالی برتن جوں کے توں سائینڈ ٹیبل پر پڑے تھے۔ ان تمام اشیاء کو ترتیب سے رکھا جاسکتا تھا، اگر بلاول شاہ کسی کو اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دے دیتا۔ کل سے کسی ملازم کی جرأت نہیں تھی کہ اندر جھانک کر ہی دیکھ لے۔

بکھرے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیر کر سر جھٹکتے ہوئے وہ اٹھ کر کمرے میں ٹھٹھنے لگا۔ اس کی ایک ایک ادا سے اضطراب جھٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر لاتعداد شکنیں تھیں جو اس کی ذہنی الجھن کی واضح غماز تھیں۔ اس نے ایک دفعہ پھر کل کے اخبارات پر نظر ڈالی تھی، جو اس کے شدید ڈپریشن کا باعث بنے تھے۔ سامنے ہی فرنٹ بیج پر معظم علی کا سچ کی کسی تھرڈ کلاس اداکارہ کے ساتھ انتہائی عامیانہ پوز اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ نیوایز کے موقع پر ہونے والے کسی ٹافنی فنکشن میں وہ پینے پلانے کے بعد بے خود ہو کر اس اداکارہ کی بانہوں میں جھول رہے تھے۔ کسی چالاک و عیار صحافی نے بڑی پھرتی اور مہارت سے یہ منظر اپنے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کیا تھا اور اسی منظر نے کل سے اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ انتہائی کوفت زدہ ہو کر اس نے اپنا سیل فون اٹھایا، چونکہ سائلٹ موڈ میں سیل فون تھا۔ اس وجہ سے وہ آنے والی کالز سے بے خبر تھا۔ پوری اٹھائیس مس کال تو نایاب درانی کی تھیں، ایک سجاد کی اور ایک بابا سائیں کی دیکھ کر اس کا موڈ ایک دفعہ پھر خراب ہو چکا تھا۔ اس نے سب سے پہلے معظم کو کال بیک کی تھی۔ وہ ان سے صاف صاف بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ دوسری طرف، ظم نے ”دوسری ٹیل پر ہی انتہائی خوشگوار موڈ میں اس کی کال اینڈ کی تھی۔

”ہاں بھئی میرا بلو شیر کہاں ہے؟ رات میں کافی دیر تک ٹرائی کرتا رہا، پھر تمہاری ماں نے تسلی دی کہ جوان خون ہے، کہیں مصروف ہو گا۔“ معظم کے ذومعنی لہجے پر اس کا دل جل کر خاک ہو گیا تھا۔

کچھ زیادہ ہی خوش اور تروتازہ لگ رہا تھا یا کوئی اور بات تھی۔“

”بابا..... پلیز میرے ساتھ ایسی بے ہودہ باتیں مت کیا کریں۔“ معظم کے معنی خیز لہجے نے اسے ایک دفعہ پھر بھڑکا دیا تھا۔ وہ ان کے کھلے ڈالے انداز گفتگو سے حدودِ جہد خائف تھا اور اکثر اس بات کا اظہار ان کے منہ پر بھی کر دیتا تھا جسے سن کر وہ خاصے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بری طرح چڑکھون بند کر چکا تھا۔ اب اس کی انگلیاں سجاول کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔ آگے سے پاور آف کی اطلاع نے اسے خاصا کوفت زدہ کر دیا تھا۔ وہ کچھ لمحے سوچ کر اٹھا اور واڈروب سے اپنا استری شدہ سوٹ نکالا، بیڈروم کا دروازہ کھول کر ملازم کو آوازیں دیں۔ اب وہ بالکل فریش موڈ میں ان کو ہدایات دے رہا تھا۔ واش روم میں آدھ گھنٹا لگا کر جب وہ واپس نکلا تو اس کا کمر اپنی پہلے والی حالت میں واپس آچکا تھا۔ پرفیوم کا بے تحاشا اسپرے کرتے ہوئے وہ اپنے نیکسٹ پروگرام ترتیب دے چکا تھا جس میں سرفہرست سجاول سے فیس ٹوفیس ملاقات تھی۔

* * *

وہ گلابی چہرہ بدستور خشکی کی لپیٹ میں تھا۔ سجاول ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کے چینل دھڑا دھڑ تبدیل کرتے ہوئے ایک دلربا سی نظراس دشمن جاں پر بھی ڈال لیتا تھا جو اسے نظرا انداز کر کے کبھی کبھل کو تہ لگانے لگتی تو کبھی بیڈ کی چادر درست کرنے کے چکروں میں خود کو مصروف دکھائی دینے کی کوشش میں مگن تھی۔ وہ یونہی چھوٹے چھوٹے کام کرتی رہتی۔ جونہی وہ کمرے سے کسی کام کے لیے باہر نکلتی، سجاول کی بلند آواز اس کے ہاتھ پیر پھلا دیتی تھی اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں واپس آتی تھی۔ اس وقت بھی سجاول کی پڑشوق نظریں اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھیں۔

”کیا مصیبت ہے؟ آخر آپ واپس کب جائیں گے؟“ اس کے کوفت زدہ لہجے پر سجاول نے تہتہ لگایا تھا۔

”کیوں جان من؟ ہمارا بس چلے تو سات جنموں تک آپ کے قدموں میں بیٹھے رہیں۔“ وہ شریر ہوا۔

”فضول مت بولیں، میں ان جنموں شموں پر کوئی یقین نہیں رکھتی۔ عجیب شخص ہیں ایک ہفتے سے سر پر سوار ہیں۔“ مومنہ کی بڑبڑاہٹ سجاول کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

”بابا ہزار دفعہ کہا ہے کہ میرا نام بلاول ہے یہ بلوشلو آپ اپنے پالتو ملازموں کو کہہ لیا کریں۔“ وہ بری طرح چڑا تھا جبکہ دوسری طرف معظم نے بلند آواز میں تہتہ لگایا تھا۔

”اوہ سوٹ ہارٹ..... جو کچھ مرضی کہہ لے لیکن مجھے بہت خوشی ہوتی ہے تجھے بلو کہہ کر اور سنا کہ سجاول سے بات ہوئی۔ مجھے گجرتا رہا تھا کہ میرا چیتا پھر کہیں ایک آدھ گولی لکوا آیا ہے۔“ وہ سجاول سے متعلق یوں بات کر رہے تھے جیسے کسی تھرڈ پرسن کے متعلق بات ہو رہی ہو۔

”کیا.....؟“ وہ بری طرح چونکا۔ ”کب اور کیسے گولی لگی.....؟“ وہ ایک دم فکر مند ہوا۔ کچھ بھی تھا اسے اپنا بڑا بھائی عزیز بھی تو بہت تھا۔ دوسری طرف معظم اس کے بے چین لہجے پر ایک دفعہ پھر ہنسنے لگے۔

”اوئے مرد بن.....! میرا بچہ چیتا ہے چیتا..... مردوں کی طرح لڑتا ہے اگر گولی کھا کر آیا ہے تو ایک دو پھڑکا کر بھی آیا ہوگا۔ میں تو شکر کرتا ہوں کہ میرا ایک بیٹا تو شیر جوان ہے ناں.....! کم از کم دشمنوں کی نیندیں تو حرام کیے رکھتا ہے۔ تمہاری طرح عورتوں کی طرح اندر نہیں گھسارہتا۔“ معظم نے اس کی شرافت پر طنز کیا تھا۔ وہ بھڑک کر بولا تھا۔

”مجھے جاہلوں کی طرح یہ خون خرابا بالکل پسند نہیں، میں انسانیت کی قدر کرتا ہوں اور جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل درآمد کرنے کا قائل ہوں۔ مجھے سیاست، زمینداری اور لڑائی جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں..... آپ اور سجاول ہی یہ دہشت مچائے رکھیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں اور مجھے بار بار اس چیز کا طعنہ مت دیا کریں۔“ اس کے ناراض لہجے پر دوسری طرف معظم نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ انہیں اپنا یہ ایجوکیٹڈ اور نفیس سی طبیعت کا حامل بیٹا جان سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ حالانکہ وہ اس کی بعض عادات کو سخت ناپسند کرتے تھے لیکن پدرانہ محبت سے مجبور ہو کر اسے کچھ کہنے سے گریز کرتے تھے۔

”بابا! سجاول آج کل ہے کہاں؟ رنگ پور یا لاہور.....؟“ وہ اپنے فون کرنے کا اصل مقصد بھلا کر اب اپنے بھائی کے لیے فکر مند ہو رہا تھا۔

”لاہور میں۔“ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”زیادہ زخمی تو نہیں.....؟“ بلاول نے آہستگی سے پوچھا۔

”بھی زیادہ اور کم کا مجھے پتا نہیں، فون پر بات ہوئی تھی اور آواز سے تو مجھے ضرورت سے زیادہ فریش لگ رہا تھا، اب اللہ جانے آس پاس کوئی ٹھنڈی ہوا چلا رکھی تھی اس وجہ سے

فخص کا نام اپنے نام کے ساتھ علیحدہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔
 ”کیا سوچ رہی ہو مومنہ؟“ سجاد نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں، بس لال حویلی کے بارے میں خیال آ گیا تھا۔ پتا نہیں شاہ جی نے عروہ اور
 اریہہ کا کیا حال کیا ہوگا؟“ اس نے صاف گوئی سے بتایا۔
 ”ہوں.....!“ سجاد نے فکرمند لہجے میں کہا اور اس کا اداس چہرہ غور سے دیکھا۔
 ”میں بتا دیتا ہوں تازہ ترین صورت حال.....“
 ”کیا.....؟“ وہ زبردست چونکی۔

”ہاں میں.....“ وہ مسکرایا..... مومنہ نے سوالیہ نظروں سے سامنے بیڈ پر لیٹے فخص کو
 دیکھا جس کی زخمی ٹانگ نے اسے پچھلے ایک ہفتے سے بیڈ پر لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ یہی فخص
 تھا جس کے اندر پارہ دوڑتا تھا۔
 ”بتائیں ناں.....!“ وہ بے چین ہوئی۔

”بھی تازہ ترین اطلاع کے مطابق تمہارے پاگل شاہ جی نے عروہ کی شادی دینا پور
 کے سب سے خراٹ اور ایک نمبر کے مکار فخص شجاعت علی کے ساتھ طے کر دی ہے۔“
 ”کیا.....؟“ مومنہ کو زبردست دھچکا لگا تھا۔ ”وہ ماموں شجاعت کے ساتھ؟“ وہ بے
 یقینی سے بولی تھی۔

”ہاں شاہ جی کی دوسری رنگ رنگیلی بیگم مدیحہ کے بڑے بھائی کے ساتھ.....“
 ”شاہ جی کا دماغ ٹھیک ہے؟“ صدے سے مومنہ کی آواز پھٹ رہی تھی۔
 ”ہاں تبھی تو میں ان کو آدھا پاگل کہتا ہوں.....“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔ مومنہ کو
 حقیقت میں شاک لگا تھا۔ اپنی نازک اور حساس سی کم عمر بہن کے ساتھ یہ بے انصافی اور ظلم
 اسے جذباتی دھچکے کا شکار کر گیا تھا۔ وہ بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ کچل رہی تھی۔

”تمہیں شاید علم نہ ہو کہ مجھے شاہ جی نے ظلع کا نوٹس جب بھجوا تو میں پاگل ہو گیا تھا۔
 ان کا ارادہ مجھ سے طلاق دلوانے کے بعد تمہاری اسی گنجے شجاعت کے ساتھ شادی کروانے کا
 تھا، لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی، لیکن مجھے عروہ کا سخت افسوس رہے گا۔ وہ ایک پرمخلص اور
 اچھی لڑکی تھی جسے شاہ جی اپنے غلط فیصلے کی سمیٹ چڑھا رہے ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ میں
 چاہنے کے باوجود اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا.....“ سجاد کے پرمخلص لہجے پر مومنہ نے

”بھی قرب قیامت کی نشانیاں ہیں اب بیویاں اپنے شوہروں کی موجودگی سے بیزار
 ہونے لگی ہیں اور ان کے گھر سے جانے پر سکون کا سانس لیتی ہیں، توبہ توبہ۔“ سجاد کا موڈ
 مکمل ریٹ کے بعد خاصا خوشگوار تھا۔

”ظاہر ہے جب آپ چھپوڑے لوگوں کی طرح ہر وقت ان کا ایکس رے کریں گے تو وہ
 آپ کے جانے کی دعا نہ کریں تو اور کیا کریں.....؟“ اس کے چڑنے پر وہ ایک دفعہ پھر ہنسا تھا۔
 ”بھئی مجھے تو ڈاکٹر نے پورے مہینے کا بیڈ ریٹ بتایا ہے۔“ وہ مزید پھیلا۔
 ”کیا.....؟“ مومنہ نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا جو اپنی مسکراہٹ چمپا رہا تھا۔
 ”یہ کون سا فضول اور کھا ڈاکٹر ہے.....؟“

”ڈاکٹر وسیم عباس۔“ اس نے مصنوعی سنجیدگی سے جواب دیا۔
 وہ کچھ لمحے بالکل خاموش رہی..... سجاد نے پرمشوق نظروں سے اس کے سنجیدہ چہرے کو
 دیکھا۔ یہ لڑکی اس کے دل کی دھڑکن تھی، کچھ سال پہلے اسے شہر جاتے ہوئے سجاد نے نقاب
 میں دیکھا تھا اور اس کی سحر انگیز آنکھیں دیکھ کر اس کا دل بغاوت پر اتر آیا تھا اور جب اسے پتا
 چلا کہ یہ مومنہ شاہ ہے تو وہ قدرت کے اس احسان پر کچھ لمحے تو خوشی سے گنگ رہ گیا۔

مومنہ شاہ..... وہ نام تھا جو اس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے نام کے ساتھ سنا تھا۔ اسے
 اس نام سے خاصی انسیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ دو تین دفعہ بہت دھڑلے سے اس کے ہاسٹل
 بھی پہنچ گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ البتہ عروہ نے خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا۔
 اسے اپنی مومنہ آپہ کے لیے یہ مردانہ وجاہت کا پیکر اور پڑ اعتماد انداز والا فخص خاصا پسند آیا
 تھا اور بہت جلد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مومنہ بھی اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی
 ہے۔ پھر کبھی ان کی ٹیلی فون پر بھی بات ہو جاتی تھی۔ مومنہ نے کن آنکھوں سے بیڈ پر لیٹے
 اس فخص کو دیکھا جو کسی دلکش سوچ میں گن تھا۔

”وہ اچھا خاصا خوش شکل تھا، لیکن اس کی جارحانہ سرگرمیاں اور بے دھڑک انداز اسے
 خوفزدہ کر دیتا تھا۔ لال حویلی میں جس بندے سے حد درجہ خائف اور چڑتے تھے وہ سجاد
 تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اس کے لیے خاصے معیوب الفاظ استعمال کرتے تھے اور مومنہ کو نہ جانے
 کیوں اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ سجاد اس کے دل کی وادی میں کب اور کیسے داخل
 ہوا.....؟ لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ شاہ جی اور حیدر لالہ کی سخت ناپسندیدگی کے باوجود اس

ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں مخصوص رش تھا۔ وہیں بھاگتے دوڑتے ڈاکٹر ز نرس اور وارڈ میں پریشان گھبرائے ہوئے مریض اور ان کے لواحقین جبکہ وارڈ کے باہر بھی لوگوں کا جم غیر تھا۔ گاڑیوں، ویکوں، سکوترز کا بے ہنگم شور اور بد نظمی..... سروہی کو مکمل ہوش میں آئے چند لمحے ہی ہوئے تھے۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے بے چینی سے بیٹھے بابا کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر حد درجہ فکر اور پریشانی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ بابا سے کچھ فاصلے پر شیخ ضمیر صاحب سیل فون کان سے لگائے خامے معروف تھے۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اسے آنکھ کھولتے دیکھ کر انہوں نے اشارے سے اس کی خیریت پوچھی تھی۔

پرائیویٹ روم کے دائیں کونے میں پڑی چیئر پر آرام و سکون سے اخبار پڑھتے ایس بی عائش درانی کو دیکھ کر اس کے ذہن کو جھٹکا لگا تھا۔ عائش درانی اسے ہوش میں آتا دیکھ کر فوراً کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا اخبار اس نے بے پروائی سے کرسی پر پھینکا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی.....؟“ عائش درانی کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ اس نے تاسف بھری نظروں سے اس کے اترے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھا۔ سروہی کے نرم گداز اور دوھیار خشار پر دو انچ لمبی کھردھ لگی ہوئی تھی جبکہ ماتھے پر بھی زخم کا نشان تھا۔

”بھئی کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ کیا محسوس ہو رہا ہے؟“ عائش نے دوبارہ پوچھا اور وہ جو اپنے جسم کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی زبردستی مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے اپنی طبیعت پر عجیب سی کسلندی چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”بہت بے پروا لڑکی ہے یہ اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا..... کسی دن بہت بڑا نقصان کرواتے گی، تب اس کو احساس ہو گا۔“ شیخ ضمیر الدین کو اس پر خاصا غصہ تھا جو ان کے لفظوں اور لہجے سے صاف جھلک رہا تھا اور انہوں نے حسبِ عادت اسے چھپانے کی بھی

توصیفی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”مومنہ! سائیڈ ٹیبل سے مجھے پین کھر نکال کر دو۔“ سجاد کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ مومنہ نے لپک کر دروازہ کھولی اور ٹیبلٹ نکال کر شیشے کے گلاس میں پانی ڈالا اور اسے پکڑا یا جو آنکھیں بند کیے اب لیٹا ہوا تھا۔

”سجاد!.....“ اس نے بے چینی سے اسے پکارا۔

”ہوں.....“ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

”یہ ٹیبلٹ۔“ مومنہ نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

”تھینک یو.....“ وہ زبردستی مسکرایا تھا۔

”سجاد کوئی سوپ یا ٹینی وغیرہ بنا دوں.....؟“ اس نے فکر مند لہجے میں پوچھا تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ اثبات میں سر ہلایا..... اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ پہلی دفعہ مکن میں داخل ہوئی تو گوشتی بوانے حیرانی سے اسے دیکھا تھا جبکہ وہ اسے نظر انداز کر کے سوپ کے لیے چکن وغیرہ نکالنے لگی۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ گرم گرم سوپ کا پیالہ لے کر اندر آئی تو سجاد گہری نیند میں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹائے اور ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ کسی نے بہت تیزی سے ان کے بیڈ روم کا دروازہ بجایا تھا۔ سجاد نے انتہائی ناگواری سے آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔

”کون ہے.....؟“ سجاد نے غصے سے پوچھا۔ باہر سے ان کے باڈی گارڈ نے بہت جلدت میں اطلاع دی تھی۔

”سجاد! سائیں! ابھی ابھی چھوٹے سائیں کی جیب بنگلے والی سڑک پر دکھائی دی ہے میرے خیال میں دو تین منٹوں میں وہ یہاں آپ کے کمرے میں پہنچنے والے ہیں.....“

”کیا.....؟ کون..... بلاول؟“ سجاد شاہ کی نیند بھک سے اڑ گئی تھی وہ تیزی سے اٹھا۔

مومنہ شاہ نے خوفزدہ نظروں سے بیڈ روم کے دروازے کی طرف دیکھا تھا جس کے پار بلاول کی بہت بلند آواز صاف آ رہی تھی۔ وہ ملازموں سے پوچھتا ہوا بے ہڑک اندر ہی آ رہا تھا۔

میں ہوتی ہیں تو دوسروں کے ہوش اڑا دیتی ہیں۔ میں کہہ دیتا ہوں جلال الدین اب اس لڑکی کو اپنی نگرانی میں گھر بٹھاؤ۔ کوئی ضرورت نہیں اس سے نوکری کروانے کی۔ اس میں نوکری کرنے کی اہلیت ہی نہیں۔“ عائش کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اس نے خنگی بھرے انداز سے اپنے بابا کو دیکھتی سروہی کو دیکھا۔

”بابا آپ اپنے دوست کو سمجھاتے کیوں نہیں؟ میں اپنے قلم کے ساتھ نا انصافی نہیں کرتی۔ میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہونے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے محترمہ! آپ اپنا دودھاری خنجر جیسا قلم استعمال کرتی رہیں اور مت سوچیں کہ آپ کے لکھے کا خمیازہ کن کن کو بھگتنا پڑے گا۔ آپ کی وجہ سے اگر کسی کے گھر کا واحد کمانے والا شخص موت کی وادی میں ڈوب جاتا ہے آپ مطمئن رہیں کہ آپ نے ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ بس ایک لمحے کے لیے سوچئے گا کہ مجید صاحب کی چار جوان بیٹیوں اور ایک بیٹے کا کیا بنے گا.....؟“ وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جیسے کسی گہرے خواب سے آکھ کلی ہو۔

”کیا ہوا مجید صاحب کو.....“ سروہی کے دل و دماغ کو بے چینی سی لگی۔ اس کے ذہن کے درپچوں میں اکیاون سالہ بزرگ اور مہربان سی شخصیت کے حامل مجید صاحب کا چہرہ روشن ہوا تھا۔ بابا کے چہرے پر گہرا تاریک سا سایہ دوڑا تھا۔ شیخ ضمیر الدین اور عائش درانی نے بے ساختہ آنکھیں چرائی تھیں۔ ایک نہ ہونی کے ہونے کا احساس سروہی کے دل میں جاگا تھا۔

”بتائیں ناں.....؟“ وہ بمشکل بولی تھی۔

”کچھ نہیں اس دن ہونے والی فائرنگ سے کچھ نہ کچھ تو ہوتا تھا اور مجید صاحب کا بوڑھا وجود زخموں کی تاب نہ لا سکا..... کل ان کا جنازہ تھا عصر کے بعد..... اور آج قل.....“ سروہی کے شل ہوتے اعصاب یک دم برقی تاروں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ اس نے آنکھیں موند کر تکیے پر سر رکھ لیا، جیسے کسی لمبی مسافت سے واپس آئی ہو۔ گہری گہری سانس لے کر اس نے اندر کی وحشت اور جلن کو کم کرنا چاہا، مگر نہ جانے کیوں سانس لینی دشوار لگ رہی تھی..... اسے اپنے سینے میں درد کی لہریں سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اسے پھر پتا چلا تھا کہ وہ کافی گھنٹوں کے بعد ہوش میں آئی تھی۔

* * *

”تم کیوں اپنی جان ہلکان کیے رکھتے ہو.....؟ جب تمہیں معلوم ہے کہ بابا کی یہ عادت

ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ سروہی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ذہن کے پردے پر سارا واقعہ روشن ہوا۔ کچھ نوکیلے سوال اس کے بھی ذہن میں ابھرے تھے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دم فائرنگ ہوئی تھی اور مجید صاحب نے اسے بے ساختہ نیچے کی طرف دھکیلا تھا۔ اتنے میں ڈرائیور سے گاڑی کا اسٹیرنگ بے قابو ہوا اور گاڑی جھومتی ہوئی سامنے والی بلڈنگ سے ٹکرائی تھی اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ اس کے بعد اسے اب جا کر ہوش آیا تھا۔ اس نے بے چینی سے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے احساس ہوا کہ اس کی دائیں ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا ہے۔ ایک دم تکلیف کا احساس جاگا تھا۔ بابا نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔

”کون لوگ تھے وہ.....؟ جنہوں نے فائرنگ کی؟“ سروہی نے تکلیف سے کراہت ہوئے پوچھا۔

”تمہارے خیر خواہ تھے محترمہ! اور جذبہ خیر سگالی کو فروغ دینے کے لیے تمہیں اکیس توپوں کی سلامی دینے آئے تھے۔“ شیخ ضمیر الدین اپنے مخصوص طنزیہ اور کیلے لہجے میں جل کر بولے تھے جبکہ ان کے اس انداز پر عائش درانی اور سروہی کے چہرے پر بڑی بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”پھر مذاکرات کیے بغیر کیسے چل پڑے اور ان کو پھولوں کے ہار بھی ساتھ لانے چاہئیں تھے.....“ آگے سے وہ بھی سروہی تھی، وہ کہنی کے بل اٹھتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں بولی تھی۔

”جناب! پھولوں کے ہار بھی ان کے ہمراہ تھے لیکن وہ کسی ”زندہ“ نہیں ”مردہ“ وجود پر ڈالنے کے لیے لائے تھے۔ وہ تو پولیس فوراً پہنچ گئی اور ہسپتال میں بھی طبی امداد مل گئی، ورنہ محترمہ اب ہمارے بجائے کہیں اور انٹرویو دینے میں مصروف ہوتیں۔“ شیخ ضمیر نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”بیٹا کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ بابا انتہائی پریشانی اور فکر مندی سے اس کے پاس آئے تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر انہیں تسلی دی۔

”بھئی سروہی آپ کا بیان ریکارڈ کرنا تھا اور آئی تمہک اب آپ مکمل ہوش و حواس میں ہیں؟ پھر کیا خیال ہے؟“ عائش کے ہلکے پھلکے لہجے پر ضمیر صاحب ناراض لہجے میں بولے تھے۔

”بھئی ان کا مکمل ہوش و حواس میں آنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ جب یہ ہوش

ہے اور اس عمر میں عادتیں بدلتی نہیں ہیں، تمہیں تو اب تک اس کا عادی ہو جانا چاہیے تھا.....“ سجاد نے بے پروائی سے ریموٹ کنٹرول سے اپنا پسندیدہ چینل سرچ کرتے ہوئے ایک نظر اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا، جو اس وقت خود سے بھی خفا لگ رہا تھا۔

بلاول کو وہاں آئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور پچھلے ایک گھنٹے سے وہ صرف معظم علی کے بارے میں ہی گلے شکوے کر رہا تھا، خاصا بے زار تھا..... اس کی اچانک آمد نے سجاد کو ایک لمحے کے لیے بوکھلا دیا تھا۔ اس نے مومنہ کو فوراً ڈرینگ روم میں جانے کا اشارہ کیا تھا اور اس وقت بھی وہ بظاہر خود کو خاصا مطمئن اور بے پروا ثابت کرتے ہوئے بلاول کی شکایتیں سن رہا تھا۔ حالانکہ اس کا تمام تر دھیان ڈرینگ روم میں پچھلے ایک گھنٹے سے بند مومنہ کی طرف تھا۔

”آئی ایم سوری! میرے اعصاب آپ کی طرح مضبوط نہیں ہو سکتے۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ماں جی اور بابا کی علیحدگی کے بعد میرا سارا بچپن بورڈنگ اور مختلف ہاسٹلز میں گزرا اور پھر شروع سے میں بابا کی نسبت آپ کے زیادہ قریب رہا ہوں اور بد قسمتی سے میرے بابا کے ساتھ تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے، تبھی میں نے پاکستان کے بجائے باہر رہنے کو ترجیح دی، لیکن میں خود کو بابا کی طرف سے کتنا بھی بے پروا شوکر لوں لیکن ان کے بارے میں چھپنے والی چھوٹی سی بھی نیکیو خبر مجھے بری طرح ڈسٹرب کر دیتی ہے۔ پتا نہیں آپ کو کچھ کیوں نہیں ہوتا؟“ وہ قدرے خشکی کے ساتھ سجاد کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا۔

”ہاں تو یہی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ تم نمود کو کیوں پریشان رکھتے ہو۔ انہوں نے ہمارے معاملے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور ہماری ضروریات کا ہمیشہ خیال رکھا تو پھر تم کیوں ان کی ذاتیات میں گھسے ہو؟ وہ کچھ انوکھا نہیں کر رہے، ہماری کلاس میں یہ سب عام اور ثانوی باتیں ہیں.....“ سجاد کے نرم لہجے پر بلاول نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا اور خامے چڑھے پن سے بولا تھا۔

”وہ ہمارے فادر ہیں اور ان کی ذاتی زندگی پر ہمارا مکمل حق ہے۔ انہوں نے بہت سال پہلے ہمارے لیے ترجیحات منتخب کر دی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ اگر اپنی ماں سے رابطہ رکھو گے تو باپ سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ وہ تو اوپر سے ہماری والدہ صاحبہ کو بھی اپنی اولاد سے کوئی

دلچسپی نہیں تھی۔ ورنہ والدین میں سے ایک کی تو ہمیں بھرپور توجہ مل جاتی.....“ بلاول کے بیزار چہرے پر ایک سایہ سا اترا وہ مزید گویا ہوا۔ ”انہوں نے پہلی شادی کے بعد فوراً دوسری کی، ہم خاموش رہے، خیر سے اس وقت ویسے بھی ہمارا بچپن تھا اور پھر تیسری شادی کی اور اب پھر آئے دن ان کے سینیٹل پڑھ کر اور سن کر میرا تو دماغ کھولنے لگتا ہے۔ انہیں کم از کم اپنی عمر کا ہی خیال کرنا چاہیے۔“ سجاد کو اس کے جھجھلائے ہوئے لہجے پر بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔

انہوں نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول سے بٹن دبایا اور روشن سکرین پر اندھیرا چھا گیا۔ ”میری جان! مرد کبھی بھی بوڑھا نہیں ہوتا اور ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ عمر کا تعلق جسم سے نہیں، ذہن سے ہوتا ہے۔ تم ناحق خود کو کھپا رہے ہو۔ زندگی کو انجوائے کرو۔ کبھی ہماری ضرورت پڑے تو موسٹ ویلکم۔ تمہیں تو پتا ہے کہ تم بے شک مجھ سے چار سال چھوٹے ہو لیکن میرے بچے یا رہو۔ میری جند جان ہو۔“ سجاد کے غیر سنجیدہ لہجے پر بلاول نے اپنے اندر اٹھتی اشتعال کی لہر کو بمشکل دبایا تھا۔

”سوری میں ایسی اخلاق سے گری انجوائے منٹ کا قائل نہیں۔ ایسی سرگرمیاں بابا اور آپ کو ہی مبارک ہوں.....“ اس نے طنزیہ نظروں سے سامنے ڈرینگ ٹیبل پر پڑی چوڑیوں اور میک اپ کے سامان کو دیکھا۔ سجاد نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور ڈھیروں غالت نے ایک دم اس پر حملہ کر دیا تھا۔ بلاول سے اس کی لاکھ بے تکلفی سہی لیکن اپنے چھوٹے بھائی کی نظروں میں اس لمحے جتنا صدمہ تھا، اسے دیکھ کر وہ کھسیا ہٹ کا شکار ہو گیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

”اور بھی سناؤ، حویلی کب چل رہے ہو؟ بتاؤ کسی دن پروگرام اکٹھے ہی چلتے ہیں، بابا کو سر پرانز دیتے ہیں۔“ وہ آواز میں مصنوعی بشت بھرتے ہوئے بولا۔

”ابھی آپ دونوں کے ”سر پرانز“ سے تو نمٹ لوں۔“ وہ دل میں تملایا، لیکن زبان سے صرف اتنا ہی کہا۔

”ابھی تو میرا کوئی ارادہ نہیں، میرے قمر ڈسٹر کے ایگرام ہونے والے ہیں۔“ خامے روکے پیکے لہجے میں کہتے ہوئے وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت اس کا سیل فون بجاتا تھا۔ اس نے ناگواری سے سکرین کو دیکھا، حواس ایک دم الٹ ہو گئے تھے..... نایاب کا نمبر تھا۔ اس نے فوراً ہی نمبر کاٹ کر سیل فون آف کر دیا تھا۔

سجاد نے جاچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا، جو واپسی کے لیے پرتول رہا تھا۔
 ”بھئی کہاں کے ارادے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہے، دونوں بھائی کھانا بھی کھاتے ہیں اور کپ شپ بھی لگاتے ہیں۔“ سجاد کے محبت بھرے اصرار پر اس نے فوراً نفی میں سر ہلا کر معذرت کی۔

”سوری بھائی، میرا آج ایک دوست کے ساتھ کھانے کا پروگرام ہے، ہم پھر کبھی کسی اچھے ماحول میں بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھائیں گے، ابھی تو مجھے اجازت دیں۔“ گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے اس نے طہریہ لہجے میں سراسر ٹالاکھا۔

”بھئی مرضی کے مالک ہوتے، ہم تو تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔“ وہ دانستہ خوشگوار لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔ چلتے چلتے بلاول ایک دم ٹھنکا اور پھر کچھ یاد آنے پر بولا۔
 ”یہ لال حویلی میں کیا مسئلہ ہوا ہے؟“ اس کا لہجہ سرسری تھا، لیکن سجاد بری طرح چونک اٹھا۔

”کیوں کیا ہوا ہے؟“ وہ انجان بن کر پوچھنے لگا۔

”پھر حیدر اور دلاور کی دم پر پاؤں کس نے رکھا ہے؟ وہ کیوں باؤ لے ہوئے پھر رہے ہیں، مجھے سمندر خان بتا رہا تھا کہ لال حویلی میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے اور شاہ جی اور حیدر کو بھانجڑ لگے ہوئے ہیں اور ساری حویلی کے ملازموں کی شامت آئی ہوئی ہے اور خود شاہ جی دن میں تین تین دفعہ دینا پور کے چکر لگا رہے ہیں۔“ بلاول کے پاس جتنی معلومات تھیں، اس نے سادگی کے ساتھ بیان کر دی تھیں۔

”اچھا.....“ سجاد نے گہری اور جاچتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اتنا تو انہیں بھی معلوم تھا کہ بلاول کی ان معاملات میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے اور اتنی معلومات بھی اسے اس کے ڈرائیور سمندر خان نے دی تھیں کیونکہ اس کے سسرال کی کچھ خواتین لال حویلی میں کام کرتی تھیں۔

”ہو گا کوئی نہ کوئی مسئلہ، حیدر کو بھی سکون سے بیٹھنے کی کہاں عادت ہے یا پھر شاہ جی کو کوئی نہ کوئی دورہ پڑا ہو گا۔ آج کل سنا ہے کہ عروہ کی شادی اپنی دوسری بیگم کے بھائی شجاعت علی کے ساتھ کروانے کی تیاریوں میں ہیں۔“

”کیا.....؟“ وہ بری طرح ٹھنکا..... ”یہ عروہ دوسرے نمبر والی بیٹی ہے نا؟“ اس نے

جنس بھرے لہجے میں پوچھا تو سجاد معنی خیز لہجے میں بولا۔
 ”ہاں دوسرے نمبر والی وہی بیٹی جو کبھی تمہارے نام سے منسوب تھی۔“ وہ فوراً سنبھلا اور سر جھٹک کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میں بچپن کی ان مگنیوں کو نہیں مانتا اور مجھے تو سراسر یہ احمقانہ فعل لگتا ہے کہ بچوں کی زندگی کے فیصلے ان سے پوچھے بغیر ان کو ایک دوسرے کے ساتھ زبردستی منقسم کر دیا جائے۔ اگر عروہ کی رضامندی سے یہ سب ہو رہا ہے تو ٹھیک ہے.....“

”تمہیں کوئی افسوس نہیں؟ آخر وہ تمہارے نام سے منسوب رہی ہے۔“ سجاد نے کھوجتے لہجے میں پوچھا، بلاول نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
 ”واٹ اے ربش! میں ان فضولیات کو نہیں مانتا.....“

”بھئی یہ تو غیرت کا معاملہ ہے.....“ سجاد نے افسوس بھری نظروں سے دیکھا۔
 ”یہ کیسی غیرت ہے؟“ اس نے طہریہ لہجے میں کہا۔ ”ہر بندے کی اپنی زندگی ہے، اپنی پسند اور ناپسند ہے اور لال حویلی والوں سے جیسے ہمارے تعلقات ہیں، شاہ جی کا دماغ خراب ہے جو اسے میرے نام پر بٹھائیں رکھیں اور ویسے بھی تعلقات ٹھیک بھی ہوتے تو میں خود اس رشتے سے انکار کر دیتا۔ مجھے حویلی کی چھوٹی موٹی ٹائپ لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں..... لائف پارٹنر کے طور پر میرے ذہن میں جو خاکہ ہے، وہ ان پر پوری نہیں اترتی۔“
 ”تمہیں معلوم ہے کہ عروہ نے میڈیکل کا میرٹ بنا لیا ہے اور وہ کنگ ایڈورڈ کے مروجہ معیار پر پوری اترتی ہے.....“ سجاد نے اسے اطلاع دی۔

”اچھا.....“ اس نے بے پروائی سے کندھے جھٹکے..... اسے جتنی حیرت ہوئی تھی، لیکن اس کا اظہار کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”اور تمہیں شاید یہ بھی علم نہیں کہ شجاعت اس سے پورے پچیس سال بڑا ہے اور اس کی یہ تیسری شادی ہے، اس کے سب سے بڑے بیٹے کے بھی تین بچے ہو چکے ہیں.....“ سجاد کی اس اطلاع پر وہ اپنی بے ساختہ حیرت کو چاہتے ہوئے بھی نہیں چھپا سکا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟ کیا شاہ جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو ایسا بے جوڑ رشتہ کر رہے ہیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”کیا انہوں نے عروہ کی مرضی پوچھی ہے؟“ بلاول کے سوال پر انہوں نے استہزاء سے

نظروں سے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا جیسے اس کے خرابی دماغ کا یقین آ گیا ہو۔

”مجھے لگتا ہے بلاول تم ”باہر“ رہ کر اپنا دماغ بھی باہر چھوڑ آئے ہو اور حویلی کی اور ہمارے خاندان کی روایات کو بھی بھول گئے ہو۔ اتنا کمزور حافظہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ تم شاید بھول گئے ہو کہ حویلی میں لڑکیوں کی رائے اور پسند یا ناپسند کا کوئی رواج نہیں۔“

”تو غلط روایات ہیں..... ہمیں ان کو ختم کرنا چاہیے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

”بلاول مجھے لگتا ہے آج صبح تم نے ناشتہ نہیں کیا۔ اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ میرے بھائی بیٹھ جاؤ، میں کسی کو بھیج کر تمہارے لئے ناشتہ منگواتا ہوں۔“ سجاد کے طنزیہ انداز پر بلاول نے ایک نگاہ اپنے بڑے بھائی پر ڈالی۔ اس ایک نظر میں بے تحاشا غصہ، شکوہ اور ناراضی تھی۔ تبھی وہ یہاں رکا نہیں اور فوراً باہر کی جانب قدم بڑھائے جبکہ سجاد اسے روکتا ہی رہ گیا۔

* * *

لال حویلی میں دو مہینے کے بعد زندگی کے کچھ آثار نظر آئے تھے۔ شاہ جی نے عروہ کا ایڈمیشن میڈیکل کالج میں کروانے کے بجائے اس کی شادی کی تاریخ طے کر دی تھی۔ شگفتہ نے احتجاجاً ساری سرگرمیوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا جبکہ مدیحہ ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ پوری حویلی میں گھومتی پھرتی تھیں اور انہی کے حکم پر حویلی کی ملازماؤں نے رسیلی کی سرکردگی میں ڈھولک رکھی ہوئی تھی۔ ملازموں کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ رسیلی نے ڈھولک کی لے پر تان اٹھائی تھی۔

”بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی

بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا، بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا.....“

”بھئی لڑکیو کیا تمہارے اندر جان نہیں ہے۔ مری مری آواز میں تالیاں بجا رہی ہو۔“ حیدر جو کسی کام سے اندر آیا تھا۔ رسیلی کو دیکھ کر شوخ انداز میں گویا ہوا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ موڈ خاصا خوشگوار ہے۔ چھوٹے شاہ کی چیخڑ چھاڑنے کو جوان لڑکیوں کے اندر بجلی دوڑادی تھی۔

”میں تو صبح سے کہہ رہی ہوں کہ کم بخت کوئی جشن مناؤ..... آج پہلی دفعہ حویلی سے کوئی لڑکی باعزت طریقے سے رخصت ہو رہی ہے.....“ مدیحہ اندر سے بولتی آ رہی تھیں۔

”اماں ان کا قصور نہیں۔ انہوں نے کب حویلی میں ایسی رخصتیاں ہوتی دیکھی ہیں.....؟ آج تو حویلی کی دیواریں بھی مارے حیرت کے دو دو انچ پیچھے کھسک گئی ہیں.....“ حیدر نے اپنے بالوں میں اٹھلیاں پھیرتے ہوئے رسیلی کے ساتھ بیٹھی رسول بخش چوکیدار کی بیٹی ”کوگی“ کو اپنی گہری نظروں کے حصار میں لیا اور دل ہی دل میں خود کو کوسا کہ اتنا شاندار ہیں اب تک اس کی نظروں سے کیسے دور رہا.....؟ اس کے اندر کی کیفیت سے بے خبر رسیلی کے لبو میں حدت پھوٹ رہی تھی۔ چہرے پر قوس و قزح کے ساتوں رنگ تھے اور لہجے میں خود بخود کھٹک اور سیلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے وجود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ لان سے کچھ فاصلے پر عروہ کے کمرے میں ڈھولک کی آواز اس کے اعصاب پر بم کی طرح برس رہی تھی۔

اپریل کا مہینہ تھا اور فضا میں اچھی خاصی گرمی تھی، لیکن موسم اتنا گرم بھی نہیں تھا کہ اے سی کی کوئٹہ کو مکمل سپیڈ پر کر دیا جائے اے سی کی کوئٹہ نے کمرے کو بخ کر رکھا تھا۔ عروہ اپنے بے حس و حرکت وجود کو نرم ٹمٹمیں کبل میں چھپائے سونے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے اندر ایک جمود سا طاری تھا۔ ابھی رات ہی تو دلاور سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی خاصا پریشان تھا۔ ایک محسوس کی جانے والی اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں شاہ جی اور حیدر کو یہ شادی آگے کرنے کا بھی مشورہ دیا تھا، لیکن شاہ جی اس دفعہ اپنے ارادوں میں خاصے مضبوط واقع ہوئے تھے۔ ورنہ وہ دلاور کے مشوروں پر ہمیشہ غور و فکر ضرور کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو دلاور کو لگتا تھا کہ وہ بعض معاملات میں حیدر سے زیادہ اس پر اعتماد کرتے تھے، لیکن اس مرحلے پر آ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وقت، قسمت اور ہر چیز اس کے خلاف جاری ہو۔ اسے نہیں معلوم کہ یہ گلابی رنگت اور سیاہ گھنیری پلکوں والی گڑیا سی لڑکی اسے کب اچھی لگنے لگی۔ وہ مومنہ کی نسبت سنجیدہ کم گو اور ہر وقت سبھی سبھی سی رہتی تھی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس دن موسم غضب کا تھا اور لال حویلی کی طرف آتے ہوئے آموں کے باغ کے پاس حویلی کو جاتی ہوئی سیاہ سڑک پر شاہ جی کی خواتین کے لیے مخصوص چیپ دیکھ کر وہ اپنی گاڑی بے اختیار روک بیٹھا تھا۔ چیپ کا انجن کوئی مسئلہ پیدا کر رہا تھا اور بھی ڈرائیور اور گن مین دونوں انتہائی فکر مندی سے اسے ٹھیک کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔

”محمد حسین کیا ہوا ہے جیب کو؟“ اس نے اپنی گاڑی بالکل پاس جا کر روکی تھی۔
 ”کچھ نہیں دلاور صاحب! انجن شاید گرم ہو گیا ہے۔ میں بیبیوں کو کالج سے لے کر واپس آ رہا ہوں جی۔“ محمد حسین حویلی میں دلاور کی حیثیت سے بخوبی واقف تھا۔ تبھی اس کے لہجے میں مودبانہ پن خود بخود شامل ہو گیا تھا۔
 ”کوئی لمبا مسئلہ ہے کیا؟“ اس نے فکر مندی سے آسمان کے تیور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 آسمان کا لے کا لے بادلوں سے بھر گیا تھا۔

”جی صاحب! لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے.....“ محمد حسین بے بسی سے بولا تھا۔
 ”ٹھیک ہے..... پھر میں بیبیوں کو حویلی چھوڑ آتا ہوں۔ تم اصغر کو ساتھ لے کر کوئی میکینک ڈھونڈ کر لے آؤ۔“ اس نے آگے بڑھ کر جیب کا دروازہ کھولا۔
 ”کیا ہوا ہے دلاور بھائی؟“ بلیک گاؤن اور اسکارف میں خود کو اچھی طرح چھپائے مومنہ بڑا اعتماد لہجے میں بولی تھی۔ دلاور کے آزادانہ حویلی میں آنے جانے کی وجہ سے وہ لوگ آرام سے اس سے بات کر لیتی تھیں، ورنہ حویلی میں پردے کا رواج خاصا سخت تھا۔
 ”مومنہ بی بی! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو پلینز میری گاڑی میں آ جائیں۔ یہ جیب تو اب چلنے سے قاصر ہے.....“

”اور اگر ہم نہ آئیں تو.....؟“ مومنہ کے شوخ لہجے پر ساتھ بیٹھی عروہ کے ہاتھ ہر پھول گئے تھے۔ اس نے کہنی مار کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا، جسے مومنہ نے صاف نظر انداز کر دیا۔

”اگر آپ نہ آئیں تو بی بی ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم تو شاہ جی اور حویلی کے ملازم ہیں“ صرف عرض ہی کر سکتے ہیں..... حکم دینے سے تو رہے۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ موسم خاصا خراب ہے اور یہاں سے حویلی کا راستہ ابھی بھی پندرہ بیس منٹ کا تو ہو گا۔“ کھنی مونچھوں کے نیچے اس کے لب مسکرائے تھے۔

مومنہ نے اپنے سامنے کھڑے چھ فٹ ددا نچ کے بندے کو غور سے دیکھا، جو اچھی رعب دار شخصیت کا حامل تھا اور اس کی آن بان رکھ رکھاؤ اور پہننے اوڑھنے کا انداز خاصا منفرد تھا، وہ حد درجہ سلجھی طبیعت کا مالک تھا اور شاہ جی اس کی دآشنمندی اور معاملہ فہم طبیعت کی اکثر تعریف کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی

نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف تین یا چار سال کا تھا جب اسے شاہ جی کہیں سے لے کر آئے تھے اور تب سے وہ حویلی میں تھا اور شاہ جی کی خصوصی توجہ کی وجہ سے اس کا شمار بھی حویلی کے خاص الحاح کرم فرماؤں میں ہوتا تھا۔

”ایسے موسم میں کس کافر کا دل حویلی میں جانے کو کرے گا؟ جس کی بلند و بالا دیواروں میں سے ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا ہے۔“ مومنہ نے جیب سے نکلتے ہی لمبی سانس لی اور حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ لوگ حویلی کے پیچھے پائیں باغ میں چلی جایا کریں، وہاں بھی تو خاصا سبزہ ہے۔“ دلاور نے دوستانہ لہجے میں مشورہ دیا۔

”نہ بابائے وہاں موجود پرانے کنویں سے ہمیں تو سخت خوف آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آمنہ پھوپھو کی روح وہیں کہیں بھٹکتی ہو۔“ مومنہ کے منہ سے بے ارادہ ہی یہ جملہ نکلا تھا۔ عروہ نے اپنی بہن کو غصے سے گھورا اور اس کا بازو سختی سے پکڑ کر سامنے کھڑی سفید کار کی طرف قدم بڑھائے۔

”آپ کی یہ زبان کسی دن ہمیں مروائے گی۔ اس کو کنٹرول میں رکھا کریں۔ ورنہ آپ کو پتا ہے ناں شاہ جی کو آؤٹ آف کنٹرول چیزوں کو درست کرنا بہت عمدہ طریقے سے آتا ہے۔“ عروہ کے سخت اور نارمل لہجے پر مومنہ نے بے اختیار اپنے لب بھینچے تھے اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دلاور نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔ اسے مومنہ کے انداز سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس میں ابھی تک بچپنا اور شوخی تھی، جو اس حویلی کی لڑکیوں میں ناپید تھی۔ دلاور نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ بیک مرر سے اس نے دونوں بہنوں کی نقاب میں چھپی دلکش اور سحر انگیز آنکھوں سے بمشکل نظر ہٹائی تھی اور خود کو اس بددیانتی پر دل ہی دل میں خوب کوسا تھا۔ وہ حویلی کی خواتین کا دل سے احترام کرتا تھا اور اس کی شرافت، اور اپنے کام سے کام رکھنے والی عادت کی وجہ سے شاہ جی کو اس پر اندھا اعتماد تھا۔

”دلاور بھائی! اس باغ کے آم ہی کھلا دیں۔“ مومنہ کی زبان پھر پھسل گئی جب کہ عروہ نے بے بسی سے اپنی اس غڑبہن کو دیکھا۔

”بی بی ضرور کھلا دیتا اگر آموں کا سیزن ہوتا۔ آج کل آموں کا سیزن نہیں۔“ دلاور نے سنجیدگی سے جواب دیا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہاں یہاں کچھ امرود کے درخت ہیں، اگر

آپ کہیں تو.....“

”واقعی؟“ وہ بچوں کی طرح خوش ہوئی۔

”کوئی ضرورت نہیں شاہ کو پتا چل گیا تو جان نکال دیں گے۔“ عروہ نے ڈرایا۔

”شاہ جی اور حیدر آج گوشت کھائے ہوئے ہیں، کل آئیں گے۔“ دلاور نے اطلاع دی۔

مومنہ تو اس اطلاع پر بچوں کی طرح نہال ہو گئی تھی اور پھر وہ خوب صورت شام ان کی زندگی پر امنٹ نقوش چھوڑ گئی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی میں سبزہ آنکھوں کو تراوٹ بخش رہا تھا۔ دلاور نے کافی سارے امرود توڑ کر لاد دیئے تھے۔ پاس ہی پانی کا ایک چھوٹا سا نالا بہہ رہا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پانی سے امرود دھوئے ہوئے عروہ کا پاؤں پھسلا اور وہ پانی میں گرتے گرتے پٹی۔ دلاور کے مضبوط بازو نے اسے فوراً سنبھال لیا تھا۔ اس کا نقاب گر گیا تھا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے پہلے دلاور اور پھر خالی سڑک کو دیکھا تھا جب کہ مومنہ کچھ فاصلے پر امرود کے درخت پر بیٹھی سفید تلی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

اسی دن تیرہ و تار خواہش کی سنگلاخ راہوں پر کئی شگوفے کھل اٹھے تھے اور دلاور کے دل کی نچرز میں پر ابر نیساں کا بدن اوڑھے گلابی موسم چھا گیا تھا اور دونوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ لال حویلی کو جانے والی سنسان سڑک پر ہونے والے حادثے نے دونوں کی آنکھوں میں کئی خواب جگا دیئے۔ شاہ جی کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ دلاور کے شہر کے چکر بڑھ گئے تھے۔ اس نے عروہ کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے اقرار کی لود دیکھ لی تھی۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ ہل میں کر دیا کرتے تھے ہم
عمر بھر کی چاہتیں ہر اک ہرجائی کے نام
وہ بھی کیا موسم تھے جن کی ککھوں کے ذائقے
لکھ دیا کرتے تھے خال و خد کی رعنائی کے نام
وہ بھی کیا شامیں تھیں جن کی شہرتیں منسوب تھیں
بے سبب کھلتے ہوئے بادلوں کی رسوائی کے نام
وہ بھی کیا محسوس تھیں جن کی مسکراہٹ کافسوں
وقف تھا اہل وفا کی بزم آرائی کے نام

معظم علی بڑے جذب کے ساتھ کسی معروف چینل کو دیئے جانے والے انٹرویو میں یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔ ٹی وی کا کمپیئر ان کے پورے دن کی روداد بتا رہا تھا اور اب مبارک پور میں ان کی حویلی کے اندر بنی لائبریری میں اردو ادب کی کتابیں دیکھ کر وہ خاصی حیرت کا اظہار کر رہا تھا اور کمپیئر کی خصوصی فرمائش پر معظم علی نے یہ چند اشعار سنائے تھے۔ وہ اب کمپیئر کے کسی سوال کے جواب میں کہہ رہے تھے۔

”علاقائی تعصب‘ لسانی جھگڑے اور ذات پات کے محضے ہمارے پاؤں کی زنجیر بنے ہوئے ہیں اور ہمیں اپنے ملک کی ترقی کرنے کے لیے ان زنجیروں کو کاٹنا ہوگا۔ اس سلسلے میں میڈیا اہم کردار ادا کر سکتا ہے اور ہم آزادی تحریر و تقریر کے قائل ہیں۔“

”واٹ آریش.....“ سروہی نے ہاتھ میں پکڑا ریسیٹ کنٹرول زور سے دیوار پر دے مارا تھا۔ دوسرے صوفے پر بیٹھی نور العباح نے تاسف بھری نظروں سے اپنی بہن کو دیکھا۔

”پاگل ہو گئی ہیں کیا آپ؟“

”جھوٹ بول رہا ہے یہ گھنیا انسان!“ وہ حد درجہ تحفہ سے بولی تھی۔

”سب کو پتا ہے آپ کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہیں.....؟“ نور العباح نے اسے کول ڈاؤن کرنا چاہا۔

”سب کو نہیں پتا ہے..... یہ گھنیا انسان کتنا بڑا ڈرامے باز ہے، مکار ہے، بھیڑیا ہے، اس کے اندر سچ سننے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ ہر آئینہ دکھانے والے کا دشمن ہے۔ میرا بس چلے تو میں اس کو گولی مار دوں۔“ وہ مجید صاحب کی وفات کے بعد سے سخت ذہنی اذیت کا شکار تھی۔ اس لیے آج ٹی وی سکرین پر معظم کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے گھر میں ہی قید تھی۔ لکھنا لکھانا، آفس جانا، سب چیزوں سے مکمل بائیکاٹ چل رہا تھا۔ اسے مجید صاحب کی وفات سے شدید ہشاک پہنچا تھا اور اس کے بابا اور بہن نور نے اسے جذباتی طور پر سہارا دینے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ اپنا سیل فون اینڈ ہی نہیں کر رہی تھی۔ ایک دن عمیر صاحب بھی اس سے ملنے آئے تھے، لیکن وہ کمرے سے ہی باہر نہیں نکلی تھی۔ اسے ان سے حد درجہ شرمندگی تھی۔ وہ اس حادثے کا ذمے دار خود کو قرار دے رہی تھی۔ اس نے ٹی وی آف کر دیا تھا اور اب بازو آنکھوں پر رکھ کے خاموشی سے لیٹ گئی تھی۔ ایک محسوس کیا جانے والا اضطراب اس کے پورے وجود سے محسوس ہو رہا تھا۔ نور العباح نے تاسف بھری نظروں سے

اسے دیکھا اور دانستہ خاموش رہی۔

آج کافی دنوں کے بعد وہ گھر سے نکلی تھی۔ سب سے پہلے مجید صاحب کے گھر افسوس کے لیے پہنچی۔ گھر میں کسمپرسی کی حالت اور ان کی جوان بیٹیوں کو دیکھ کر اس کا دل کرب کی شدت سے پھٹنے لگا تھا۔ وہ بوجھل دل اور بڑھال قدموں کے ساتھ مشعل کے آفس میں پہنچی تو ضمیر صاحب اسے دیکھ کر کھل اٹھے۔

”چشم ماروشن! دل ماشا د آج تو لگتا ہے سورج مغرب سے طلوع ہوا ہے جو عزت مآب محترمہ سروہی جلال الدین نے ہمارے آفس میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سبحان تم پروف ریڈنگ چھوڑو اور سامنے ریسٹورنٹ سے مٹھائی لے کر آؤ۔ میں اس خوشی میں سب کا منہ میٹھا کروانا چاہتا ہوں۔“ ضمیر صاحب کو اسے دیکھ کر حقیقی خوشی ہو رہی تھی جبکہ ایک پھکی سی مسکراہٹ سروہی کے زرد چہرے پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑا مسودہ ٹیبل پر رکھ کر دانستہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

”بھئی سروہی مشعل کا تازہ شمارہ مارکیٹ میں آیا اور یقیناً مانو مزہ نہیں آیا۔“ سروہی نے قابل فہم نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ ان کی شوخی کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

”ویسے سچ بتاؤں اب تو ہر مہینے کوئی ہنگامہ دیکھنے کی عادت ہی ہو گئی تھی۔ اس دفعہ نہ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے نہ کسی کالم پر دھمکی آمیز فون آئے اور نہ ہی کسی نے دفتر میں انقلابی تقریریں کیں..... بھئی مزہ نہیں آیا.....“ ضمیر صاحب اب اپنا چشمہ ہاتھ میں پکڑے پھونکیں مار کر صاف کر رہے تھے۔

”اب آپ کو ایسے فون کبھی نہیں آئیں گے۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”کیوں.....؟“ اب آپ مشعل میں ”کوئنگ ریسپیو“ والا کالم لکھیں گی کیا؟“ ضمیر صاحب نے طنز کیا۔

”میں اب لکھوں گی ہی نہیں یہ میرا استعفیٰ ہے۔“ اس نے اپنے ہمیں دھماکا ہی تو کیا تھا اور اپنے ہینڈ بیگ میں سے پہلے سے تحریر شدہ استعفیٰ نکال کر ان کی میز پر رکھا جسے ضمیر صاحب نے دیکھے بغیر آرام سے اٹھایا اور گولہ سا بنا کر پاس رکھی ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور بہت اطمینان سے بولے۔

”چائے کے ساتھ فیض کے گرما گرم سموے منگواؤں یا کچھ اور کھاؤ گی۔“

”سر میں مذاق نہیں کر رہی میں بہت سنجیدہ ہوں۔ مجھے اب کچھ نہیں لکھنا۔“ وہ قدرے اونچی آواز میں جھنجھلا کر بولی تھی۔

”کیوں نہیں لکھنا؟“ انہوں نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”میں اپنی وجہ سے کسی اور کا نقصان نہیں کرنا چاہتی۔ یہ قوم شہر کے چوراہے پر آئینہ لے کر جانے والوں پر پتھر برسانے کی عادی ہے۔ یہاں سچائی کا ساتھ دینے والوں کو گولی کی آواز کے ساتھ چپ کر دیا جاتا ہے اور.....“

”اور یہ کہ تم ڈر گئیں..... تم یعنی سروہی جلال الدین ڈر گئیں..... بس اتنا سا حوصلہ تھا تمہارا لڑکی؟“ ضمیر صاحب نے تیزی سے بات کاٹی۔ ان کا استہزاء ایسے لہجہ اس کو بری طرح مجروح کر گیا تھا۔

”سر خدا کی قسم مجھے کسی کا ڈر نہیں میں خدا کی ذات کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں اس باپ کی بیٹی ہوں جس نے سچ لکھنے اور بولنے کی پاداش میں نوکری ختم کروالی اور اپنی شریک حیات کو کھو دیا.....“ غصے سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”پھر.....؟“ ضمیر صاحب نے طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

”میری وجہ سے کسی دوسرے کی ذات کو تکلیف پہنچے یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے مجید صاحب کی بیوہ کی سسکیاں نہیں بھولتیں۔ مجھے ان کی بیٹیوں کے آنسوؤں نے مظلوم کر دیا ہے۔ ان کے گھر کے درود یوار سے لپٹا سوگ میرے دماغ پر چھا گیا ہے.....“ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ ڈھانپ کر سسک اٹھی تھی۔ شیخ ضمیر الدین نے کافی دیر اسے رونے دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے دل کا بوجھ آج ہلکا کر لے ورنہ اس کی ذہنی حالت ان کے بہترین دوست کو بری طرح پریشان کر رہی تھی۔ دس منٹ کے بعد وہ اٹھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر انتہائی شفقتانہ انداز سے بولے۔

”بیٹا! سب سے پہلے تو اپنے ذہن سے یہ بات نکال دو کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ مجید صاحب کی موت اوپر والے نے ایسے ہی لکھی تھی۔ اس میں تمہارا میرا کیا کسی اور کا کوئی قصور نہیں۔ اس لیے یہ سوچ سوچ کر اپنے آپ کو پریشان مت کرو اور مجھے تمہاری تحریر نہیں بلکہ طرز تحریر پر اعتراض تھا۔ تم سچ ضرور لکھو لیکن اس طرح سے کہ کچھ لکھا بھی نہیں اور بہت کچھ کہہ بھی گئے۔ اگر سفاک انداز سے لکھو گی تو رد عمل بھی ایسا ہی سامنے آئے گا اور جان بوجھ کر

اپنی ذات کو خطرے میں ڈالنا دانش مندی نہیں۔ اس مہینے عالیہ نے بہت زبردست فچر لکھا ہے۔ پڑھو اور دیکھو اس نے کتنی صفائی سے اپنا دامن بھی بچایا ہے اور سب کچھ کہہ بھی ڈالا۔ میری بچی زمانے کی مصلحتوں کو سمجھو اور ہم بڑھے لوگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھاؤ۔ نخل مزاجی کو کبھی بھی ہاتھ سے جانے مت دو۔“ ضمیر صاحب اب بہت نرم اور مہربان لہجے میں اسے سمجھا رہے تھے جبکہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی باتوں پر کان دھرنے پر مجبور ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ دو گھنٹے بعد جب وہ اٹھی تو نہ صرف اس کا دماغ ریلیکس تھا بلکہ وہ اپنے اندر کچھ کرنے کے جذبے کو دوبارہ سر اٹھاتا ہوا محسوس کر رہی تھی اور ضمیر صاحب نے اسے یہ بتا کر کہ مجید صاحب کی بیٹی کو انہوں نے نہ صرف جاب پر رکھ لیا ہے بلکہ ان کی بیوہ کی مالی امداد کر کے ان کی فکر کو خاصی حد تک کم کر دیا تھا۔ یہ سب جان کر وہ حقیقی معنوں میں ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔

* * *

”اے رجو! اس نوج رسیلی کو دیکھ یہ کیا پوری حویلی میں مرے مرے انداز سے پھر رہی ہے۔ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آرہے ہیں میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ لڑکی سستی اور کاہلی کا پہاڑ بنتی جا رہی ہے۔ کل بھی نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ کھا لیا تھا۔ منہ کھول کھول کے ابکائیاں کرتی پھر رہی تھی۔“ بے جی نے برآمدے میں گندم صاف کرتی رجو بیگم کو ٹوکا اور سامنے پیری کے درخت کے نیچے چادر بچھائے سستی سے لیٹی رسیلی کی طرف اشارہ کیا۔ عروہ کی شادی کے دن قریب آنے کی وجہ سے سبھی ملازم مصروف تھے۔

”میں کیا کروں بے جی! اس لڑکی نے تو مت مار دی ہے میری۔ کچھ دنوں سے ایسے ہی ڈھیلی ڈھیلی سی ہے۔ کھانے پینے میں احتیاط نہیں کرتی اور معدہ بھی خراب کر لیا ہے۔ کچھ بھی کھایا پیا ہضم نہیں ہوتا۔ جو کھاتی ہے، تھوڑی دیر بعد باہر نکال بھیجتی ہے۔ کل غلام محمد کو کھا تھا کہ حکیم سے چورن لا کر دے وہ بھی بھول آیا۔“ رجو بیگم نے بے پروائی سے جواب دیا اور پھر غصے سے رسیلی کو پکارا۔

”آتی ہوں اماں.....“ وہ بمشکل کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھی۔ بے زاری اور سستی اس کے انگ انگ سے عیاں ہو رہی تھی۔ وہ ڈوٹی ہوئی برآمدے تک پہنچی تھی۔ ایک تو حیدر سائیں بھی پچھلے ایک ہفتے سے شہر گئے ہوئے تھے اور چاہتے ہوئے بھی وہ ان سے ملاقات نہیں کر پائی

تھی۔ گھر میں ہونے والی شادی کی تیاریوں نے انہیں خاصا مصروف کر رکھا تھا اور ان کی یہ مصروفیت رسیلی کی جان نکالے دے رہی تھی۔ دل بے قراری کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا اور اس سنگر کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔

”کیا ہے اماں! گندم صاف ہو تو گئی ہے اور پھر سیکنہ خالدہ اور گوگی بھی تو ساتھ کر داری ہیں۔“ رسیلی کی بے زار آواز پر بے جی نے بہت غور سے اس کا جائزہ لیا۔

”کیوں تمہارے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں یا تم کہیں کی مہارانی ہو جو ہڈ حراموں کی طرح لپٹی ہوئی ہو..... وہ تو بے جی اور بڑی بی بی تمہیں کچھ کہتیں نہیں ہیں، ورنہ اگر مدیحہ بی بی ہوتیں تو تمہاری طبیعت صاف کر دیتیں۔“ رجو بیگم نے کھا جانے والی نظروں سے اپنی اکلوتی دختر نیک اختر کو دیکھا جس کا چہرہ آج کل نہ جانے کیوں مرجھایا ہوا سا رہتا تھا۔ گلابی رنگت میں زردی سی گھلنے لگی تھی۔

”اے رجو بیگم تم تو چپ کر دو تم مجھے بتاؤ رسیلی کیا ہوا ہے تمہیں؟“ بے جی بے ساختہ بول اٹھی تھیں۔

”کچھ نہیں بے جی! بس جی اچھا نہیں ہے۔ اٹھتے بیٹھتے چکر آتے ہیں کچھ کھالوں تو دل خراب ہونے لگتا ہے۔“ رسیلی نے بے پروا مگر مودبانہ انداز سے کہا۔

”کب سے ایسا ہے؟“ بے چینی بے جی کے لہجے سے عیاں تھی۔ گندم صاف کرتی سیکنہ اور رجو بیگم تھیں۔

”پچھلے آٹھ دس دن سے میں نے اماں سے کہا بھی تھا کہ حکیم صاحب سے دوا لا دے مگر کسی کو میری پروا ہی نہیں ہے۔“ اس نے بچکانہ انداز میں شکایت لگائی جبکہ برآمدے میں موجود تین خواتین ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔ ایک عجیب سے احساس نے بے جی کے دل و دماغ کا احاطہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکنا چاہا مگر دوڑ کر غسل خانے کی طرف جاتی رسیلی نے انہیں اس خیال کو نکالنے کا موقع نہیں دیا۔ غسل خانے کے اندر اٹلیاں کرتی رسیلی نے ان کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ انہوں نے دہل کر غسل خانے کی طرف دیکھا اور پھر ہکا بکا سی رجو اور سیکنہ کو دیکھ کر خود بھی نظریں چرا گئیں۔

”سیکنہ جاؤ اور فضل دین کی گھر والی کو بلا کر لاؤ۔“ بے جی کو اپنے اعصاب جھنجھاتے محسوس ہوئے تھے۔

”کیا ہوا ہے بے جی؟“ سراپنگی رجو کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ گاؤں کی سب سے سیانی ”دائی“ کو خصوصی طور پر بلانے کی وجہ سے گھبرا گئی تھی۔

”دعا کرو کہ خیر ہی ہو۔“ بے جی کو اپنا سر کسی پھوڑے کے مانند دکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے فوراً اندر سے گلغفہ کو بھی بلا لیا تھا۔ گوگی نے انتہائی حیرت سے یہ منظر دیکھا اور پھر بے پروائی سے سر جھٹک کر حیدر سائیں کا کمر صاف کرنے چل دی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو چھوٹے سائیں نے بطور خاص اسے بلا کر ہدایت کی تھی اور وہ اس خصوصی فرمائش پر مکمل انہی تھی۔

فضل دین کی گھر والی لال حویلی سے آنے والے اس خصوصی بلاوے پر ہانپتی کانپتی وہاں پہنچی اور بے جی کے دھیمے لہجے پر دیئے گئے حکم پر ہکا بکا رہ گئی۔ وہ ششدر سی سامنے چارپائی پر بڑھ چالی سی رسیلی کا نظروں ہی نظروں میں ایکسرے کر رہی تھی اور پھر بے جی کی ہدایت پر وہ رسیلی کو اندر کمرے میں لے گئی تھی۔ گلغفہ کے چہرے پر خود ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ بے یقینی سے بند دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔

”بے جی یہ کیا مذاق ہے؟“ انہیں خود بھی اپنے دماغ میں دھماکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

”اے بی بی مجھے کیا ضرورت پڑی ہے مذاق کرنے کی؟ اور مجھے کیا یہ زیب دیتا ہے۔“ بے جی تو برا ہی مان گئی تھیں۔ رجو فحش چہرے کے ساتھ بالکل گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی تھی۔

”اماں میرا مطلب یہ تھوڑی تھا.....“ گلغفہ بوکھلا کر صفائی دینے لگیں، مگر اس سے پہلے ہی گاؤں کی سیانی نے آکر دھماکا کر دیا تھا۔

”بھئی خیر سے تیسرا مہینہ چل رہا ہے۔ غلام محمد نے کب کی اپنی چھو کری کی شادی؟ بالا بلا ہی سارے کام کر لیے اور کسی کو بلایا تک نہیں۔“ دائی نے باہر نکلتے ہی شکوہ کیا۔ بے جی اور گلغفہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، جبکہ رجو نے بے ساختہ دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”گلتا ہے بڑی بی بی لال حویلی میں رہنے کی وجہ سے رجو کا دماغ بھی آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ یہ بھی بندے کو بندہ نہیں سمجھتی۔“ دائی خاصی منہ پھٹ تھی۔

”ہوں!“ سب سے پہلے بے جی نے ہی خود کو سنبھالا۔

”بس شاہ جی نے ہی کہا تھا کہ زیادہ بندے اکٹھے کرنے کی لود نہیں، شہر والے بنگلے کے

چکیدار کے بیٹے سے نکاح پڑھوا دیا، اب تم جاؤ اور زیادہ اعلان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواجواہ لوگوں کی نظر لگ جاتی ہے اور ہاں جاتے ہوئے اندر سے ایک گندم کی بوری اٹھوا لیتا۔“ بے جی کے سپاٹ انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ بھی رکی نہیں اور کچھ گندم کی بوری کے اعلان نے اس کے اندر طاقت بھر دی تھی۔ تبھی وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتی فوراً دلان پار کر گئی۔ رسیلی نے خوف زدہ نظروں سے تینوں خواتین کے چہروں کو دیکھا۔ سب سے پہلے رجو کو ہی ہوش آیا۔ وہ چیل کی طرح سامنے کھڑی رسیلی پر جھپٹی تھی۔

”بیڑہ غرق ہو تیرا مردودنی! یہ کون سا چند (چاند) چڑھایا ہے تو نے“ سارا پنڈتھو تھو کرے گا۔ کم بخت کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے تو نے۔“ رجو اسے بے دردی سے مار رہی تھی جبکہ بے جی اور گلغفہ بے یقینی سے اس الہڑی لڑکی کو پٹتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ رجو نے ایک اور طمانچہ کھینچ کر اسے مارا تھا۔

”اللہ معاف کرے ایسی دیدہ ہوائی چھوری تیرے لمبھن پہلے پتا چل جاتے تو نا نکلیں توڑ کر کمرے میں پھینک دیتی۔ خدا کی مار ہو تجھ پر حرام خور۔ بیڑہ غرق ہو جائے تیرا۔ دیکھنا شیرابا پ تیری سنگی کیسے مردوڑتا ہے۔ وہ تو تیرے حلق سے بھی نکال لے گا، بتا کس کے گناہ کا یہ پھل ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے مار رہی تھی۔ کمرے میں اندر آتے حیدر نے سخت حیرانی اور پریشانی سے یہ منظر دیکھا تھا۔ اس کے قدم زمین پر ہی جم گئے تھے۔

”بتا منھوس کس یار کے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔“ رجو کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ غصہ، جھنجھلاہٹ، بے بسی اور اشتعال نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس نے رسیلی کو اب بالوں سے پکڑ کر کھینٹا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بے حال ہوئی تھی، مگر اس نے مزاحمت نہیں کی کہ وہ اب اپنی چیل اتار کر اس کے سر اور کمر پر بے دردی سے مار رہی تھی۔

”بس کر کم بخت! اب کیا جان سے مارے گی اسے.....“ بے جی نے غصے سے کہا۔

”میں اسے نہیں چھوڑوں گی، بے جی، جب تک یہ اس مردود کا نام نہیں بتائے گی۔“ رجو نے مدد سے کہا۔

”اماں!“ رسیلی نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولنا چاہا، مگر اس سے پہلے حیدر کمرے میں آگیا۔ اسے نہ جانے کیوں لگا تھا کہ رسیلی کے منہ سے نکلنے والا اگلا لفظ اس کا نام ہوگا۔

”بھئی کیا تماشا لگا رکھا ہے یہاں؟ کیا اس حویلی میں کوئی سکون سے زندگی نہیں گزار

سکتا ہر روز ایک نیا ڈرامہ ہوتا ہے۔“ حیدر نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ بے جی اور شکستہ کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا اور رجو خود بھی ہکلا گئی تھی۔ چھوٹے سائیں کا غصہ تو سارے گاؤں میں مشہور تھا۔ اسے دیکھ کر رسیلی کے چہرے کی رنگت تیزی سے بحال ہوئی تھی۔ اسے نہ جانے کیوں لگا تھا کہ اس کا میچا آ گیا ہے۔ وہ اب روتے ہوئے اپنی چوٹوں کو سہلارہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ تنہائی میں چھوٹے سائیں خود ان پر مرہم لگائیں گے۔

”کچھ نہیں ہوا وہ آج عروہ کے کمرے سے اس کے سونے کے بندے چوری ہو گئے ہیں اور اس کے کمرے کی صفائی اس کم بخت نے کی ہے اسی کی تفتیش کر رہے ہیں۔“ بے جی نے دانستہ بات چمپائی۔ وہ اپنے تئیں اس مسئلے کو ابھی خود حل کرنا چاہتی تھیں اور حیدر کو بتانے کا مقصد مدیحہ بیگم تک یہ بات پہنچانا تھا اور وہ بات کی تحقیق کیے بغیر رائی سے پہاڑ بنانے کا ہنر اچھی طرح جانتی تھیں۔

”اوہ!“ حیدر کے منہ سے بے اختیار اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا تھا۔ تبھی وہ سنبھل کر گویا ہوا۔

”تو اس میں اتنا ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ لوگوں نے حویلی کو تھانہ بنا کر یہ تفتیش کرنے کا نیا طریقہ نکالا ہے۔ بندے ہی ہیں اور آجائیں گے۔ جاؤ لڑکی اندر جا کر کوئی روٹی ٹکڑا بندوبست کر دو میرے شہر سے دوست یار آئے ہیں۔“ حیدر کے دماغ نے تیزی سے کام کیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اہم کردار کو منظر سے غائب کیا۔ اس کے حکم پر بے جی اور شکستہ نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ مگر اس موقع پر وہ کچھ بولنے سے قاصر تھیں جبکہ حیدر کا دماغ اب مزید تانے بانے بن رہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک نئی آفت سر پر آن گری تھی، لیکن وہ بھی اپنے میدان کا شہسوار تھا۔

”اور تم منہ اٹھا کر میری طرف کیا دیکھ رہی ہو جا کر مہمان خانے میں دیکھو۔ غسل خانے کس اندھے نے دھوئے ہیں۔ ٹانگوں پر مٹی جی ہوئی ہے۔ سارے کے سارے شاہ جی نے ہڈ حرام ملازم اکٹھے کر رکھے ہیں۔ میرا بس چلے تو سب کو سیدھا کر دوں۔“ اس نے دانستہ رجو کو بھی یہاں سے ہٹایا۔ بے جی نے بہت ناگواری سے اپنے اکلوتے پوتے کو دیکھا اور مصلحتاً خاموش رہیں۔ وہ کچھ دیر تو ادھر ادھر کھڑا ملازموں پر گر جتا رہتا رہا اور پھر مطلع صاف دیکھ کر کچن کی طرف قدم بڑھائے۔ خوش قسمتی سے اس وقت رسیلی اکیلی بیٹھی برتن دھورہی تھی۔ اسے

دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح لپکی۔ چہرے پر ابھی بھی آنسوؤں کے مٹے مٹے نشان تھے اور حالت خاصی خستہ اس کی ماں نے اسے کافی بے دردی سے مارا تھا۔

”چھوٹے سائیں!“ وہ اسے دیکھ کر سسکی اور میلے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔ حیدر نے کوفت بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

”چھوٹے سائیں! آپ مجھ سے شادی کر لیں، ورنہ اماں مجھے مار دے گی۔“ رسیلی کی فرمائش پر حیدر نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی خرابی دماغ کا یقین آ گیا ہو۔

”دیکھیں جی! اب تو ہمارے پیار کی نشانی بھی میرے پیٹ میں پل رہی ہے۔ آپ اب کھل کر سب کو بتا دیں! آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“ وہ لاڈ بھرے انداز سے اٹھلا کر بولی تھی۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ اپنی اوقات دیکھی ہے تم نے؟ دوبارہ ایسی بات کی تو منہ توڑ دوں گا اور گولی مار کر حویلی کے کنویں میں پھینکوا دوں گا اور کون سی نشانی؟ کیسی نشانی.....؟ مجھے کیا پتا کس کے کرتوتوں کا پھل تم میرے ذمے لگا رہی ہو۔“ حیدر کے تنفر بھرے لہجے پر رسیلی کو یوں لگا جیسے حویلی کی چھت اس کے سر پر آن گری ہو۔ وہ بے یقینی سے ہکا بکا حیدر کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کی رنگت ایک لمحے کو سپید ہو گئی تھی اور پورا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔

* * *

”لو یہ کس پاگل نے گاڑی اتنے غلط طریقے سے پارک کی ہے؟“ اپنی کار کے قریب بالکل غلط طریقے سے پارک کی ہوئی کار کو دیکھ کر نایاب نے جھنجھلاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی گاڑی کے مالک کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، مگر آس پاس کوئی بھی اتنی قیمتی کار کا مالک اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا، شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اسے ابھی گھر جا کر تیار بھی ہونا تھا اور رات نو بجے ضویا کے گھر اس کی برتھ ڈے کے سلسلے میں ڈنر تھا۔ جہاں سب فرینڈز ہی مدعو تھیں اور وہ ضویا کے گفت کے سلسلے میں ہی اس مشہور و معروف مال کے سامنے تھی۔ گفت خرید کر خوب صورت پیکنگ میں پیک کر دیا کہ وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی، مگر یہ مصیبت اس کے گلے پڑ گئی۔ وہ کسی طور بھی اپنی گاڑی بیک نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر سامنے دیکھا پلازہ میں خاصا رش تھا۔ اوپر سے

گاڑیوں کے شور نے اعصاب کو خاصا بھاری کر دیا تھا۔ اسے وہاں کھڑے ہوئے پندرہ منٹ ہونے کو تھے۔ کوفت اور غصے سے وہ بری طرح جھنجھلا رہی تھی اور سارا غصہ اس نے اس غریب غبارے بیچنے والے لڑکے پر نکالا تھا جس نے اس کے قریب آ کر زور سے باجا بجایا تھا۔ حالانکہ اس نے یہ دانستہ طور پر نہیں کیا تھا، لیکن نایاب کو نہ جانے کیوں لگا تھا کہ اس نے یہ بے ہودہ حرکت شعوری طور پر کی ہے۔

”خوب صورت لڑکیوں پر اتنا غصہ سوٹ نہیں کرتا، چہرے پر جھرمیاں پڑ جاتی ہیں۔“ وہ بڑے بڑے شاپر اٹھائے نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا۔ اس وقت گرے شرٹ اور بلیوٹراؤزر میں وہ خاصے گھریلو لیکن خوش گوار موڈ میں تھا۔ اسے دیکھتے ہی نایاب کو پچھلے دنوں کی اس کی بے رخی یاد آ گئی۔ جب وہ اس کی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ تبھی نایاب کے ماتھے کے بل گہرے ہو گئے اور وہ دانستہ فحقی بھرے انداز میں تھوڑا سا مڑ کر سامنے جیولری شاپ میں جی جیولری کو زبردستی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ اس کے اس انداز پر بلاول نے قہقہہ لگایا تھا۔

”بھئی نایاب، تمہیں کس نے بتایا ہے کہ تم یوں غصے میں بہت خوب صورت لگتی ہو۔“

”تم سے مطلب؟“ اس نے بھی بے رخی کے تمام ریکارڈ توڑے۔

”اب تو اصولاً سارے مطلب مجھ سے شروع ہو کر مجھ پر ہی ختم ہونے چاہئیں۔“ وہ آج نہ جانے کیوں شرارت کے موڈ میں تھا۔ نایاب کی ساری ناراضی اسے سمجھ آ گئی تھی۔

”ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ میری دنیا تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہو جائے۔“ نایاب کے ناراض لہجے پر بلاول کے چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ بکھری تھی۔

”اچھا..... وہ وقت کب آئے گا؟“ وہ فطری اشتیاق سے بولا تھا، لیکن نایاب کو معلوم تھا کہ اس کا یہ سراسر مصنوعی تیجس ہے۔

”کبھی بھی نہیں۔“ وہ ہنوز سابقہ لہجے میں گویا ہوئی۔

”اچھا.....“ وہ مایوس ہونے کی اداکاری کرتا ہوا تھوڑا سا پیچھے ہٹا اور شوخ لہجے میں بولا۔

”اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر تم یہاں کھڑی ہو کر میرا انتظار کیوں کر رہی ہو؟“

”تمہیں کس نے کہا؟“ وہ لڑا کا انداز میں کمر پر ہاتھ رکھ کر مڑی۔

”مجھے تو یہی لگا تھا۔“ بلاول نے کندھے اچکائے۔

”جی نہیں۔“ وہ لڑا کا انداز میں گویا ہوئی۔ ”میں تو اس منحوس گاڑی کے جاہل اور ال میٹر ڈ مالک کا انتظار کر رہی ہوں جس نے انتہائی فضول طریقے سے گاڑی پارک کر کے میری گاڑی کا راستہ بلاک کر رکھا ہے۔“

”اوہ آئی سی.....“ بلاول کی مسکراہٹ اسے کچھ مشکوک لگی۔

”پتا نہیں لوگوں کو تمیز کب آئے گی؟“ وہ جھنجھلا کر ایک دفعہ پھر گھڑی دیکھ رہی تھی۔

”بھئی بہت جلد آ جائے گی، تم ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے اسی گاڑی کا دروازہ کھول کر سامان اندر رکھ رہا تھا۔

”کیا.....؟“ نایاب کو جھٹکا سا لگا۔ ”یہ تمہاری گاڑی ہے؟“ غصے سے آگے اس کے منہ سے لفظ ہی نہیں نکلے۔

”جی جناب، اسی غلام کی ہے۔“ وہ مالکانہ استحقاق سے سامان رکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”تم کو شرم آتی چاہیے۔ میں اتنی دیر سے بکواس کر رہی ہوں اور تم نے بتایا تک نہیں کہ یہ دیوار چین کی طرح تم نے اپنی گاڑی اڑا رکھی ہے۔“ اس نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

”بھئی تم نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ آج نہ جانے کیوں اسے چڑا رہا تھا۔

”تم نے مجھے کیا اپنے مبارک پور کی حویلی کی کوئی ملازم سمجھ رکھا ہے یا کوئی ادنیٰ غلام یہ لاہور ہے۔ اپنے فیوڈل لارڈز والی عادات کو وہاں ہی چھوڑ آئیں۔“ وہ سچ سچ پڑ گئی تھی۔ اس بار بلاول مسکرایا تک نہیں۔ اس نے حیرت سے اپنے سامنے کھڑی نازک سی لڑکی کو دیکھا، جس کے چہرے پر کوفت اور بے زاری کا عنصر واضح تھا۔

”آئی ایم سوری آپ شاید میرے بارے میں غلط اندازہ لگا بیٹھی ہیں۔ میں انسانوں میں کسی بھی قسم کی معاشی تفریق کا قائل نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں یہاں لاہور میں رہنے کے بجائے اپنی حویلی میں بیٹھ کر لوگوں پر رعب جما کر اپنی جھوٹی انا کو تسکین پہنچا رہا ہوتا۔ اپنی ہاؤ غلط پارکنگ کرنے پر میں آپ سے ایکسکیوز کرتا ہوں کہ اس کی وجہ سے آپ کو اتنی کوفت اٹھانا پڑی کہ آپ دوستوں اور اجنبیوں کے درمیان فرق کو ہی بھلا بیٹھیں۔“ بلاول کے سنجیدہ لہجے پر اسے ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تبھی اب کہ وہ نرم لہجے میں گلہ کر رہی تھی۔

”اور خود جو آپ اپنے دوستوں کے ساتھ کرتے ہیں وہ آپ کو یاد ہے۔ میں نے کتنی دفعہ آپ کو کالز کیں، میرا پریویس کارزلٹ آیا تھا اور پھر میرا برتھ ڈے بھی تھا۔ میں نے ہر دفعہ

انوائیٹ کرنے کے لیے فون کیا، مگر آپ کی طرف سے نولفٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔“

”آئی ایم سوری“ میں نے دانستہ طور پر ایسا نہیں کیا۔ ایک خاندانی تنازع کی وجہ سے میرے بڑے بھائی زخمی ہو گئے تھے اور پھر کچھ ایسے معاملات تھے کہ میں بری طرح الجھا ہوا تھا اور اپنی ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے میں اپنے دوستوں کو پریشان نہیں کرتا۔ تبھی میں منظر سے غائب تھا۔“ وہ ہنوز سنجیدگی سے وضاحت دے رہا تھا جبکہ نایاب کا موڈ خاصا بحال ہو چکا تھا۔

”اٹس اوکے“ ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے کم ٹیمپرامنٹ کی مالک ہوں گی۔“ وہ خود کو گلہ کرنے سے نہیں روک سکا تھا۔

”میں ایسی ہی ہوں۔“ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

”لیکن میں ایسا نہیں ہوں جیسا آپ نے میرے بارے میں سوچا۔“ اس کے ذہن سے ابھی تک اس کی بات نہیں نکلی تھی، تبھی وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔ نایاب نے معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو سنجیدگی کی گہری تہ کی وجہ سے بالکل اجنبی سا لگ رہا تھا اور نایاب کو اس لمحے وہ اپنی دسترس سے بہت دور محسوس ہوا تھا۔

”بھئی وہ تو میں نے غصے میں کہا تھا اور اگر آپ کو برا لگا تو میں حقیقت میں شرمندہ ہوں۔ بس غصے میں مجھے کچھ پتا نہیں چلتا، مباحی میری اس عادت کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں لیکن میں ان سے کہتی ہوں کہ میں صاف گو ہوں جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر۔ لیکن جہاں مجھے احساس ہو جائے میں غلط ہوں میں فوراً سوری کر لیتی ہوں۔“ وہ اب دوستانہ لہجے میں صفائی دے رہی تھی۔ اس کے اس انداز پر بلاول نے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کا گلا بڑی صفائی سے کھوٹا تھا۔

”لیکن میں کسی سے ناراض ہو جاؤں تو اتنی آسانی سے نہیں مانتا۔“ وہ گاڑی کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بڑی بے پروائی سے بولا تھا۔

”اچھا۔“ وہ تھوڑا سا مایوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اپنے سیل فون پر آنے والی ضویا کی کال کو تیزی سے اس نے کاٹا اور بے چینی سے گویا ہوئی۔ ”تو پھر آپ کیسے مانتے ہیں؟“ اس وقت اس کے لیے سب سے اہم بلاول کی ذات تھی۔

”ویسے تو پی سی میں کوئی اچھا سا ڈز ہو تو کیا ہی بات ہے ورنہ کے ایف سی یا میکڈونلڈ

سے بھی گزارہ ہو سکتا ہے۔“ بلاول کے شرارتی لہجے پر وہ ایک دم ہلکی پھلکی سی ہو گئی اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ورنہ وہ منانے وغیرہ کے چونچلوں میں کم ہی پڑتی تھی۔ اس نے کبھی کسی کو اتنی اہمیت دی ہی نہیں تھی۔

”بہت برے ہوتے میری تو جان ہی نکال دی تھی۔“ نایاب نے ہاتھ میں پکڑا ہینڈ بیگ بے تکلفی سے اس کے کندھے پر مارا تھا جو اب اس نے مصنوعی غصے سے گھورا۔

”سوچ لو! اگر یہ برا بندہ ساری زندگی کے لیے پلے پڑ گیا تو کیا ہو گا؟“ بلاول کے انداز میں بڑی بے ساختگی تھی۔

”کیا.....؟“ نایاب نے چونک کر سر اٹھایا جبکہ بلاول اپنے سیل فون پر آنے والی کال پر معزوف ہو گیا تھا جبکہ نایاب کو اپنے اندر ایک ہلچل سی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بری طرح الجھی تھی جبکہ بلاول کے چہرے پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی اور اسی لمحے اسے اپنے اندر ایک خواہش بے ساختہ سر اٹھاتی محسوس ہوئی تھی اور نایاب کو جانے کیوں لگا تھا کہ آنے والا وقت کچھ خاص اپنے دامن میں لیے اس کی طرف بھاگ رہا ہے۔

* * *

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

”ہم درخشندہ روایات کی حامل وہ قوم ہیں۔ جنہوں نے وفا کی تاریخ اپنے لبوں سے لکھی، قیصر و کسریٰ کی شوکت جن کے قدموں میں جھک گئی اندلس اور سندھ کی سرزمین نے جن کے قدم چومے نیل سے کاشغریک اور چین سے ہسپانیہ تک وہ ہر عزت کا مرکز رہے مگر افسوس کہ آج کا نوجوان تن آسان اور اپنے ماضی سے کٹا ہوا ہے۔ اس میں عرفان ہے نہ ایمان نہ عقاب کی روح ہے اور نہ زور حیدری، وہ دنیا کے تابع ہے۔ لالچ اور ہوس نے اس کے دل کو اپنا نگارخانہ بنا رکھا ہے۔“

”بہت زبردست مضمون لکھا ہے بچی نے.....“ جشٹن نعمان نے ناشتے کی ٹیبل پر بے اختیار سر ہلاتا تھا۔

”بھئی ڈاکٹر صاحبہ آج ٹائم نکال کر پڑھئے گا۔ قسم سے صبح صبح لطف آ گیا۔“ وہ ایسے ہی تھے ہر ایک کو کھلے دل سے سراہنے والے۔

بازہ سرگرمیوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ تھوڑا سا الجھ گیا تھا۔
 ”عائش تم ناشتہ ڈھنک سے نہیں کر رہے اور لچ بھی آج کل تم باقاعدگی سے نہیں کر رہے۔“
 حلقے دیکھے ہیں اپنی آنکھوں کے نیچے.....“ ممانے پیار بھری سرزنش کی تو وہ ذہنی الجھن کی وجہ سے مسکرا بھی نہ سکا۔

”بس ممانے آج کل کام کا لوڈ کچھ زیادہ ہے۔ اوپر سے بھی سختی ہے اور پھر سارا نزلہ ہم پر ہی تو گرتا ہے.....“ وہ زبردستی مسکرانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا جبکہ ذہن میں ڈیوہ دن اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ وہ اس نازک مگر بے وقوف سی لڑکی کے لیے حد درجہ پریشان ہو گیا تھا جو اسے خود بخود عزیز ہو گئی تھی۔ تبھی گھر سے نکلنے اور جیب میں بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلا کام اسے کال کرنے کا کیا تھا۔ وہ اس کا نمبر انٹینڈ کرتے ہی بے تکلفی سے بولی تھی۔

”خدا خیر کرے آج صبح صبح کالی وردی والوں نے کیسے یاد کر لیا۔ میں تو گلی کی کٹڑ پر بیٹھی کالی بلی کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کر رہی تھی کہ اس نے میرا راستہ نہیں کاٹا“ بس موٹی موٹی آنکھوں سے بیٹھی دیکھتی رہی لیکن کالی وردی والوں کا ذہن میں نہیں آیا ورنہ آیت الکرسی پڑھ لیتی.....“ عائش نے اس کے خوشگوار لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ نے ٹی وی کب جوآن کیا اور بتایا تک نہیں.....؟“
 ”بھئی مجھے پتا نہیں تھا۔ ورنہ تمام بڑے اخبارات میں چھپوا دیتی.....“ وہ ہلکلا کر ہنسی۔

”سروہی میں سنجیدہ ہوں.....“ عائش کے حد درجہ سنجیدہ لہجے پر وہ چونکی پھر کچھ سنبھل کر بولی۔ ”بس پچھلے ماہ مجھے صلاح الدین صاحب جو کہ بابا کے دوست ہیں انہوں نے آفر کی کہ وہ نیا چینل لانچ کر رہے ہیں اور مجھے کوئی پروگرام کرنا چاہیے اور آپ کو پتا ہے کہ مجھے منفرد کام کرنے کا کتنا شوق ہے بس میں نے ”ڈنکے کی چوٹ پر“ کے نام سے ایک پروگرام کا آئیڈیا دیا اور شوق ہی شوق میں پہلا پروگرام کیا جس کا زبردست رسپانس آیا اور پھر دوسرا بھی ہو گیا اور آج کل تیسرے پر کام کر رہی ہوں۔“

”سروہی اگر میں آپ سے ایک بات کہوں تو مانیں گی.....؟“ وہ خاصی دیر بعد بولا تھا۔

”مما دیکھ لیجئے گا کہ کہیں پاپا بریک فاسٹ کر کے ان محترمہ سے ملنے ہی نہ چل پڑیں۔“
 اور نج جوس ہنپی نایاب نے شرارت سے کہا جبکہ جشس نعمان نے ہاتھ میں پکڑا اخبار نیپل پر رکھ کر اپنی اس شرارتی سی بیٹی کو مصنوعی غصے سے گھورا وہ اور مسز نعمان دونوں ہی مطالعے کے شیدائی تھے جبکہ ان کے بچوں میں سے یہ عادت رملہ اور عائش میں تھی جبکہ نایاب تو ہر قسم کی کتابوں سے دور بھاگتی تھی۔

”اسی بچی نے پچھلے ہفتے بیورو کر لیں پر بھی بہت شاندار لکھا تھا۔ اس کا مطالعہ خاصا وسیع اور دلائل بڑے جاندار ہوتے ہیں۔“ جشس نعمان نے چائے کا سب لیتے ہوئے اپنی بیوی کو اطلاع دی۔

”پاپا آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ بچی ہے وہ کوئی پختہ عمر کی خاتون بھی تو ہو سکتی ہیں۔“
 عائش نے بھی خوشگوار لہجے میں گفتگو میں حصہ لیا۔ آج اتوار کی وجہ سے وہ سب لوگ ناشتے کی میز پر اکٹھے تھے۔

”بیٹا یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اس بچی نے نیا نیا اس نیوز پیپر میں کالم لکھنا شروع کیا ہے۔ پچھلے کالم میں اس کی تصویر اور مختصر سا تعارف بھی شائع ہوا تھا۔ اپنی نایاب کی ہم عمر ہوگی اور پھر جو آواز کے نام سے نیا ٹی وی چینل سٹارٹ ہوا ہے اس میں وہ کسی نہ کسی موضوع پر تحقیق کر کے ڈاکو مٹری فلم بناتی ہے۔ بہت میلہ لڑکی ہے۔ بہت آگے جائے گی۔ اگر اسی محنت سے کام کرتی رہی۔“ جشس نعمان کے لہجے میں حد درجہ ستائش دیکھ کر نایاب نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی کیا نام ہے اس کا؟ آپ کے منہ سے اتنی تعریفیں سن کر لگتا ہے محترمہ سے ملنا ہی پڑے گا۔“

”نام بھی خاصا منفرد ہے سروہی جلال الدین۔“
 ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے عائش کو پاپا کی اطلاع پر جھٹکا ہی تو لگا تھا۔

”بھئی یہ کیا نام ہوا..... سروہی.....؟“ نایاب نے منہ بنایا۔

سروہی کا مطلب ہے ”خبر کی کاٹ.....“ ممانے نایاب کی پلیٹ میں ٹوسٹ رکھتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا جبکہ عائش کو شدید حیرت ہوئی۔ ابھی پچھلے مہینے ہی تو اس سے آرٹس کونسل میں ملاقات ہوئی تھی اور پھر سیل فون پر بھی مختصر رابطہ رہتا تھا مگر اس نے اپنی

”جی..... کہیے!“ وہ متذبذب سے انداز میں گویا ہوئی۔

”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت۔“

”خیریت؟“ وہ تھوڑا سا ہنسی اور محتاط انداز میں بولی تھی وہ ایک دم الٹ ہو گئی۔

”یہ میں مل کر ہی بتاؤں گا۔“ عائش تیزی سے بولا تھا۔

”پھر بھی.....؟“ سروہی کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ وہ بے مبری سے اس کے بولے

کا انتظار کرنے لگی۔ آنکھیں سکر گئیں انداز سراپا سماعت تھا۔

”تم مجھے جگہ بتاؤ میں تمہیں وہاں سے پک کرتا ہوں اور راستے میں بات بھی ہو جائے

گی۔“ عائش نے تیزی سے اسے پروگرام بتایا اور جواباً اس کی بتائی ہوئی جگہ پر وہ اگلے پندرہ

منٹوں تک پہنچ کر نہ صرف اسے پک کر چکا تھا بلکہ اگلے دس منٹوں میں وہ ایک عام سے قریبی

ریسٹورنٹ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سروہی کی تمام تر حسیں اس کی طرف متوجہ تھیں۔ وہ

اسے عام دونوں سے بالکل ہٹ کر لگا تھا۔ مجید صاحب والے واقعے کے بعد دونوں میں خاصی

بے تکلفی ہو گئی تھی اور ٹیلی فون پر گفتگو بھی اکثر پیشتر ہوتی رہتی تھی۔

”آپ نے مجھ سے کیا بات کرنی تھی جس کے لیے صبح صبح ایمر جنسی میں مجھے یہاں

لے آئے بلکہ اس پورے ریسٹورنٹ میں ہم دو ہی پاگل ہیں باقی دنیا تو اس وقت اپنے اپنے

گھروں میں ناشتہ کر کے اپنے کاموں پر روانہ ہو رہی ہے۔“ سروہی اپنے لہجے کو دانستہ بے

پروا اور بے نیاز بنا کر بولی تھی۔

”کیوں تم نہیں جانتیں کیا؟“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”نہیں.....“ سروہی کا انداز صریحاً ٹالنے والا تھا حالانکہ اس کا دل چیخ چیخ کر اسے کچھ

انفارم کر رہا تھا۔ وہ براہ راست سروہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جانچتی ہوئی نظروں

سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”بھئی کیا مسئلہ ہے؟“ سروہی کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جگمگانے لگے۔

بھر میں اس نے کافی ”جان“ لیا تھا۔ وہ اس کے چہرے کے ہل بھر میں بدلنے والے تاثرات سے

محظوظ ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر گہری سی مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی اور اس نے اس لمحے صاف صاف

بات کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

”دیکھو سروہی میں سیدھا سادہ صاف گو اور دو ٹوک انداز میں بات کرنے والا بندہ

ہوں۔ میرا نام تو تمہیں پتا ہے۔ میں نے انگلینڈ سے آئی سی ایم اے کیا اور اس کے بعد اپنی

مرضی سے سول سروس میں آ گیا۔ میرے پاپا جسٹس اور ماما ڈاکٹر ہیں دونوں کی لو میرج تھی

اور ماشاء اللہ دونوں میں کمال کی انڈر اسٹینڈنگ ہے اور وہ خاصے لبرل مائنڈ کے ہیں۔ انہوں

نے اپنی مرضی کبھی بھی اپنے بچوں پر مسلط نہیں کی۔ ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ آج کل میں

اور تایاب یہاں جبکہ رملہ اور رمیض ابراؤ ہوتے ہیں میری گھر سب سے زیادہ میری ماما اور

میری سسر رملہ کے ساتھ دوستی ہے.....“

”لیکن.....“ سروہی نے تیزی سے بات کاٹی اور بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”آپ یہ

سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ اگلے دو منٹوں میں میں تمہیں پروپوز کرنے والا ہوں۔“ عائش کے

بڑے اعتماد انداز نے سروہی کو ہکا بکا دیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بڑی تیزی سے بدلا تھا۔

”مطلب کیا ہے آپ کا؟“ روانی سے بولتے ہوئے اس نے بے ساختہ اپنی زبان

دانتوں میں دبائی تھی۔ عائش کے چہرے پر لطف لینے والی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی۔

”مطلب تو یار صاف ظاہر ہے میں نے اردو میں بات کی ہے اور اگر کہو تو میں انگلش

اور پشتو میں بھی تمہیں پروپوز کر سکتا ہوں۔“ وہ ہلکے سے کندھے اچکا کر خوشگوار لہجے میں بولا

تھا۔

”اور اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ وہ جھلا کر بولی۔

”زبان بندی!“ وہ ہنسا۔

”کیا.....؟“ وہ سخت حیران ہوئی اسے حقیقت میں سمجھ نہیں آئی تھی۔

”بھئی سیدی سی بات ہے تمہیں اپنی زبان پر کنٹرول نہیں اور میں چاہتا ہوں کہ جب

میرے ماما اور پاپا تمہارے گھر آئیں تو تم پٹر پٹر بولنے کے بجائے خاموش رہو اور لڑکی کی

خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔“ وہ مزاحیہ انداز میں بولا تھا۔

”لیکن آپ کو یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میری طرف سے آپ کو مثبت جواب ملے

گا.....؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا ازلی بڑا اعتماد انداز لوٹ آیا تھا۔

”مجھے خوش فہمی نہیں بس خود پر اعتماد ہے اور میں تم پر زبردستی نہیں کر رہا۔ ظاہر ہے کہ ہر

فصل کو اپنی زندگی کے بارے میں بہتر سوچنے کا حق حاصل ہے۔“ وہ اب جانچتی ہوئی نظروں

سے اس کے پر اعتماد انداز کا جائزہ لے رہا تھا۔

”آپ نے کیا سوچ کر اتنا بڑا فیصلہ کیا؟“ وہ اپنے دونوں ہاتھ مغبوطی سے جکڑے مکمل سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عائش اس کے اس انداز پر خود بھی سنجیدہ ہوا۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ میں سیدھا سادہ اور صاف گو بندہ ہوں اور تمہارے معاملے میں مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی، مجھے زندگی گزارنے کے لیے جیسا لائف پارٹنر چاہیے وہ تمام خوبیاں تمہارے اندر موجود ہیں۔ باقی کچھ چیزوں کی زیادتی بھی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ میرا ساتھ ان تمام چیزوں کو کنٹرول کر لے گا۔“ وہ تھوڑے سے غیر سنجیدہ انداز میں بولا تھا۔ ایک خوشگوار مسکراہٹ دوبارہ اس کے چہرے پر ظہور گئی تھی۔

”آپ کیا جانتے ہیں، میرے بارے میں یا میری فیملی کے بارے میں؟“ سروہی کے لہجے میں سنجیدگی کا عنصر بڑھتا جا رہا تھا۔

”مجھے ضرورت نہیں.....!“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا۔ ”مجھے ان چیزوں سے فرق نہیں پڑتا۔ جتنے عرصے سے تمہارے ساتھ تعلق ہے، میں صرف تمہیں جانتا ہوں یا پھر ہسپتال میں تمہارے بابا اور تمہاری بہن سے سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔“

”آپ کو پتا ہے کہ میرا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے ہے اور جلال الدین جن کو لوگ میرے فادر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ وہ ایک مشہور و معروف اخبار میں الٹوٹی کیئر رپورٹر تھے اور مخالفین کی دشمنی کی وجہ سے انہیں اپنا کیریئر اپنی جاب ہر چیز سے ہاتھ دھونے پڑے اور اب وہ گمنا می کی زندگی گزار رہے ہیں۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ عائش نے تیزی سے بات کاٹی۔

”لیکن آپ یہ نہیں جانتے.....“ وہ تلخی سے بولی اور ایک لمحے کو رک کر کہ ”جلال الدین میری والدہ کے دوسرے شوہر ہیں اور دوسرے شوہر سے ان کی صرف ایک بیٹی نور العیاض ہے جبکہ میں اور میرا ایک بھائی اپنی والدہ کے پہلے شوہر سے ہیں اور میری والدہ کی ڈیڑھ بھئی ان کے پہلے شوہر اور ان کے خاندان کی وجہ سے ہوئی تھی اور وہ لوگ میرے بھائی کو چھین کر لے گئے ہیں، لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ہم دونوں جڑواں بہن بھائی ہیں اور وہ مجھے جلال الدین کی بیٹی سمجھ کر چھوڑ گئے اور میرے فادر کون تھے؟ میری والدہ کا تعلق کس خاندان سے ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا، وہ میرے بابا جلال الدین کو جب ملیں تب ان کے شوہر کی ڈیڑھ

کو اڑھائی سال ہو چکے تھے اور وہ دارالامان میں مقیم تھیں اور بابا اپنے کسی اسائنمنٹ پر کام کر رہے تھے۔ وہیں انہوں نے امی کو دیکھا اور اپنے خاندان سے ٹکڑے کران سے شادی کر لی، لیکن دونوں کی رفاقت صرف کچھ سالوں کے لیے رہی اور انہی لوگوں نے امی کا بھی قتل کر دیا.....“ سروہی کا لہجہ چھینے کی حد تک تلخ تھا اور عائش اسے یوں یک ٹک دیکھ رہا تھا جیسے وہ کہانی سنا رہی ہو۔

”بابا ان لوگوں کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں، لیکن وہ اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے اندر مزید کچھ کھونے کا حوصلہ نہیں، لیکن میں ان لوگوں کو تلاش کر کے رہوں گی۔ بابا نے ولدیت کے خانے میں بھی اپنا نام لکھوا دیا تاکہ میں لوگوں کے سوال جواب سے بچی رہوں، لیکن ایسا کرنے سے وہ میرے اندر کی بے چینی کو تو ختم نہیں کر سکتے۔“

”لیکن تمہیں یہ سب جاننے کی ضرورت کیا ہے؟ مٹی ڈالو تمام چیزوں پر گڑے مردے اکھاڑنے سے کچھ نہیں ملتا۔“ عائش کے انداز میں خاصی فکر مند تھی۔ وہ اسے سختی سے ان تمام معاملات سے دور رکھنا چاہتا تھا، لیکن سروہی کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں خاصی مضبوط ہے۔

”بھئی میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ میں خود کو پانا چاہتی ہوں۔ اپنی پہچان ڈھونڈنا چاہتی ہوں اور میرا بھائی جس سے میرا خون کا رشتہ ہے، میں اسے ایک دفعہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ عائش آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے ناں؟“ اس کی نگاہوں میں التجا اور مان کے اتنے رنگ تھے کہ عائش کا سر نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں مل گیا۔

”اب بتائیں کہ آپ کا کیا فیصلہ ہے؟“ وہ شرارت بھرے انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

”وہی جو پہلے تھا۔“ عائش کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اعتماد تھا۔

”ریٹکی.....؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”یس! آف کورس!“ عائش نے نیل پر رکھا اس کا ہاتھ ایک لمحے کو آگے بڑھ کر دبایا اور

چھوڑ دیا۔ اس کے لمس نے سروہی کے پورے وجود میں حرارت بھری تھی۔

وہ پورے ایک ہفتے سے انتہائی بے چین تھی۔ ایک انہونی کے احساس نے اس کے تمام وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اوپر سے سجاد کا کچھ ہٹا نہیں تھا۔ وہ ایسا ہی بے پردہ تھا اور انتہائی غیر مستقل مزاج بھی۔ اگر آجاتا تو جانے کا نام نہیں لیتا تھا اور اگر چلا جاتا تو کئی کئی ہفتے پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا۔

اب بھی پچھلے ایک ہفتے سے اس کا کوئی اتنا ہٹا نہیں تھا۔ وہ سارا دن پوری کوشش میں گھومتی رہتی۔ پورا دن کا ثنا انتہائی مشکل ہو جاتا۔ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھتی اور مومنہ کو یوں لگتا جیسے گھڑیاں رک گئی ہوں۔ کوشش میں کوئی بوا اور اس کا میاں تھا اور اب پچھلے کچھ عرصے سے گیٹ پر چوکیدار کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اپریل کا مہینہ تھا اور فضا میں ہلکی سی حدت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ماحول میں عجیب سی اداسی تھی۔ وہ پہلے تو ایک ہفتہ پرانا اخبار پڑھتی رہی۔ سجاد جن دنوں بیمار تھے اپنے ساتھ کتابوں کا ایک بنڈل بھی لائے تھے۔ وہ ساری کتابیں وہ پڑھ چکی تھی۔ اس کے باوجود وقت کا ثنا مشکل ہو جاتا اور بار بار پڑھی ہوئی چیزیں اور کتنی دفعہ پڑھ سکتی تھی۔ اب تو اسے وہ ازبر ہو گئی تھیں۔ اس دن بے زاری اور سستی نے اس پر بھرپور حملہ کر رکھا تھا۔ پہلے تو وہ بے چینی سے ادھر ادھر گھومتی رہی۔ گوئی بوا اپنے کوارٹر میں تھی، پھر اکتا کر وہ باہر لان میں نکل آئی۔ دل بوجھل سا تھا۔ زندگی نے بڑی بے رحمی اور بے دردی سے اسے آزمایا تھا۔ اب تو وہ پیچھے لال حویلی میں جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ شاہ جی اور حیدر لالہ تو اسے گولی سے اڑا دیتے اور اسی سوچ نے اسے وہاں نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سجاد سے اسے ہٹا چلا تھا کہ شاہ جی نے ایکسٹنٹ میں اس کی موت کی خبر پورے گاؤں میں مشہور کر دی تھی اور یہ خبر ملک کے بڑے اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ جسے پڑھ کر مومنہ کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل آئی تھی۔ موسم میں اچانک تبدیلی آئی تھی۔ مشرق کی طرف سے ایک گھٹا اٹھی تھی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان کو اپنی پیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر سامنے لگی بوگن ویلیا کی تیل کو دیکھنے لگی۔ کوشی کا لان مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے کافی اجڑا اجڑا سا تھا۔ سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر سامنے تھا۔ اس نے نہ جانے کیا سوچ کر سائیڈ دیوار کے پاس رکھی پرانی جھاڑو اٹھائی اور

منائی کرنے لگی۔ گیٹ پر بیٹھے چوکیدار نے اسے حیرت سے دیکھا اور پھر مسکرانے لگا جب کہ وہ اسے نظر انداز کیے اپنے کام میں مگن تھی۔ برآمدہ اور لان کا کافی حد تک صاف ہو گیا تھا اور گند کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔ مومنہ نے سوچا کہ اسے آگ لگا دے۔ ماحس کی تلاش میں کچن جانے سے پہلے اسے چوکیدار کا خیال آیا جو کچھ دیر پہلے سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ دوپٹہ ٹھیک طریقے سے پھیلاتی ہوئی گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار کا سٹول خالی تھا۔

مومنہ کا دل تیزی سے دھڑکا۔ ایک عجیب سی کیفیت نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ گیٹ کے دائیں طرف نارنجی پھولوں والی بوگن ویلیا بے تحاشا پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دبے قدم آگے بڑھی اور چھوٹے گیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ کھلا ہوا تھا۔

”مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ بہت تیزی سے ایک سوچ اس کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے پُر جوش انداز میں قدم بڑھائے اور چھوٹا گیٹ پورا کھولا۔

”لیکن میں کہاں جاؤں گی؟“ ایک تلخ حقیقت اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

”لال حویلی.....“ دل نے انہونی سی خواہش کی، لیکن اگلے ہی لمحے دماغ نے فوراً اسے آئینہ دکھایا۔ وہ ٹھک کر رک گئی۔ سامنے سٹول پر آج کا اخبار سگریٹ کا پیکٹ اور ایک موبائل فون پڑا تھا اور اسے سامنے ہی چوکیدار بھی ریڑھی والے کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرتا نظر آ گیا تھا۔ وہ اس سے نظر بچا کر نہیں نکل سکتی تھی۔ ساری سڑک سنسان تھی اور ویسے بھی یہ خاصا پوش ایریا تھا۔ مومنہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ تیل فون اٹھایا اور کن اکھیوں سے چوکیدار کو دیکھا جو بے پردائی سے کھڑا ایک موٹی تازی مولی کھا رہا تھا۔ مومنہ کے دل کو عجیب سی تقویت ملی۔ چند لمحے پہلے جو خوف اور دہشت کی حالت تھی اس میں قدرے افادہ سا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ یوں بدلا جیسے کسی نے بھڑکتے الاؤ پر برقیلا پانی ڈال دیا ہو۔ مومنہ نے انتہائی عجلت میں تیل فون پر حویلی کے پٹی سی ایل نمبر کے بٹن پیش کیے۔ دوسری طرف تیل جاری تھی۔ مومنہ کا دل مکمل رفتار سے دھڑکا۔ اس نے ہراساں نظروں سے ایک دفعہ پھر چوکیدار کو دیکھا جو خوش گہیوں میں مصروف تھا۔

”ہیلو جی!“ حویلی کی ملازمہ گوئی نے انتہائی بے ڈھنگے پن سے کہا۔ مومنہ جو بے صبری سے بولنے والے کی آواز پہچان رہی تھی اور اسے ڈر تھا کہ کہیں شاہ جی یا حیدر لالہ فون نہ اٹھا لیں۔ اس نے آواز پہچان کر پھر ڈرا محتاط انداز میں پوچھا۔

”گوگی؟“

”ہاں جی..... اور آپ کون؟“ گوگی بری طرح ہنسی اور چونک کر پوچھا اب کہ اس کے انداز میں بے چینی اور غلت تھی۔

”عروہ کہاں ہے مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“ مومنہ نے تیزی سے کہا، جبکہ دوسری طرف گوگی شاید اس کی آواز پہچان چکی تھی، تبھی بڑے جوش انداز میں ذرا قدرے اونچی آواز میں بولی۔

”آپ مومنہ بی بی ہیں ناں؟ کہاں ہیں آپ؟ شاہ جی نے آپ کو بہت ڈھونڈا جی اور چھوٹے شاہ جی بہت غصے میں ہیں..... آپ حویلی میں مت آنا، ورنہ وہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ جلدی جلدی بول رہی تھی اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت دالان خالی تھا۔ گوگی اور رسیلی چونکہ ان کی ہم عمر تھیں، اس لیے ان کا دل مومنہ وغیرہ کے ساتھ خوب لگا رہتا۔ وہ دونوں اپنی سادہ اور پر خلوص سی بیسیوں کے کمروں میں گھسی رہتیں، مومنہ کی آنکھیں بھیگ گئیں اس کی محبت پر.....

”میں ٹھیک ہوں، تم یہ بتاؤ کہ بے جی، امی، عروہ اور اریہ کیسی ہیں؟“ وہ سرد آہ بھر کر بولی۔

”وہ سب ٹھیک ہیں، پرسوں عروہ بی بی کی مہندی تھی، لیکن رسیلی کی وجہ سے کینسل ہو گئی اور بڑے شاہ جی کا غصہ اس لیے بھی سوانیزے پر ہے.....“ اس کے کانوں میں گوگی کی آواز گونجی۔

”کیا مطلب.....؟ رسیلی کی وجہ سے کیوں؟“ مومنہ نے بے چینی اور غلت سے پوچھا۔

”آپ کو کیا بتاؤں، ایسی دکھیری قسمت کی ماری میں نے آج تک نہیں دیکھی، بس حالات کے چکر میں آ گئی جی..... کیا سونے جیسا روپ تھا اس کا، میری تو پکی سیلی تھی وہ.....“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ مومنہ کا دل بے اختیار دھڑکا، اس کے ذہن میں الہڑی رسیلی کا سراپا روشن ہوا جو میک اپ کی خاصی شوقین تھی۔

”خود شہی کر لی اس نے..... کنویں میں کود کر خود کو ختم کر لیا جی.....“

”کیا.....؟“ مومنہ کا دماغ بھک سے اڑا۔

”جی اللہ جانتا ہے اس کے ساتھ کیا ہوا لیکن حویلی کے نوکروں نے بڑی باتیں کیں، میری اماں بھی بتا رہی تھیں کہ وہ پیٹ سے تھی.....“

”کیا.....؟“ مومنہ کو پسینہ آ گیا تھا..... وہ اب خشک انداز سے کہہ رہی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ حویلی میں ہی پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی، اس نے تو باہر کی دنیا تک نہیں دیکھی..... لوگ ایسے ہی بکواس کر رہے ہوں گے..... اندر کی بات کوئی اور ہو گی.....“

”نہیں جی.....!“ گوگی کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی تھی، تبھی اپنے لفظوں پر زور دے کر بولی۔ ”بی بی ایسا ہی ہوا ہے، یہاں حویلی میں بڑا ہنگامہ ہوا..... اس کی ماں نے بہت شور مچایا کہ اس کی بیٹی پر یہ ظلم حویلی کے اندر ہوا ہے اور اس کے بعد جی اخبار والے بھی آ گئے اور ٹی وی والے بھی، شاہ جی نے بہت مشکل سے معاملہ سنبھالا۔ روز اخبار میں آتا تھا۔ اتنا شور مچا کہ شاہ جی نے شادی ہی آگے کر دی اور تو اور یہ رسیلی کی ماں کسی کے بھی قابو نہیں آ رہی تھی۔ شاہ جی نے کچھ دے دلا کر چپ کر دیا ہے اور اب وہ دونوں میاں بیوی حویلی ہی چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور شاہ جی کو بتایا بھی نہیں، انہیں اس بات کا بھی بہت غصہ ہے جی.....“

”اچھا.....؟ تم میری عروہ سے بات کرو اور دیکھو کسی کو بتانا مت، ورنہ شاہ جی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔“ مومنہ نے کچھ سوچ کر اسے مناسب لفظوں میں دھمکایا۔

”تم عروہ کو چھوڑو اور مجھ سے بات کرو.....“ کسی نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے سیل فون پکڑ کر فوراً بند کیا تھا۔ مومنہ ہاتھ چمڑا کر پیچھے ہٹنے لگی اور سامنے سجاد کو دیکھ کر وہ ایک دم خوفزدہ ہو گئی۔ اس کا منہ حیرت کی زیادتی سے کھلا رہ گیا تھا۔ سجاد نہ جانے کب آ کر پیچھے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ گوگی کی اطلاع سن کر ارد گرد کے ماحول سے بے خبر ہو گئی تھی۔ وہ اب ہراساں چہرہ لیے سجاد کو انتہائی طیش کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ تیز تیز بولنے ہوئے اس نے پوچھا کہ سجاد کو اتنی زور سے ٹھوکر ماری تھی کہ وہ لڑھکھا ہوا سامنے کیاری میں جا گرا تھا۔ وہ اس وقت اجنبیت کی آخری حد پر تھا۔ اس نے مومنہ کو بازو سے پکڑ کر یوں اندر دھکیلا تھا جیسے وہ کوئی بے جان کھلونا ہو۔

”تم جیسی پاگل‘ بے وقوف اور جاہل لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔“ ایک تو تمہیں اس جہنم سے نکال کر لایا اوپر سے تم میرے لئے ہی مسئلے پیدا کئے جا رہی ہو۔ جان نکال دوں گا میں.....“

سجاد انتہائی غصے اور اشتعال کی حالت میں تھا۔ چوکیدار کی بھی شامت آئی ہوئی تھی۔ ”کیا‘ کیا ہے میں نے؟“ وہ انتہائی ناراضی کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم.....“ وہ انتہائی غصے کی حالت میں ایک لمحے کو چپ ہو گیا اور پھر اونچی آواز میں بولا۔ ”تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ تم نے کیا، کیا ہے؟ وہ جو اپنے سگوں کو چوکیدار کے موبائل سے فون ملا رہی تھیں، تمہیں معلوم ہے کہ شاہ جی اور حیدر تمہیں قبر کے اندر سے بھی کھینچ لائیں گے۔ آج کل تو ویسے بھی ان کا دماغ ٹھوکا ہوا ہے۔ قسمت بھی تو انہیں شیخ شیخ کر مار رہی ہے اور اندر کھاتے جس طرح تمہاری تلاش میں وہ کنویں تک کھدوا رہے ہیں مجھے سب خبریں ہیں۔“

”تو کیا ہوا آپ کو سب خبریں ہیں، لیکن یہ نہیں معلوم کہ حویلی کے کسی ٹیلی فون سیٹ پر سی ایل آئی نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ گوگی جس سے میں بات کر رہی تھی وہ ہمارے وفاداروں میں سے ہے۔ وہ مر جائے گی لیکن ہم بہنوں کے باوے میں کوئی بات منہ سے نہیں نکالے گی اور تیسری بات یہ ہے کہ آپ کون سا شاہ جی سے ڈرتے ہیں۔ میں قانون اور شرعی لحاظ سے آپ کی منکوحہ ہوں وہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے.....“ سجاد علی کے چہرے پر پہلی دفعہ اطمینان کے رنگ پھیلے تھے، لیکن غصہ اور ناراضی ابھی بھی باقی تھی تبھی تو وہ طنزیہ لہجے میں بولا تھا۔

”ڈرتا تو میں شاہ جی کے باپ سے بھی نہیں ہوں، لیکن میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ وہ

تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائیں اور پھر سیاسی حالات اس قدر خراب ہیں کہ کسی بھی ٹائم نئے الیکشن ہونے کا امکان ہے اور میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو کوئی چٹ پٹا موضوع نہیں دینا چاہتا، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا باپ ان مواقع پر گھٹیا حرکات پر اتر آتا ہے۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا آئندہ اس قسم کی حرکت پر میں بھی زبان سے ہرگز بات نہیں کروں گا اور یہ بھی بھول جاؤں گا کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو۔“ سجاد کے انتہائی سخت لہجے میں دی گئی وارننگ پر مومنہ کا دل بڑی طرح سہا تھا۔ اس نے ٹھوہ کنٹاں نظروں سے سجاد کو دیکھا جو بے پروائی سے ٹی وی آن کر رہا تھا۔

وہ احتجاجاً ٹی وی لاؤنج سے نکلتا چاہ رہی تھی جب ٹی وی اسکرین پر موجود دو چہروں نے اس کے پاؤں مضبوطی سے جکڑ لئے تھے۔ مومنہ نے الجھ کر ٹی وی اسکرین کو دیکھا۔ وہ بری طرح ٹھکی تھی۔ سامنے ٹی وی اسکرین پر حویلی میں کام کرنے والی رجو بیگم اور غلام محمد غم زدہ شکلوں کے ساتھ براجمان تھے۔ پروگرام کی میزبان ان کی بیٹی پر ہونے والے ظلم و ستم کو بڑے پڑ اعتماد انداز میں بتا رہی تھی۔ شاہ جی اور حیدر کا نام آنے پر اس نے چونک کر سجاد کی طرف دیکھا، جو خود بھی خاصے مگن انداز سے پروگرام کی طرف متوجہ تھا۔

”یہ کیا بکواس کر رہی ہے.....؟“ مومنہ نے بے ساختہ کہا۔

”مجھے کیا پتا..... میں تو خود ابھی دیکھ رہا ہوں، اخبارات میں بھی اس واقعہ کا خاصا چرچا ہوا ہے، لیکن یہ کیس ٹی وی پر بھی اچھالا جا رہا ہے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اب آئے گا شاہ جی کو مزہ.....“ سجاد نے چٹخارہ بھرنے کے انداز میں کہا تو مومنہ نے انتہائی ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

”واہ.....“ سواد آ گیا، لگتا ہے کہ یہ خاصی ”پچھنی“ ہوئی ہے اس نے تو کئی گڑے مردے اکھاڑنے شروع کر دیئے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس کی ”آخر“ بھی آنے والی ہے شاہ جی تو اسے نہیں چھوڑیں گے..... لیکن لڑکی بھی کم نہیں پوری پناہ لگ رہی ہے.....“ وہ آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا تھا اور اب بڑی بے تکلفی سے تبصرہ کر رہا تھا۔

میزبان نے اب رسیلی کے ماں باپ کا انٹرویو لینا شروع کر دیا تھا۔ رجو بیگم اب رسیلی کا آخری خط اسے روتے ہوئے دکھا رہی تھی، وہ حیدر شاہ کو جھولیوں اٹھا اٹھا کر بدعاتیں دے رہی تھی اور انصاف کی اپیل کر رہی تھی۔ مومنہ کا دل بیٹھا جا رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے ہاتھی کا

پاؤں دل پر آ گیا ہو۔ وہ سخت حیرت سے میزبان کو ایک سانس میں بولا دیکھ رہی تھی، جس نے اس سارے قصے پر لگتا تھا خوب دل جمعی سے کام کیا تھا۔ انصاف فراہم کرنے والے اداروں کے ایک دو لوگ بھی وہاں موجود تھے اور وہ بھی خوب بڑھ چڑھ کر لجن طعن کر رہے تھے۔

”یہ رجو نیگم اور غلام محمد کا لگتا ہے بیٹی کی موت پر دماغ چل گیا ہے جو یہ نمک حرامی پر اتر آئے ہیں۔ حویلی میں ان کے سارے خاندان کو تین دقت کا کھانا روٹی، کپڑے اور رہائش ہر چیز ملتی تھی اور اب یہی لوگ اپنے مالکوں کے خلاف بغاوت پر اترے آئے ہیں اور اوپر سے ہمارا میڈیا بھی شتر بے مہار کی طرز پر چل رہا ہے۔ کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں جس کا دل کرتا ہے وہ دوسروں کی مگڑی اچھالنا شروع کر دیتا ہے.....“ مومنہ کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا تھا۔ سجاد اس کی ایک تواتر سے نشر ہوتی گفتگو پر دلچسپی سے مسکرایا تھا۔

”میری پیاری زوجہ محترمہ اب وہ دور گیا جب ملازم اپنے مالکوں کا ہر قسم کا ظلم و ستم خاموشی اور صبر کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے۔ اب تو وہ بدولت کے کا وقت ہے۔ میڈیا نے ہر شخص کو اس کے حقوق کی ضرورت سے زیادہ آگاہی دے دی ہے۔ اب تو میڈیا کے اختیار میں ہے جس کو چاہے ساتویں آسمان پر پہنچا دے اور جس کو چاہے پاتال میں گرا دے اور یہ رجو نیگم اور غلام محمد بھی کسی این جی او کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ سمجھو کہ تمہارے باپ کے ستارے گردش میں ہیں۔ انہوں نے بھی بڑی حکومت کر لی سکون سے اب حساب کتاب کا وقت آچکا ہے۔“ مومنہ کو سجاد کا لہجہ بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔

”میرے باپ آپ کے بھی کچھ لگتے ہیں کہ دشمنی سارے رشتے ناتے بھلا دیتی ہے۔“ مومنہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

”جناب من! اس دشمنی کا آغاز ہماری طرف سے نہیں تمہاری طرف سے ہوا تھا۔ حالانکہ میرے باپ اور تمہارے باپ دونوں کزن تھے۔ جب میرے بابا سیاست میں آئے تو شاہ جی کو خاصا ناگوار گزرا۔ یہ اقتدار بھی بہت بری چیز ہے۔ خونی رشتوں میں فرق ڈال دیتی ہے اور یہی ہوا شاہ جی نے بس دشمنی کا آغاز کر دیا اور پھر میری ماں کو بھڑکا کر گھر لے آئے۔ بابا نے دوسری شادی ہی تو کی تھی کون سا ایٹم بم گرا دیا تھا اور خود شاہ جی بھی اس وقت دو بیویوں کے شوہر تھے۔ پھر میری ماں کو ضد دلا کے عدالت سے طلاق لی اور اپنی نام نہاد انا کی

بھینٹ اپنی بہنوں کو چڑھا دیا۔ آمنہ خالہ کی اعظم بچا سے بچپن کی بات ختم کر کے ان سے کئی سال چھوٹے بچے سے ان کی شادی کر دی اور انہوں نے کنویں میں کود کر جان دے لی اور تو اور اپنے سوتیلے بھائی کو بھی اسی سیاسی دشمنی اور اقتدار کی خاطر مروا دیا اور الزام کیا لگایا کہ انہوں نے گھنیا خاندان میں شادی کی تھی اور اسی خاتون کے رشتے داروں نے ان کو مروا دیا ہے اور پھر سننے میں آیا کہ وہ عورت بھی ماری گئی۔ آخر اتنے بے گناہ لوگوں کا خون ان کے سر پر ہے اور خون کبھی نہ کبھی تو رنگ لاتا ہے۔“ وہ تنگی سے مسکرایا تھا۔

”آپ کو کس نے کہا کہ سوتیلے بھائی کو شاہ جی نے مروا دیا ہے، ایسے ہی لوگ بکواس کرتے ہیں۔“ مومنہ کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

”سارے زمانے کو پتا ہے کہ وہ عورت بے چاری شاہ جی سے چھٹی پھرتی تھی۔ ان دنوں میڈیا اتنا آزاد نہیں تھا ورنہ تمہارے والد محترم اتنی آسانی سے نہ چھوٹے۔ شاہ جی کو غصہ تھا کہ ان کے سوتیلے بھائی نے ان سے چھپ کر غیر برادری میں شادی کیوں کی اور اسی کا بدلہ انہوں نے لے لیا اور پھر جائیداد میں حصہ بھی تو بچانا تھا۔“ سجاد آج زیادہ ہی موڈ میں تھا جب کہ مومنہ کا چہرہ شدت جذبات سے تھمارہا تھا۔

”ہونہہ، جھوٹ..... فراڈ۔“ وہ تنگی سے کہہ کر ہونٹ بھیج گئی، جب کہ وہ اس کی بات پر مغلوط ہو کر مسکرایا اور پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سامنے اسکرین پر پروگرام کا اختتام ہو چکا تھا اور میزبان کا نام پڑھ کر سجاد بھی چونکا۔

”سروہی جلال الدین“ یہ نام کچھ سنا لگ رہا ہے۔.....“ وہ آہستگی سے بڑبڑایا۔
”ہونہہ..... کتنا فضول اور عجیب سا نام ہے۔.....“ وہ جھنجھلا کر بولی اور پاؤں پٹختی ہوئی سے نکل گئی۔

* * *

”تمہارا دماغ ٹمک تھا، کیا گھر سے بھاگ بی کر نکلے تھے یا والد محترم سے جھڑکھا تھا؟“ سروہی نے اپنے سامنے بیڈے لیے نوجوان کو بے تھنٹائی تھیں۔ اس کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ ایک تو اسے ٹی وی پر اپنا پروگرام ریکارڈ کرنا تھا اوپر سے نئی خریدی ہوئی گاڑی کا پہلے ہی ہفتے ہونے والا ایکسٹنٹ اس کا دماغ خراب کر رہا تھا اور چونکہ غلطی سراسر اس نوجوان کی تھی، اور اس سے بڑھ

انتہائی تحمل اور سکون سے اپنی پینٹ کی جیب سے اپنا والٹ نکالا تھا۔ سروہی نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”یہ تو میکینک ہی آکر بتائے گا کہ کتنے کا نقصان ہوا ہے۔ زیادہ امارت دکھانے کی ضرورت نہیں۔ شرافت سے اپنے والی وارٹوں کا نام پتا بتاؤ، یہ جو تمہارے پاؤں میں فرپکڑ ہوا ہے تم اپنے پیروں سے تو فی الحال چل کر جا نہیں سکتے اور پر تمہارے مجھے نظر نہیں آ رہے جو تم اڑ کر چلے جاؤ۔ کوئی نہ کوئی لے کر ہی جائے گا ناں.....“ سروہی کو نہ جانے کیوں اس پر غصہ آئے جا رہا تھا۔

”یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں خود ان کو فون کر کے بلالوں گا“ آپ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ وہ اُکتائے ہوئے لہجے میں اب کہ بولا تھا جسے سن کر سروہی نے نیکی سے نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے اشتعال کو دباتے ہوئے دانستہ تحمل سے بولی۔

”میری گاڑی پر ایک سو ایک ڈنٹ تو تم نے ڈال دیئے۔ صبح میرے پروگرام کی ریکارڈنگ بھی کینسل کروا دی اور مجھے اپنے بابا کو آج ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔ وہ پروگرام بھی ملتوی کروا دیا اب مزید کیا ایک پاؤں کے ساتھ بریک ڈانس کر کے دکھاؤ گے.....؟“

”دیکھیں.....“ وہ انگلی اٹھا کر ذرا ناراض لہجے میں گویا ہوا..... ”ایکسیڈنٹ میری غلطی سے ہوا میں مانتا ہوں، لیکن اس وقت میں کسی ذہنی پریشانی میں تھا اور آپ کا جتنا نقصان ہوا مجھے اس کا افسوس ہے میں آپ کا ہر قسم کا نقصان بھرنے کو تیار ہوں۔“

”کیا ذہنی پریشانی تھی تمہیں اتنی سی عمر میں.....؟“ سروہی نے اس کا سوال کیا۔

”اتنی سی عمر سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ وہ خاصا برا منا کر بولا تھا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ”میرے خیال میں آپ میری ہم عمر ہوں گی بلکہ دو چار ماہ چھوٹی ہی ہوں گی۔“

”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ سروہی نے بھی آج اس کی کسی بھی بات کی تائید نہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا شاید۔

”خیر جیسی بھی بات ہو؟ آپ میرے بارے میں مزید پریشان کیوں ہو رہی ہیں جب میں نے کہہ دیا ہے کہ میں آپ کا نقصان بھر دوں گا۔“ اس نے صاف صاف بات کی۔

کر اس نوجوان کو اپنی غلطی کا احساس بھی تھا۔ ایک لمحے کو تو سروہی کا دل چاہا کہ وہ اس لڑکے پر لعنت بھیج کر ٹی وی اسٹیشن پہنچ جائے اور گاڑی کا نقصان بھی بادل ناخواستہ خود ہی پورا کر لے لیکن اگلے ہی لمحے انسانیت کے تمام بھولے بھالے سبق اسے یاد آ گئے تھے۔ تبھی وہ اس نوجوان کو لئے اسی قریبی پرائیویٹ اسپتال میں چلی آئی تھی اور اب اس کے ہوش میں آنے پر بے دریغ اسے سارے ہی تھی اور حیرت کی بات تھی کہ وہ انتہائی خاموشی اور تحمل سے اس کی ساری تلخ اور طنزیہ گفتگو سن رہا تھا۔

”عجیب پاگل اور بے پروا بندے ہو تم۔ سچ بتاؤ کہ گھر سے کیا لڑ کر نکلے تھے۔ کسی سے لڑائی ہوئی تھی امی سے یا ابو سے؟ یا کسی بہن بھائی سے؟“ سروہی کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”کسی سے بھی نہیں۔“ اس نے سپاٹ نظروں سے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جس کی آنکھوں سے غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔ اسے نہ جانے کیوں اس کی شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی، لیکن ایکسیڈنٹ نے اس کے دماغ کی چولیس ہلا دی تھیں۔ فی الحال تو وہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔

”اچھا نام کیا ہے تمہارا اور اپنے والد یا بھائی وغیرہ کا نمبر بتاؤ، میں ان کو انعام کر دوں۔“ سروہی نے کہا جانے والی نظروں سے اس نوجوان کو دیکھا جو ٹریڈنٹ کے بعد خامے سکون میں تھا۔

”میرے والد کی ڈیڑھ ہو چکی ہے اور میں اکلوتا ہوں۔“ اس کا لہجہ اب بھی سپاٹ تھا۔

”اچھا پھر اپنی والدہ یا کسی رشتے دار کا نمبر بتاؤ۔“ سروہی کا لہجہ کچھ نرم ہوا۔

”کوئی بھی نہیں ہے۔“ وہ بے ساختگی سے بولا تھا۔

”کیا.....“ سروہی نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا اور انگلی اٹھا کر ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”دیکھو مجھے پاگل بنانے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے سب کچھ بتا دو اور میری نئی گاڑی کا جو نقصان ہوا ہے وہ بھی فوراً بھرو، مجھے کوئی فلمی کہانی سا کہ بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔ اچھی خاصی نئے ماڈل کی پراڈو لئے محوم رہے ہو میری معصوم سی مہران گاڑی پر کئی چب (ڈنٹ) ڈال دیئے ہیں، آسانی سے بخشوں گی نہیں۔“

”آپ کا جتنا نقصان ہوا ہے بتائیں، میں ابھی بھرنے کو تیار ہوں.....“ اس نے

”دیکھو مسٹر.....“ وہ تنہی لہجے میں بولی۔

”میرا نام مسٹر نہیں دلاور ہے۔“ اس نے اکتائے لہجے میں اطلاع دی۔

”ہاں تو مسٹر دلاور یہ جو تم نے نقصان نقصان کی گردان اشارت کر رکھی ہے یہ بند کرو، میں انسانیت کے ناتے تمہیں وہاں سے اٹھا کر یہاں لائی اور اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچا کر ہی واپس جاؤں گی۔ پتا نہیں تمہاری والدہ کا کیا حال ہوگا یہ اطلاع سن کر۔“

”میری والدہ کی بھی ڈچھ ہو چکی ہے۔“ دلاور نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”تو کیا تم زمیں سے اُگے ہو یا آسمان سے ٹپکے ہو؟ یا پھر کسی خلائی سیارے میں رہتے ہو۔“ وہ تسخرانہ ہنسی کے ساتھ اب سائیڈ ٹیبل پر پڑی دوائیاں اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”میرے والدین کی ایکسیڈنٹ میں ڈچھ ہو گئی تھی وہ جن کے ہاں ملازم تھے میں انہی کی حویلی میں دینا پور میں پلا بڑھا ہوں یقین نہیں آتا تو فون کر کے پیر محمد صاحب سے پوچھ لیں اور یہ گاڑی بھی انہی کی ہے۔“

”کیا.....؟“ سروہی کو جھٹکا لگا۔ ”وہی پیر محمد صاحب جن کے بیٹے کا نام حیدر ہے۔“ وہ بے تابی سے بولی تھی۔

”جی ہاں.....“ اس نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”آپ حیدر سائیں کو کیسے جانتی ہیں؟“ ”وہ اسپارکل ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار میں آتا ہے اس لئے جانتی ہوں۔“ وہ تڑخ کر بولی تھی۔

”وہ ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار آپ نے ہی بتایا ہوگا ہے نا؟“ دلاور نے بھی جواباً طنزیہ وار کیا۔

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اتنے فضول بندے کو اپنے اشتہار میں شامل کرنے کی۔ میں تو زمانے کی تلخ حقیقتوں سے پردے اٹھانے کا فریضہ انجام دیتی ہوں۔ میرا پروگرام دیکھا ہوگا ٹی وی پر ڈسکے کی چوٹ پر۔ تمہارے پیر سائیں اور حیدر سائیں تو خاصے تپے بیٹھے ہوں گے میرے نام سے۔“ سروہی کی اطلاع پر حیدر کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کی الجھن دور ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔

”اوہ! تو آپ ہیں محترمہ.....“ دلاور نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مت بھولو کہ میں وہی محترمہ ہوں جس نے نہ صرف تمہاری جان بچائی بلکہ بروقت لا

کر میڈیکل ٹریینٹ بھی کروایا، ورنہ ابھی تک اسی سنان سڑک پر کسی چور ڈاکو کا نشانہ بن چکے ہوتے۔“ سروہی کے طنزیہ اور کچھ جتاتے ہوئے لہجے پر اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

”بہر حال میرا آپ کو ذاتی مشورہ یہی ہے کہ ایک لڑکی ذات کو اس طرح کے معاملات سے دور ہی رہنا چاہئے۔ یہ سیاست جو ہمارے ملک میں کھیلی جاتی ہے یہ غلاطت میں تعزیری ہوئی اور انسانیت کے اصولوں سے منافی ہے اور جس سسٹم میں میں نے زندگی گزاری ہے ہے وہاں جنگل کا قانون چلتا ہے آپ کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ محض شہرت اور واہ واہ سمیٹنے کے چکر میں اپنی زندگی اور عزت داؤ پر مت لگائیں۔“

”تم اس سسٹم کا حصہ ہوتے ہوئے مجھے یہ مشورہ کیوں دے رہے ہو.....؟“ سروہی نے کھوجتے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

”اس لئے کہ میری رگوں میں اس سسٹم کے پیدا کردہ لوگوں کا خون نہیں۔ یہ تمام چیزیں میری فطرت سے ہٹ کر ہیں۔ میں سب خواتین کا احترام کرتا ہوں۔ میں نے کسی عورت کی گود میں پرورش نہیں پائی، لیکن عورت ذات کی عزت سے بخوبی واقف ہوں اور میرا المیہ یہ ہے کہ میں اس بدبودار سسٹم سے نفرت اور اکتاہٹ کے باوجود اس سے ہٹ کر نہیں رہ سکتا، کیونکہ میری فطرت میں بے وفائی نہیں اور نہ ہی میں احسان فراموش ہوں۔“ اس نے پہلی دفعہ تفصیل سے جواب دیا تھا۔ اس دفعہ اس کے لہجے میں اکتاہٹ کے بجائے بے چارگی کا عنصر نمایاں تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ حیدر اور رسیلی کے واقعہ سے تم تو بخوبی واقف ہو گے اور حویلی کے سربستہ رازوں سے بھی تمہاری آگاہی ہوگی۔ میں ان حویلیوں کے اندر موجود نا سوسائٹ کی روایات پر کچھ لکھنا چاہتی ہوں، کیا اس سلسلے میں تم میری مدد کرو گے۔“ سروہی کا لہجہ اب کہ نرم اور دوستانہ تھا۔

”نہیں.....“ دلاور کے صاف انکار پر وہ جیسے قسم سی گئی پھر سر جھٹک کر بولی۔

”جیسے تمہاری مرضی میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتی، لیکن بہر حال آئندہ آنکھیں کھول کر اور دماغ سیٹ کر کے ڈرائیونگ کرنا ورنہ ہر کوئی میرے جیسا مہربان نہیں ہوتا۔“ سروہی کے دوستانہ انداز پر وہ ایک لمحے کو حیران ہوا اور پھر مسکرانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے انکار پر

اس کا موڈ پھر خراب ہو جائے گا، لیکن وہ تو لمحہ لمحہ اسے حیران کر رہی تھی۔

”تم مسکرا کس خوشی میں رہے ہو؟ کون سا زعفران کا کھیت نظر آ گیا ہے۔“ سروہی کا انداز ڈپٹنے والا تھا۔

”کچھ نہیں، سوچ رہا تھا کہ اگر آپ میری بہن ہوتیں تو صبح شام نامحانہ انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے میرا جینا حرام کر دیتیں۔“ دلاور نے خوشگوار انداز میں کہا جب کہ وہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگی۔

”اگر تم میرے بھائی ہوتے تو میں ہر روز تمہاری ٹھکائی کرتی اور بندے کا پتر بنا دیتی۔“ وہ بال پوائنٹ اگلیوں میں کھاتے ہوئے شرارتی انداز میں بولی تھی۔

”بہر حال آپ بہت خاص اور مختلف لڑکی ہیں باوجود اس کہ.....“ دلاور نے بات ادھوری چھوڑی۔

”باوجود اس کے کہ.....“ سروہی نے اس کی بات قطع کی اور حیرانی سے اسے دیکھا۔

”باوجود اس کے شاہ جی کے دشمنوں میں آپ کے نام کا اضافہ ہو چکا ہے اور وہ آج کل آپ کا حدود دار بجہ کھنگال رہے ہیں اس لئے آپ کو ذرا محتاط رہنا چاہئے۔“

”ڈر رہے ہو مجھے.....؟“ سروہی پر اسرار طریقے سے مسکرانے لگی۔

”نہیں، سمجھا رہا ہوں، ڈرنے والی تو آپ ہیں نہیں، اس کا اندازہ تو مجھے ہو گیا ہے۔“ دلاور نے بھی مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”اُس اوکے، مجھے جانا ہے تم اب فون کر کے جس کو مرضی بلا لو انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی کسی اچھے ماحول میں۔“ وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور آپ کا نقصان.....؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”وہ پھر کسی وقت.....“ وہ بے نیازی سے کہہ کر موبائل سے کھیلنے لگی۔

”ٹھیک ہے، پھر آپ میرا یہ کارڈ رکھ لیں دوبارہ کبھی احسان کرنے کو دل چاہے تو مجھے یاد کر لیجئے گا۔“ وہ خوشدلی سے کہہ رہا تھا۔ سروہی کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ آگئی تھی۔

”ہاں ضرور.....“ وہ ایک گہری سانس لے کر جانے کیلئے کھڑی ہوئی اور جاتے جاتے پلٹی۔

”ہاں سنو.....! آئندہ ڈرائیونگ دھیان سے کرنا۔ تمہارے ساتھ تو والدین کی دعاؤں کا سایہ بھی نہیں۔“ سروہی کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔

”لیکن اب آپ تو دعاؤں میں یاد رکھیں گی نا.....؟“ دلاور کے بے ساختہ انداز پر وہ چونکی اور شدید حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں ضرور.....“ اس نے پُر خلوص انداز میں سر ہلایا۔ دلاور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”تھینک یو سسٹر.....“ وہ بے اختیار پلٹی لہجے کی نرمی کو بالائے طاق رکھ کر چہرے پر زمانے بھر کی سختی لانے کی کوشش کی جو کہ ناکام رہی اور بے ساختہ ہنس پڑی اب وہ رکی نہیں اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

* * *

”اوہ مائی گاڈ..... یہ نایاب کس کے ساتھ ہے؟ اور آج تو وہ کہہ رہی تھی کہ یونیورسٹی میں ایک اہم سیمینار ہے دو بجے.....“ مسز نعمان نے رسٹ وایج میں ٹائم دیکھتے ہوئے حیرت سے سوچا۔ وہ پل سی میں ہونے والی میڈیکل کانفرنس اٹینڈ کر کے یونہی ہال میں نکل آئی تھیں۔ آج تو نعمان صاحب نے خود نایاب کو یونیورسٹی ڈراپ کیا تھا۔ صبح ناشتے کی میز پر انہوں نے سرسری سنا سنا تھا کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ میں کوئی سیمینار ہے جس کی تفصیلات سے وہ اپنے پاپا کو آگاہ کر رہی تھی۔ مسز نعمان کوئی نیرومانڈ خاتون نہیں تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ نایاب کے سرکل میں اس کے کلاس فیلوز کی تعداد خاصی ہے۔ اس وقت بھی لال بلیو لانگ شرٹ کے ساتھ وائٹ کپیری پہنے ہوئے اپنے فطری لاابالی انداز میں اپنے بیگ کے اسٹریپ سے کھیلنے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھے انتہائی سنجیدہ بلکہ بیزار بیزار سے نوجوان سے محو گفتگو تھی جب کہ تیسری کرسی پر کوئی ادھیڑ عمر مرد براجمان تھا، جس کی پشت ان کی طرف ہونے کی وجہ سے مسز نعمان اسے پچھاننے سے قاصر تھیں۔

”کون ہو سکتا ہے یہ.....؟“ مسز نعمان نے اپنی ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے حیرت سے سامنے کچھ فاصلے پر بیٹھے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ بلیک شرٹ اور خاکی پینٹ میں اپنے دراز قد اور مضبوط سراپا کے ساتھ خاصی اٹریکٹو اور ڈھنگ پر سنائی کا حامل یہ نوجوان نہ جانے کیوں انہیں دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا۔ نشو سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے وہ پاس ہی پڑی ٹیبل پر بیٹھ گئی تھیں کافی فاصلے پر موجود ہونے کے باوجود وہ اس نوجوان کے چہرے کے تاثرات بخوبی

پڑھ سکتی تھیں۔ وہ حد درجہ بیزار اور اکتاہٹ کا شکار لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بادل ناخو استہ بیٹھا ہو۔ مسز نعمان کا ایک لمحے کو دل چاہا کہ وہ ان کی ٹیبل پر پہنچ جائیں مگر..... پھر کچھ سوچ کر وہ ہیں بیٹھ گئیں۔ ویٹر سے فریش جوس منگوا کر وہ آہستہ آہستہ سب لے رہی تھیں کہ اچانک ان کی نظر پڑی نایاب کی ٹیبل سے وہ تیسرا شخص تیزی سے اٹھا تھا۔

”یہ کیا.....؟“ مسز نعمان کے چہرے کے رنگ تیزی سے اڑے، وہ خود پر ضبط کر رہی تھیں مگر پھر بھی جانے کیوں سارے بدن پر ہلکا سا لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ ان کے اندر خطرے کی کھنٹی بہت تیزی سے بجی تھی۔ وہ بے ساختہ مڑی تھیں اور انہوں نے اپنا چہرہ بہت تیزی سے نیچے جھکایا تھا، وہ شخص بہت جلدی سے ان کے پاس سے گزرا تھا۔

”معظم علی.....“ مسز نعمان کے اندر زبردست توڑ پھوٹ مچی تھی، ایک زلزلہ اور محشر سا برپا ہوا تھا۔

”یہ معظم علی، نایاب اور اس لڑکے کے پاس بیٹھا کیا کر رہا تھا.....؟“ اس سوچ نے انہیں اندر تک ہلا دیا تھا وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر لیے اذیت کے عالم میں بیٹھی تھیں جب نایاب کی ٹیبل سے وہ نوجوان انتہائی غصے اور اشتعال کی حالت میں کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت لنگ کا ٹائم تھا اور ہال میں کافی لوگ موجود تھے۔ بہت سارے لوگوں نے حیرت اور بے زاری سے انہیں دیکھا تھا۔

”تمہیں ضرورت کیا تھی پاپا سے اتنی بے تکلفی سے بات کرنے کی۔ انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا میری پرسنل لائف میں مداخلت کرنے کا۔“ وہ ان کے پاس سے گزرے تھے۔ لفظ پاپا پر مسز نعمان کا دل جیسے تھم سا گیا تھا۔ انہوں نے خوفزدہ نظروں سے دونوں کو دیکھا جبکہ نایاب اسے ٹھنڈا کرنے کیلئے مسلسل کچھ کہہ رہی تھی جبکہ مسز نعمان کا دماغ ماؤف سا ہو کر رہ گیا تھا۔

”یہ معظم علی کا بیٹا ہے، لیکن نایاب انہیں کیسے جانتی ہے؟“ اس خیال نے ان کے دل و دماغ کو زہر آلود سا کر دیا تھا۔ ان کا دل کر رہا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جائیں اور نایاب کی خوب خبر لیں ایک بھاری سی سل ان کے سینے پر آگری تھی۔

* * *

لال حویلی میں پچھلے کچھ دنوں سے موت کا سا ساٹا طاری تھا ایک عجیب سی خاموشی اور سوگ طاری تھا، طاقتور میڈیا کی وجہ سے ہر بندہ باخبر تھا۔ ریلی کی موت کے بعد اس کی مان کو

اس کے لوہے کے ٹریک سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھا خط ملا تھا، جس نے حیدر کی حرکت کا پول کھول دیا تھا۔ پھر ریلی کے ماں باپ کا میڈیا میں چلے جانا دینا پور کے لوگوں کیلئے اچنبھے کی بات تھی۔ وہ لوگ تو ہر زیادتی پر خاموش ہو جاتے تھے۔ پہلی دفعہ انہیں احساس ہوا تھا کہ چھوڑ دینا اسے شہ دینے کے مترادف ہے۔ میر محمد صاحب نے حیدر کو فوراً انڈر گراؤنڈ کر دیا تھا اور الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں کا سامنا خود کر رہے تھے۔ عروہ کی شادی فی الحال ملتوی کر دی تھی، جس کی وجہ سے شگفتہ بیگم خاصے سکون میں جبکہ مدیہ بیگم خاصی تملارہی تھیں۔

”اللہ رحم کرے میرے بیٹے پر“ یکے بعد دیگر آفتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ میں نے دلاور سے کہا بھی تھا کہ صدقہ خیرات کروائے.....“ بے جی دالان میں نے اپنے مخصوص تخت پر براجمان تھیں جب کہ ان کے سامنے بچے بڑے پلنگ پر پھوپھو روینہ اپنے پاس بیٹھی عروہ کو کوئی ٹانگا سکھانے میں محو تھیں اور دائیں طرف پچھی جانماز پر شگفتہ نماز پڑھ کر اب تسبیح پڑھنے میں مگن تھیں۔

”خدا خیر کرے“ پتا نہیں کس بدخواہ کی نظر میرے بچے کو کھا گئی ہے.....“ بے جی خاصی دکھی تھیں۔ ان کی بات پر روینہ پھوپھو نے سراٹھا کر عجیب سی نظروں سے نہیں دیکھا اور آہستگی سے بڑبڑائیں۔

”خدا کی لاشی بے آواز ہے۔“ بے جی نے ان کا فقرہ سن لیا تھا۔ انہوں نے بے اختیار لب بھینچے۔ ان کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

”بھائی ہے وہ تمہارا.....“ وہ جذباتی ہو کر ذرا اونچی آواز میں بولیں۔

”تو میں نے کب انکار کیا ہے۔“ روینہ پھوپھو بری طرح جھلائی تھیں۔

”پھوپھو.....!“ عروہ کی سرگوشی پر وہ بری طرح چونکیں۔ ”آپ کو سجاوٹ بھائی اور بلاول بھائی یاد نہیں آتے۔“ عروہ کے آہستگی سے کہے گئے فقرے پر ایک تاریک سایہ ان کے چہرے پر پھیلا تھا، بڑی تیزی سے وہ زبردستی پھکی سی مسکراہٹ سے گویا ہوئیں۔

”بھولے ہی کب ہیں لیکن ہمارے خاندان کے خون میں وفا نہیں۔ چلو میں تو مجبور تھی اور غصے میں کچھ شاہ جی کی شہ پر گھر چھوڑنے کی بیوقوفی کر بیٹھی انہوں نے بھی مڑ کر نہ دیکھا کہ ماں زندہ ہے یا مر گئی۔“ روینہ کے لہجے میں ایک محسوس کیا جانے والا دکھ ہلکورے کھا رہا تھا۔

”پھوپھو میں نے سجاوٹ بھائی کو دیکھا تھا.....“ عروہ کے انکشاف پر روینہ بری طرح

چونکیں۔

”کہاں.....؟“ انہوں نے خوفزدہ نظروں سے بے جی کی طرف دیکھا جو اپنی تسبیح کے دانوں میں مصروف ہو گئی تھیں اور بے چینی سے بولیں۔

”ایک دن مومنہ آپ سے ملنے کالج آئے تھے.....“ عروہ نے بہت دھیمی آواز میں کہا تو روبینہ نے دہل کر ایک دفعہ پھر بے جی اور اپنی بھال کو دیکھا اور غیر دانستہ طور پر عروہ کا بازو پکڑ کر اپنے پاس کر لیا۔

”تو کیا مومنہ سجاد کے ساتھ.....؟“ ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی جبکہ لہجے میں خوف ہلکورے کھا رہا تھا وہ یک دم عروہ کو دیکھے جارہی تھیں۔

”پتا نہیں پھوپھو..... لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ وہیں ہوں گی۔“ عروہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آہستگی سے بولی۔

”تم نے کسی کو بتایا تو نہیں.....“ روبینہ پھوپھو یک دم بوکھلا گئی تھیں۔

”بے وقوف تھوڑی ہوں۔“ اس نے ہاتھ دبا کر انہیں تسلی دی جو کہ ٹانگا لگانا بھول گئی تھیں۔

”پھر مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی تھیں۔

”آپ تو سجاد بھائی کی ماں ہیں اور کوئی بھی ماں اپنی اولاد کا برا تھوڑی سوچ سکتی ہے۔“ عروہ نے کن آنکھوں سے دادی کو دیکھا جو غنودگی میں جارہی تھیں اور آہستگی سے کہا۔

اس کی بات پر روبینہ بے ساختہ مسکرائی تھیں۔

”کیسا لگتا ہے سجاد.....؟“ وہ اب اشتیاق سے پوچھ رہی تھیں۔

”اونچے، لمبے، گھنی سیاہ مونچھیں لیکن تھوڑے تھوڑے اکھڑ اور بد مزاج.....“ عروہ کی صاف گوئی پر وہ بے اختیار نہیں۔ ان کی ہنسی کی آواز پر بے جی نے فوراً آنکھیں کھولیں اور سخت حیرت سے اپنی بیٹی اور پوتی کو دیکھا۔ ٹھگفتہ بیگم بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں جب کہ روبینہ پھوپھو نے کڑھائی والا فریم آگے کر لیا تھا۔

”اے بہو یہ دلاور مجھے کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہا۔ کیا شاہ نے اسے بھی حیدر کے ساتھ کہیں روانہ کر دیا ہے۔“ بے بی کو اچانک یاد آیا دلاور کے نام پر عروہ کا دل بے اختیار دھڑکا تھا۔

”بے جی مجھے شاہ جی بھی بتا رہے تھے کہ لاہور گیا ہوا تھا اور وہاں اس کی گاڑی کا کوئی

ایکسٹنٹ ہو گیا تھا۔“ ٹھگفتہ بیگم کی اطلاع پر عروہ نے دہل کر ماں کی طرف دیکھا۔

”یا اللہ خیر! یہ نئی آفت کب ٹوٹ پڑی اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔“ بے جی نے ناراض لہجے میں کہا تو وہ فوراً وضاحت دینے لگیں۔

”آپ کو پتا تو ہے کہ حیدر والے مسئلے کی وجہ سے وہ آج کل کتنے پریشان ہیں اور حویلی میں بھی کم کم نکلتے ہیں زیادہ تر ملتان اور لاہور میں ہی پائے جاتے ہیں وہ تو رات میں نے یونہی پوچھا کہ دلاور نظر نہیں آ رہا تب انہوں نے سرسری سا بتایا تھا۔“

”ہائے ہائے اللہ خیر کرے اور ہم سب کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے، یہ بتاؤ وہ ٹھیک تو ہے ناں ہاتھ پیر تو سلامت ہیں ناں.....؟“ بے جی نے فکر مندی میں پوچھا۔

”ہاں بتا رہے تھے کہ پاؤں میں فریکچر ہوا ہے اور تھوڑی بہت چوٹیں بازو پر لگی ہیں۔“ ٹھگفتہ بیگم کی اطلاع پر عروہ کے چہرے کی رنگت زرد ہوئی اور وہ جو پچھلے کئی دنوں سے اس سے دل ہی دل میں خفا تھی اب ساری ناراضی بھلائے سنجیدگی سے اس کیلئے دعا کر رہی تھی۔

”پتا نہیں کیا بنے گا حویلی والوں کا؟“ بے جی نے دھیمی آواز میں کہا اور ہاتھ میں پکڑی تسبیح ایک سائیڈ پر رکھ دی۔

”مکافات عمل ہے اور کچھ بھی نہیں۔“ روبینہ نے طنزیہ ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا۔

”پھوپھو، ایسے تو نہ کہیں۔“ عروہ نے اپنی جھنجھلاہٹ چھپاتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا۔

”کیوں نہ کہوں ساری زندگی بھائی صاحب نے غلط فیصلے ہی کئے ہیں جس نے بھی احتجاج کیا اس کا پتا صاف کر دیا۔ پہلے میری شادی مجھ سے دس سال چھوٹے معظم سے کی پھر آمنہ کیلئے تو بچہ کہیں سے اٹھالائے وہ بیچاری برداشت نہ کر سکی اور پھر سکندر بھائی کے ساتھ بھی کون سا انہوں نے اچھا کیا تھا۔“

”کون سکندر بھائی.....؟“ عروہ بے اختیار ابھری۔ روبینہ پھوپھو کے چہرے کی رنگ ایک لمحے کو متغیر ہوئی بہت تیزی سے انہوں نے خود کو سنبھالا اور اگلے ہی لمحے وہ سرسری سے انداز میں بولیں۔

”کوئی نہیں تھے تم ذرا اریہ کو دیکھو، میں صنفیہ کے کمرے میں ہو کر آتی ہوں پچھلے تین دن سے وہ کچھ بھی نہیں کھا رہی۔“ وہ فوراً جانے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جبکہ عروہ کو ایک نئی

”بیٹا تم نہیں جانتی ہو یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔“ وہ بے چارگی سے بولی تھیں۔
 ”اچھا، تو پھر آپ کیسے جانتی ہیں؟“ نایاب کے سوال پر وہ ایک لمحے کو ہکا بکار رہ گئیں
 اور اس لمحے انہیں یقین ہو گیا تھا، وہ شاید اپنی بیٹی کو کبھی بھی نہیں سمجھا سکیں اس کے ساتھ ہی ان
 کا دماغ ایک اور لائن پر چلنے لگا۔ انہوں نے دل ہی دل میں مضبوط ارادہ کر لیا تھا کہ وہ نایاب
 کو بھی رملہ کے پاس انگلیٹنڈ بھجوا دیں گی۔

”بتائیں ناں ماما..... آپ کیسے جانتی ہیں؟“ نایاب نے ایک دفعہ پھر اصرار کیا تو وہ
 پریشانی بھری جھنجھلاہٹ سے بولیں۔

”ساری دنیا جانتی ہے کہ معظم علی کتنا کرپٹ انسان ہے۔ وہ کوئی عام انسان تھوڑی
 ہے۔ انتہائی جنگلی اور غورتوں کا رسیا بندہ ہے کئی شادیاں کر چکا ہے جب کرتا ہے بیوی کو فارغ
 کر کے نئی عورت لے آتا ہے۔ اخبارات بھرے پڑے ہیں اس کے اسکیٹڈز سے اور یقیناً بیٹا
 بھی اس کا ایسا ہی ہوگا۔“

”بلاول ایسا نہیں ہے ماما۔“ نایاب نے احتجاجی نظروں سے اپنی ماما کو دیکھا اور اپنی
 جھنجھلاہٹ کو چھپاتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا۔

”تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ جب کہ جمعہ آٹھ دن تمہاری دوستی کو ہوئے ہیں۔“ مسز
 نعمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں اس کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ لڑکیوں سے بہت الرجک ہے۔“ اس
 نے صفائی دی۔

”ہونہہ.....“ مسز نعمان نے تنفر بھرے انداز سے ہنکارہ بھرا۔ ”یہ بھی لڑکیوں کو متاثر
 کرنے کی ٹرک (حربہ) ہوتی ہے ان فیوڈل لارڈز کی۔“

”ماما وہ فیوڈل لارڈز سے مختلف ہے اور اس سسٹم کی برائیوں سے بہت خار کھاتا ہے
 تبھی وہ زیادہ تر امراؤں میں رہا ہے اور اب بھی اپنی حویلی میں نہیں جاتا۔“

”تم اس کی اتنی زیادہ فیور کیوں کر رہی ہو۔ کہیں دوستی سے بڑھ کر تو کوئی بات نہیں۔“
 مسز نعمان کے کھوجتے لہجے پر نایاب نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں اور مسز نعمان کو اس کے
 انداز پر اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ بے تحاشا حیرانی و بے یقینی کے بعد وہ غضب ناک لہجے
 میں بولی تھیں۔

اُلجھن نے گھیر لیا تھا۔

* * *

”ماما آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ آپ ٹڈل کلاس خواتین کی طرح بی ہیو کیوں کر رہی
 ہیں؟ بلاول کوئی واحد بندہ تھوڑی ہے میری سرکل میں۔“ نایاب بری طرح جھنجھلا رہی تھی۔ وہ
 جب سے گھر آئی تھی ماما اس کی کلاس لے رہی تھیں۔ آج انہوں نے پی سی میں اسے بلاول
 کے ساتھ لُچ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور تب سے انکوائری ہو رہی تھی ماما کا اصرار تھا کہ وہ اس
 لڑکے سے ملنا جلنا چھوڑ دے جب کہ وہ اس بات کے لئے قطعاً تیار نہیں ہو رہی تھی۔ الٹا
 کوفت اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

”دیکھو بیٹا.....“ مسز نعمان دانستہ نرم ہوئیں۔

”تمہارے سرکل میں بے شک ایک سوا ایک لڑکے ہوں مجھے ان پر کوئی اعتراض نہیں۔“

”تو پھر آپ کو بلاول پر ہی کیوں اعتراض ہے؟“ وہ قدرے ناراض انداز میں بولی
 تھی۔

”مجھے اعتراض بلاول پر نہیں..... اس کے بیک گراؤنڈ پر ہے۔ تم اس کے باپ کو نہیں
 جانتیں وہ اچھی شہرت کا حامل نہیں۔“ مسز نعمان اسے سمجھاتے ہوئے بری طرح زچ ہو رہی
 تھیں۔ انہیں آج پہلی دفعہ اندازہ ہوا تھا کہ نایاب حد درجہ ضدی اور اپنی من مانی کرنے والی
 ہے۔

”تو اگر اس کے باپ کی شہرت اچھی نہیں تو اس میں بلاول کا کیا قصور ہے؟“ نایاب
 کی بات پر وہ لاجواب ہوئیں اور بے بسی سے اپنی خود سربیتی کو دیکھا انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ
 وہ اسے کیسے سمجھائیں؟ تبھی ہی وہ جذباتی انداز میں گویا ہوئیں۔

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں وہ لڑکا اپنی ماں سے زیادہ عزیز ہے۔“

”ماما اس ٹاٹ فیر آپ کا اور بلاول کا موازنہ تو کسی طور پر بنتا ہی نہیں اور پھر آپ نے
 اور پاپا نے ہمیں ہر معاملے میں آزادی دے رکھی ہے اور اللہ کا شکر ہے ہم نے کبھی اس کا
 ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس لئے آپ کو مجھ پر اعتبار ہونا چاہئے۔ میں اپنی حفاظت خود کرنا
 جانتی ہوں۔“ نایاب نے ہاتھ پکڑ کر اپنی ماں کی تسلی کروائی جب کہ وہ کسی طور مطمئن نہیں ہو
 رہی تھیں۔

”لیکن اس کے اوپر تو امی کا نام لکھا ہوا ہے.....“ نور الصباح بے یقین نظروں سے اس لفافے کو دیکھ رہی تھی۔ جب کہ سروہی خود بھی بری طرح الجھی ہوئی تھی۔

”میری والدہ کا میڈیکل کالج سے کیا کام.....؟“ ایک سوچ نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا تھا۔ اسی وقت باہر کے دروازے کی بیل بجی وہ دونوں بری طرح چونکیں اور خوفزدہ نظروں سے داخلی دروازے کو دیکھا۔

”مجھے لگتا ہے آپ کی بابا آ گئے۔“ نور الصباح بری طرح گھبرا گئی۔

”ایک منٹ ٹھہرو مجھے یہ بکس اسٹور میں رکھنے دو۔“ سروہی نے بکس کو گھسیٹا اور دوبارہ اسٹور میں لے جا کر فوراً دروازہ بند کر کے پٹی تو سامنے نظر کا رپٹ پر بوسیدہ نیلے ڈاک کے لفافے پر پڑی وہ تیر کی طرح وہاں پہنچی اور لفافہ اٹھا کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ دور سے بابا اور نور الصباح کے بولنے کی آواز آرہی تھی، نور الصباح دانستہ اونچی آواز میں گفتگو کر رہی تھی تاکہ سروہی تمام احتیاطی تدابیر اختیار کر لے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ لفافہ اپنے بیڈ کی دراز میں رکھ کر خود واش روم میں گھس گئی تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ فریش ہو کر باہر نکلی تو اس کا سارا دھیان لفافے کی طرف تھا۔

اپنے بیڈ روم کا دروازہ لاک کر کے وہ بیڈ پر آ بیٹھی اور تجسس انداز میں لفافہ باہر نکالا اور لفافے کے اندر موجود بوسیدہ خط نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔ وہ خود پر ضبط کر رہی تھی، مگر پھر بھی جانے کیوں سارے بدن پر ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔ اس نے لرزیدہ انگلیوں سے اس بوسیدہ صفحے کو کھولا۔ سیاہ حروف بہت زیادہ مدہم ہو چکے تھے وہ دھندلی بصارت کے ساتھ یک ٹک اس صفحے کو گھور رہی تھی وہ شاید نہیں یقیناً اس کی ماں کے نام ان کی کسی دوست کا خط تھا۔ اب کہ اس کا انداز خاصا پر اعتماد تھا اور آنکھوں میں حیرتے تجسس کے رنگ بڑھتے جا رہے تھے۔ سامنے ہی لکھا تھا۔

”پیاری دوست راحیلہ

اسلام علیکم.....!

میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹے کی نعمت سے سرفراز کیا ہے۔ میں اور خان صاحب الحمد للہ بہت مطمئن اور خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ میرا دینا پورا والوں سے رابطہ رہتا ہے کچھ

”دیکھو تایاب.....! مجھے تمہاری دوستی پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں اور تمہاری پاپا جتنے مرضی براڈ مائنڈ ہوں، لیکن اس خاندان میں کوئی بھی رشتہ کسی بھی قیمت پر نہیں جوڑیں گے، اس لئے اپنے دل و دماغ میں یہ بات ابھی سے بٹھالو اور اگر میری بات کا یقین نہ آئے تو اپنے پاپا سے بے شک ڈسکس کر لینا، لیکن جو ان کا رد عمل ہوگا وہ کم از کم میرے جیسا پولائنٹ ہرگز نہیں ہوگا۔ انہیں اس خاندان سے بری طرح چڑ ہے اس کے علاوہ جو بھی بندہ ہو ہم اس پر ضرور غور و فکر کریں گے..... اوکے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں جب کہ تایاب ششدر سی ان کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

* * *

وہ آج صبح سے ہی اسٹور میں گھسی ہوئی تھی۔ نور الصباح نے پچھلے چار گھنٹوں میں تیسری دفعہ اندر جھانکا تھا، جہاں وہ اسٹور کے اوپر بنی گیلری سے کھینچ تان کر ایک ٹرک اتار لائی تھی۔ ایک گھنٹہ لگا کر تو اس نے اس کا رنگ آلود تالا توڑ تھا اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ بابا آج صبح سے ہی گھر میں نہیں تھے۔ ورنہ وہ اس کی ماں کی چیزوں کو تو بالکل بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔ آج ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر سروہی ان کے بیڈ روم کے ساتھ منسلک اسٹور میں گھس گئی تھی جہاں چیزوں پر ڈھیروں گرد اور مٹی جمی ہوئی تھی۔ بہت مشکل سے اس نے کھسیٹ کھساٹ کر لوہے کا بکس نیچے اتارا تھا۔ اس کوشش میں خود اس کے کپڑے مٹی مٹی ہو گئے تھے، لیکن جوش اور ولولہ اس کا عروج پر تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اتنی گرد اور مٹی میں سانس لی اور دوپٹے سے چہرہ اور بال صاف کئے۔ وہ اب بکس کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ بکس کے اندر مختلف کاغذات، میڈیکل کی کتابیں اور بے شمار خطوط اور بوسیدہ کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ سروہی کی آنکھوں میں ان کاغذات کو دیکھتے ہی چمک دوڑ گئی تھی۔ اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بہت زور سے بجی تھی۔

”آپنی یہ کیسے کاغذات ہیں.....؟“ نور الصباح جو اسے چائے کا کپ دینے آئی تھی تجسس ہوئی۔

”میرا خیال ہے کہ امی ہیں۔“ اس نے بے توجہی سے جواب دیا اس کی تمام تر توجہ اس بوسیدہ نیلے رنگ کے ڈاک کے لفافے پر تھی، جس پر کسی ہاشل کا نام درج تھا۔

”ارے! یہ تو فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے ہاشل کا پتا ہے۔“ وہ پڑ جوش ہو کر بولی۔

”اے لواب بس بھی کرے۔ آخر کب تک بچے کو کسی کنویں میں چھپائے رکھے گا۔ اوپر سے مدیحہ بیگم نے میری جان الگ کھا رکھی ہے۔ آج کل اس کے شاہ جی کے ساتھ تعلقات خاصے کشیدہ چل رہے ہیں کیونکہ شاہ کا کہنا ہے کہ یہ سراسر اس کی ڈھیل کا نتیجہ ہے جو حیدر آپے سے باہر ہوا پھر مارتا تھا.....“ بے جی کے چہرے پر ناگوارائی کی تحریر صاف پڑھی جا رہی تھی۔

”کہتے تو شاہ صاحب بھی ٹھیک ہیں۔“ دلاور نے محتاط انداز سے کہتے ہوئے دالان کے دائیں بائیں نظر دوڑائی، وہ دشمن جاں کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی اور اسے دیکھے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ پہلے تو وہ اس کی آمد کی خبر ملتے ہی خود بخود ادھر ادھر بے مقصد گھومتی رہتی تھی اور دلاور کی نظریں بھٹک بھٹک کر اس کا احاطہ کر لیتی تھیں۔

”ویسے تمہارے خیال میں حیدر کب تک حویلی آجائے گا؟“ بے جی کی سوئی وہیں انگی ہوئی تھی اور سب کو معلوم تھا کہ دلاور شاہ صاحب کا رائٹ ہینڈ ہے اور اسے ان کے ہر فعل اور ہر فیصلے کی خبر پہلے سے ہوتی ہے، لیکن اس کی سنجیدہ اور محتاط طبیعت کسی کو بھی اس سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ عموماً ہوں ہاں کر کے سب کو اس طرح ٹال دیتا تھا کہ اگلے بندے کو پتا ہی نہیں چلتا تھا وہ حقیقت میں شاہ صاحب کے خاص وفاداروں میں تھا۔

”اے لڑکے تمہارا دھیان کہاں ہے؟ چوٹ کہیں دماغ پر تو نہیں لگ گئی.....“ بے جی کی جھنجھلائی ہوئی آواز پر وہ خفت زدہ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”نہیں بے جی، پوچھیں آپ کیا پوچھ رہی تھیں؟“ وہ ہلکا سا جھینپ کر بولا تھا۔ بے جی نے تعجب انگیز نظروں سے اسے دیکھا، لیکن دانستہ مزید کہنے سے پرہیز کیا اور نپے تلے انداز میں بولیں۔

”حیدر کب تک حویلی آجائے گا؟“ دلاور نے ایک گہری سانس بھری اور مختصراً بولا۔

”جیسے ہی حالات ٹھیک ہوں گے۔“ لیکن بے جی کو شاید یہ جواب پسند نہیں آیا تھا، تبھی ناگواری سے گویا ہوئیں۔

”اے میاں یہ خوب کمی تم نے اب حالات چاہئے پانچ سال تک ٹھیک نہ ہوں۔“

”اللہ نہ کرے۔.....“ دلاور کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”بس بے جی آج کل ملکی حالات خاصے خراب ہیں اور میڈیا والوں نے اس کے کیس

ہمارے بھی خیر خواہ ہیں، لمحہ لمحہ کی رپورٹ دیتے ہیں۔ خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ تم بھایا جی کو دینا پور مت جانے دینا کیونکہ مجھے معتبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ ان کیلئے خاصا مضبوط جال تیار ہے۔ بڑے ابا کی موت کے بعد وہاں حالات خاصے خطرناک ہو چکے ہیں اور بھائی صاحب کا غصہ سوائیز پر ہے۔ تمہارا حد و دار بچہ کھنگال رہے ہیں تم جلد از جلد بھایا جی کو لے کر کسی محفوظ جگہ منتقل ہو جاؤ یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ آخر کو اب تمہارے ساتھ دھرا رشتہ ہے۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔

دعا گو

تمہاری دوست سعدی

وہ خط پڑھ کر بڑی طرح الجھی تھی اور دینا پور پر اس کا دل جیسے تھم سا گیا تھا۔ ایک بھاری سی سل سینے پر آن گری تھی۔

”میری ماں کا دینا پور سے کیا تعلق ہے؟ اور بڑے ابا اور بھائی صاحب کون ہیں؟“ اس خیال نے ہی اس کے اندر بے چینی سے بھر دی تھی۔ ”کیا میری ماں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھیں؟ اور اگر نہیں تو وہ اس ہاسٹل میں کیوں رہ رہی تھیں۔“

وہ ذہنی اذیت سے گزر رہی تھی اور یہی اذیت تھی جو اسے رات کے دو بجے ایک دفعہ پھر سنور میں لے گئی تھی۔ اور کس کھولتے ہی اسے دھچکا لگا جب ایم بی بی ایس پارٹ تھری کا رزلٹ کارڈ اس کے ہاتھ میں آیا اور سامنے ہی راحیلہ بتول ولد رفیق احمد کا نام اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

”میری ماں ڈاکٹری جیسے پروفیشن کے ساتھ منسلک تھی۔“ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بوسیدہ رزلٹ کارڈ کو دیکھتی رہ گئی اس کی حالت اس وقت بہت قابل رحم ہو رہی تھی وہ عجیب سی کیفیت میں گہری بیٹھی رہ گئی۔

* * *

دلاور آج کافی دنوں کے بعد حویلی آیا تھا اور بے جی کی خصوصی دعوت پر پچھلے ایک گھنٹے سے ان کے دکھ درد سن رہا تھا۔ انہیں آج کل شاہ صاحب پر خاصا غصہ تھا۔ جنہوں نے کافی عرصے سے حیدر کو منظر عام سے غائب کر رکھا تھا جب کہ دلاور پچھلے ایک گھنٹے سے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاہ جی کا یہ اقدام سراسر حیدر کی بھلائی کیلئے ہے۔

کو اچھا لالہ بھی بہت ہے جس کی وجہ سے شاہ جی کے خیر خواہوں پر بھی خاصا پریشہ ہے اور انہیں کے مشورے سے شاہ جی نے حیدر کو ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیا ہے اور جیسے ہی کچھ بہتری آئے گی وہ اسے بلا لیں گے۔“ دلاور نے اپنی طبیعت کے برعکس خاصی تفصیل سے جواب دیا تھا، جبکہ بے جی کو شاید اس جواب سے بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ تبھی ان کے چہرے پر انہیں کے تاثرات نمایاں تھے۔

”بے جی عروہ بی بی کہہ رہی ہیں کہ دلاور صاحب سے کہہ کر شہر سے رنگ منگوا دیں۔“ ایک ملازمہ عروہ کا پیغام لے کر ابھی ابھی پہنچی تھی جسے سنتے ہی دلاور کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے رنگ پھیل گئے تھے اور وہ خاصا ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

”اے لؤ مجھے بھول ہی گیا۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ ”پچھلے ایک ہفتے سے جان کھا رہی ہے کہ دلاور سے کہہ کر کچھ کپڑوں کو کرنے والے موئے نہ جانے کون سے رنگ کہہ رہی تھی وہ منگوا دیں۔“

”کون سے کپڑے بے جی.....؟“ دلاور نے انجان بننے ہوئے کہا۔

”اے مجھ بوڑھی کو کیا پتا.....“ وہ ذرا سانس نہیں اور ملازمہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”جاؤ عروہ سے کہو خود آکر بتا دے، اس کے بعد وہ بولتی پھرے گی کہ یہ نہیں ٹھیک اور وہ نہیں ٹھیک.....“ بے جی کے اس حکم پر دلاور نے بے چینی سے پہلو بدلا اور دانستہ پاس رکھا اور افزا کا ٹھنڈا گلاس اپنے لبوں سے لگا لیا۔ ہلکے پیازی رنگ کے لان کے سوٹ میں وہ خفا خفا سی اندر آ رہی تھی۔ دلاور نے ایک بھر پور نظر اس پر ڈالی جبکہ اس نے جواباً شہو کنناں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”بے جی آپ نے بلایا تھا.....؟“ وہ سنجیدہ سنجیدہ سی پوچھ رہی تھی۔

”اے بیٹا کیا تمہارے سکول میں سلام دعا کچھ نہیں سکھائی جاتی یا آج کل اپنی سوتلی ماں کی صحبت میں زیادہ بیٹھنے لگی ہو۔“ بچہ آیا بیٹھا ہے اور تمہارے کام کے لئے ہی میں نے اسے بٹھا رکھا ہے اور تم منہ اٹھائے کھڑی ہو۔“ بے جی نے اس کے خشک روئے پر ٹھیک ٹھاک دلاور کے سامنے ہی جھاڑ دیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات پر دلاور کیلئے اپنی مسکراہٹ کا گھاموڈنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ تبھی وہ فوراً روح افزا کے گلاس پر جھک گیا۔

”السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟“ وہ تمللا کر بولی۔

دلاور کے چہرے پر رونق سی آگئی تھی۔

”وعلیکم السلام، اب تو ٹھیک ہوں آپ کی دعاؤں سے۔“ دلاور کے لہجے پر وہ لمحے بھر کے لئے گڑ بڑا گئی اور اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا کے رہ گئی۔

”کون سے کپڑے آپ کو چاہئیں؟“ وہ سادگی سے مسکرایا۔

”فہرک کپڑے.....“ وہ خفا خفا لہجے میں بولی جبکہ دلاور اس کو اس کی خفگی پر بے ساختہ پیار آ رہا تھا، لیکن اس نے بڑی مہارت سے اپنے تاثرات پر قابو پایا تھا۔ روح افزا کا خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”ایسا ہے عروہ بی بی، ایسی شاپنگ کا مجھے تو کوئی تجربہ نہیں۔ آپ اپنی والدہ یا بے جی سے پوچھ لیں اگر ان کا شہر جانے کا پروگرام ہو تو میں آپ سب لوگوں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ وہاں آپ اپنی پسند سے خرید لیجیے گا۔“ اس کے پروگرام پر عروہ کے چہرے پر خفگی کے بجائے مسرت کے رنگ بڑی تیزی سے پھیلے تھے۔ اس نے التجائیہ نظروں سے بے جی کو دیکھا۔

”اے بیٹا ہم کہاں اس بڑھاپے میں گھومتے پھریں گے۔ تم عظیم اور بچیوں کو لے جانا۔“ بے جی نے اپنی جان چھڑائی۔

”جیسے آپ کہیں.....“ دلاور نے تابعداری سے کہا، جبکہ دل اس کا لبیوں اچھل رہا تھا۔ کافی عرصے کے بعد عروہ کی مختصر سی رفاقت اسے میسر آنے والی تھی۔ ورنہ شاہ جی نے ایف ایس سی کے بعد اسے میڈیکل کالج میں بھی ایڈمیشن نہیں لینے دیا تھا۔ وہ سارا دن بیزار اور اکتائی اکتائی سی حویلی میں گھومتی رہتی تھی اور اس کی اسی حالت کو دیکھتے ہوئے شاید بے جی نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

”بے جی وہ شاہ جی.....“ عروہ نے اکتاتے ہوئے ان کی توجہ اس نکتے کی طرف بھی مبذول کروائی۔

”اے میں کہہ دوں گی اور پھر دلاور کے ساتھ جانے پر وہ پہلے کون سامنے کرتا ہے۔ اپنے گئے بیٹے سے زیادہ تو اس پر اعتبار ہے اسے.....“ بی جی کے بے پروا انداز پر دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں اور دوسرے ہی لمبے وہ دونوں نظریں چرا گئے۔

* * *

”مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر ماما کو تمہارے خاندان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ آخر کیوں

اتنے برے طریقے سے چڑی ہوئی ہیں۔“ آج کافی دنوں کے بعد نایاب کی بلاول کے ساتھ کیمپس میں ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت وہ دونوں کینٹین میں بیٹھے گرم سوسے کھا رہے تھے۔

”کیا.....؟“ بلاول بری طرح چونکا اور پیپسی کی طرف بڑھتا اس کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔

”کیا مطلب.....؟ وہ مجھے کیسے جانتی ہیں؟ حالانکہ میری تو ان کے ساتھ کوئی ایسی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ بس عائش کے فنکشن میں سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔“ بلاول ایک دم سے الٹ ہو کر بیٹھ گیا۔

”یہی تو مسئلہ ہے یار.....“ نایاب نے کچپ کی بوتل میز پر رکھتے ہوئے بے پروا انداز سے کہا۔

”کیا مسئلہ ہے.....؟“ بلاول نے حیرت سے پوچھا۔

”انہیں مسئلہ تم سے نہیں تمہارے بیک گراؤنڈ سے ہے جس کو وہ شاید ضرورت سے زیادہ جانتی ہیں۔“ نایاب نے ٹشو سے اپنی نازک انگلیاں صاف کرتے ہوئے کہا۔ بلاول نے سخت حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی نازکی لڑکی کو غور سے دیکھا اور دانستہ خاموش رہا۔

”تمہارے پاپا کیا پولیٹکس (سیاست) میں بہت ان ہیں؟“ وہ بے پردائی سے پوچھ رہی تھی جبکہ اس کی اس بات سے بلاول کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور دل ناگواری کے احساس سے بھر گیا تھا۔

”ظاہر ہے، وہ منسٹر ہیں۔ یہ اور بات کہ ان کو جوڈی پارٹمنٹ ملا ہے اس کی کوئی خاص ویلین نہیں، لیکن وزارت بذات خود خاصی بڑی چیز ہے۔“

”اوہ.....“ وہ ہلکا سا جھپٹی۔ ”انچو نیلی یار تمہیں پتا تو ہے کہ ماس کمیونیکیشن اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود مجھے سیاست وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں اور میرے لئے انتہائی شرمندگی کی بات ہے کہ مجھے ابھی تک تمہارے پاپا کے ڈیپارٹمنٹ کے نام تک کے بارے میں نہیں پتا۔“

”یہی تو میرے لئے باعثِ رحمت ہے۔“ وہ ناگواری سے بڑبڑایا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ متحس ہوئی۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے صاف ٹالا تھا۔ ”لیکن تمہاری ماما کو کیا پراہلم ہے.....؟ اور ان کا تو میڈیکل کا میدان ہے ان کے پاس ٹائم ہوتا ہے اتنا کہ وہ سیاست جیسی فضولیات پر سے ضائع کر سکیں.....؟“ اسے نہ جانے کیوں غصہ آ رہا تھا۔ بابا کا تعارف اس کے لئے اکثر وجہِ خفت بنتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنے دل کا چور چھپانے کیلئے اگلے بندے پر خاص جارحانہ انداز میں حملہ کر دیتا تھا جیسا کہ اس نے اس وقت کیا تھا جبکہ نایاب اس کے انداز پر بوکھلا کر اسے صفائیاں دینے لگی۔

”میں تو خود ماما کے اس رویے کی وجہ سے پریشان ہوں۔ حالانکہ وہ ایسے کبھی بھی ری ایکٹ نہیں کرتیں، لیکن آج کل وہ نہ جانے کیوں اتنی زیادہ جذباتی ہو رہی ہیں، میں پاپا سے بات کروں گی اس موضوع پر.....“

”کوئی ضرورت نہیں یہ پنڈورا کس کھولنے کی، وہ کوئی اور کہانی کھول کر بیٹھ جائیں گے اور اپنی ذات کو وجہِ گفتگو بنانا مجھے بھی پسند نہیں۔“ بلاول نے سنجیدگی سے اسے ٹوکا تو وہ ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”لیکن پھر یہ مسئلہ سلجھے گا کیسے؟“ نایاب کو ایک نئی فکر نے گھیر لیا تھا۔

”فی الحال اسے سلجھانے کی ضرورت نہیں۔ میں آرام اور سکون سے اپنا فائل سمسٹر دینا چاہتا ہوں اور اس کے بعد ہم نیا لائحہ عمل تیار کریں گے۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو تم میرا کس حد تک ساتھ دو گی؟“ وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”جس حد تک ممکن ہوا۔“ نایاب نے پُر اعتماد انداز میں جواب دیا۔

”اچھا فرض کرو، اگر کوئی ایسی اسٹیج آئی کہ تمہیں ماما، پاپا یا میری ذات میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو..... تم کیا کرو گی؟“

”کیا مطلب.....؟ ایسا کیوں ہوگا۔“ وہ اس کے سسپنس پر جھلا کر بولی اور بے یقین نظروں سے اسے دیکھا۔

”بھئی زندگی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ناممکن تو کوئی چیز بھی نہیں ہے اور جیسے کہ تمہاری ماما کو میرا بیک گراؤنڈ بھی پسند نہیں اور ہو سکتا ہے کہ اب تو وہ آرام سے کہہ دیں کہ میرے ساتھ ملنا جلنا چھوڑ دو اور کبھی انہوں نے جارحانہ انداز اختیار کیا تو تم کیا کرو گی۔“ بلاول کی بات پر اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اندر تک ہل گئی۔ اس کے پاس جیسے کہنے کو کچھ بھی

نہیں رہا اور کافی دیر کے بعد وہ بے بسی سے بولی۔

”مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کروں گی؟“ اس کے جواب پر وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔
 ”یہی تو میں سنتا نہیں چاہتا۔ میں تمہاری طرف سے مکمل سپورٹ کی یقین دہانی چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم آخر میں آ کر میرا ساتھ چھوڑ دو اور میں تہی داماں رہ جاؤں۔“
 ”پھر.....؟“ نایاب نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”مجھے یقین دلاؤ کہ تم مجھے کسی بھی حال اور کسی بھی صورت میں نہیں چھوڑو گی۔“ بلاول کے ضدی لہجے پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور اس نے یہ مشکل تھوک نگلا۔
 ”لیکن.....“ وہ بری طرح الجھی۔

”پلیز نایاب لیکن لیکن کچھ نہیں۔ میں اب اس اسٹیج پر آ گیا ہوں کہ تمہیں کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا اور اگر ایسا کوئی کرنے کی کوشش کرے گا تو میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔“
 ”اور میں اپنی بیٹی کو ایسی کوئی بے وقوفی کرنے نہیں دوں گی۔ تمہارے ذہن میں اگر کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی ہے تو اسے دور کر لو کیونکہ یہی تمہارے اور نایاب کے حق میں بہتر ہوگا۔“
 مسز نعمان جو کہ بلیک ساڑھی میں ملبوس تھیں، اچانک نہ جانے کہاں سے نمودار ہو کر زہر خند لہجے میں بولی تھیں۔

”آپ کون.....؟“ بلاول اور نایاب کو ایک دم انہیں سامنے دیکھ کر جھٹکا تو لگا تھا، لیکن بلاول نے فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

”بیٹا میں کوئی اپنی بیٹی کی طرح بے وقوف یا احمق نہیں ہوں جسے تم مزید پاگل بنانے کی کوشش کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا ہوں اور کون؟“ وہ چبا چبا کر بولیں جبکہ نایاب فق چہرے کے ساتھ ششدر سی حالت میں ماما کو دیکھتی رہ گئی اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

”بہنیں مسز نعمان اور قمل سے بات کریں۔ ایک ایجوکیٹڈ اور ڈاکٹری جیسے پروفیشن سے تعلق رکھنے والی خاتون کو اس قدر جارحانہ انداز زیب نہیں دیتا۔ ہم آرام اور سکون سے بھی بات کر سکتے ہیں۔“ خلاف توقع وہ بہت سنبھل کر اور قدرے نرم لہجے میں بولا تھا۔

”دیکھو!“ مسز نعمان تہہ بھرے لہجے میں سختی سے بولیں۔ ”میں کسی بھی قسم کی کوئی بات یا مذاکرات کرنے کیلئے نہیں آئی۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ میری بیٹی انتہائی بے وقوف اور“

احق لڑکی ہے مجھے اس کا تمہارے ساتھ ملنا جلنا قطعاً پسند نہیں اور تم آج کے بعد اس سے ہرگز نہیں ملو گے۔“

”اٹس او کے.....!“ وہ کندھے اچکا کر معنی خیز لہجے میں گویا ہوا۔ ”آپ یہ فیصلہ کرتے ہوئے اگر اپنی بیٹی کی رائے بھی لے لیں تو مستقبل میں ہونے والی بہت سی غلط فہمیوں سے بچا جاسکتا ہے اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آج بھی یہاں اپنے ڈیپارٹمنٹ سے“ میں نایاب کے خصوصی بلانے پر ہی آیا ہوں اور مجھے حیرت ہے کہ آخر آپ مجھ سے اتنی غار کیوں کھاتی ہیں.....؟“ وہ اب بھی قدرے صلح جو لہجے میں بولا تھا۔
 ”تمہیں اس چیز سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ چڑ کر بولیں۔

”حالانکہ اصولاً تو مجھے ہی مطلب ہونا چاہئے۔ بہر حال میں آپ کے رویے کو سمجھنے سے قاصر ہوں، خیر.....“ وہ کچھ سیکنڈ خاموش رہ کر بازو میں بندھی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ کر گویا ہوا۔

”میری کلاس ہے اور مجھے چلنا ہے۔ باقی جہاں تک میرا اور نایاب کا تعلق ہے وہ اتنا مام یا کچا نہیں ہے۔ یہ آپ کے سامنے گھڑی ہے۔ آپ اس سے پوچھ لیں۔ آپ کو بہت سے فیصلے کرنے میں آسانی رہے گی۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں اور بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا کینٹین سے نکل گیا، جبکہ مسز نعمان نے کھا جانے والی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھا جواب کو فٹ زدہ انداز سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

* * *

”دیکھیں یہ کوئی اتنا بھی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ بے شک دو چار دن لے لیں، لیکن پلیز مجھے اس سیشن کے ریکارڈ سے راحیلہ بٹول کی فائل ایک نظر دکھا دیں۔ میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ وہ انتہائی انتہائی انداز میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے اس ہاسٹل کی ”الڈن سے مخاطب تھی، جو بڑی مشکلوں سے اسے ٹائم دینے پر آمادہ ہوئی تھی اور پچھلے ایک گھنٹے سے وہ اس کی منتیں کر رہی تھیں کہ اکیس بائیس سال پہلے کا ریکارڈ کھنگال دے۔

”دیکھیں محترمہ“ میں آپ کو پچھلے ایک گھنٹے سے یہ باور کروانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔“ ادھیڑ عمر وارڈن نے سستی سے جھانکی لیتے ہوئے اسے ایک دفعہ بلال۔

وارڈن کی ہمدردیاں سہنا چاہیں اور اس کے مطلوبہ نتائج خاصے مثبت برآمد ہوئے تھے۔ اب اس کے چہرے پر خاصی نرمی اور شفقت دکھائی دے رہی تھی۔

”اوکے یہ ہے تو خاصا مشکل کام اور قانوناً بھی ہم کسی کو کسی کی فائل نہیں دکھا سکتے، لیکن تمہارا مسئلہ دوسرا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر تم سے ہمدردی ہے اور مجھے واقعی دلی خوشی ہوگی اگر تمہارا مسئلہ حل ہو جائے اور اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“ وہ خاصے پُر خلوص انداز میں سروہی سے کہہ رہی تھیں اور ان کے مثبت رویے سے پر سروہی کے چہرے پر کچھ اطمینان اور سکون کے رنگ نمودار ہو گئے تھے۔

”تم ذرا میرے آفس میں بیٹھو۔ میں چوکیدار سے کہتی ہوں کہ وہ پرانا سنور کھولے۔“ وارڈن اسے ہدایت کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ سروہی نے بڑی حسرت اور عقیدت سے اس ہاسٹل کو دیکھا جہاں اس کو جنم دینے والی ہستی نے کافی وقت گزارا تھا اور پھر نہ جانے کیسے حالات ہو گئے جس کی وجہ سے انہیں اپنی میڈیکل کی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔

”اف..... وہ سنور تو گرد اور مٹی سے بھرا پڑا ہے، گلتا ہے کہ وہاں صدیوں سے صفائی نہیں ہوئی۔ اب تمہارے بہانے سے چلو اس کی صفائی بھی ہو جائے گی۔“ وارڈن چھینکتی ہوئی اندر آئی تھیں۔

”آپ صابن سے منہ ہاتھ اچھی طرح دھولیں اور خود اندر مت جائیں۔ مجھے اور چوکیدار کو بتا دیں، ہم خود کچھ کر لیتے ہیں۔“ سروہی کو ان کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا۔ اصل میں مجھے ڈسٹ سے الرجی ہے۔ میں نے بھی احتیاط نہیں کی اور منہ اٹھا کر جوش میں اندر گھس گئی حالانکہ جس عمر میں میں ہوں اس میں جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا چاہئے۔“ سروہی ان کے خوشگوار لہجے پر مسکرائی جبکہ وہ ابھی تک چھینک رہی تھیں۔ ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو انہوں نے چوکیدار کو مطلوبہ سیشن کا بندل لانے کو کہا۔

چوکیدار کافی جھاڑ پونچھ کے بعد ایک بوسیدہ اور پرانا سا بنڈل اٹھا لایا تھا۔ سروہی کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی اور ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً اٹھ کر سارا بنڈل کھول لے۔ اس نے بمشکل خود پر کنٹرول کیا جبکہ وارڈن ناک پر دوپٹہ رکھے اور قدرے کوفت بھرے انداز سے گرد آلود فائلوں کو دیکھ رہی تھی۔

”میں مانتی ہوں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں، لیکن میڈم یہ ناممکن تو نہیں.....“ وہ پُر اعتماد لہجے میں اسے قائل کرنے کی ایک اور کوشش کرنے لگی۔

”لیکن لڑکی تمہیں اس چیز کا کیا فائدہ ہے؟ کیوں راجیلہ بتول بے چاری کے پیچھے گئی ہو۔ اللہ جانے کہاں ہوگی وہ!.....“ وارڈن جھلا کر بولیں۔

”میں جانتی ہوں کہ کہاں ہیں وہ.....“ سروہی اب کہ دم لہجے میں گویا ہوئی۔

”کہاں؟“ وارڈن مشتاق سی ہوئی۔

”قبر میں!.....!“

”کیا.....؟“ وارڈن کو زبردست جھٹکا لگا اور ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلے تبھی وہ قدرے نرم انداز میں کہنے لگیں۔ ”اللہ اس کی مغفرت کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ویسے یہ خاتون تمہاری کیا لگتی تھیں؟“ وارڈن کی اس معاملے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

”میری ماں تھیں وہ.....“ اب کے وہ دوبارہ حیران ہوئیں۔

”کتنا عرصہ ہو گیا ان کی وفات کو؟“ اب وہ مکمل توجہ سے پوچھ رہی تھیں۔

”شاید سترہ یا اٹھارہ سال۔“ سروہی نے سرد آہ بھری۔

”اوہ.....“ وہ تاسف بھری نظروں سے سروہی کو دیکھنے لگیں اور پھر بے یقینی لہجے میں بولیں۔ ”اگر وہ تمہاری ماں تھیں تو تم ان کی معلومات کیوں ڈھونڈتی پھر رہی ہو اور کیسی بیٹی ہو جسے اپنی ماں کے اتے پتے کا ہی پتا نہ ہو، کوئی انھیال تو ہو گا ناں تمہارا؟“

”اسی چیز کی تلاش تو مجھے یہاں لے کر آئی ہے۔ میں اپنی زندگی کے اس غلام کو بھرنے چاہتی ہوں۔ اپنی ذات کی پہچان کی تلاش ہے مجھے..... اور یہ آپ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔“ سروہی نے التجائیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو وہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔

”اوہ..... اور تمہارے قادر؟“ وہ متحسّس ہوئیں۔

”ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اصل میں دونوں ایک ایکسڈنٹ میں وفات پا گئے تھے اور میں ان کی اکھوتی بیٹی تھی اور مجھے دارالامان بھیج دیا گیا جہاں سے ایک فیملی نے مجھے ایڈاپٹ کر لیا۔ اب مجھے معلوم ہوا تھا کسی سے کہ میری والدہ میڈیکل کی طالبہ تھیں جہی میں یہاں ان کے ایڈریس وغیرہ کی تلاش میں آئی ہوں۔“ سروہی نے ایک فرضی کہانی سنا کر

ملکی حالات نے ایک دم پلٹا کھایا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر تبدیل ہو گیا تھا۔ عہد حکومت کی جانب سے الیکشن کے اعلان نے ہر طرف ایک جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ سیاسی دھڑے بازیاں تیزی سے بدل رہی تھیں۔ اخلاقیات، اصول، قاعدے، کاغذی وعدوں کے خوشنما خواب دکھائے جا رہے تھے۔ سیاستدانوں کی مصروفیات میں ایک دم اضافہ ہو گیا تھا۔

معظم علی کی حویلی میں ورکرز کا آنا جانا، الیکشنز کے لئے لائحہ عمل اور پارٹی کو مضبوط بنانے کیلئے آئے دن مینٹنز جاری تھیں۔ سجاد کا زیادہ وقت بھی آج کل مبارک پور میں ہی گزر رہا تھا اور سننے میں آ رہا تھا کہ شاہ جی بھی ان الیکشنز کیلئے خاصے سرگرم تھے۔ اب تو ریلی والا معاملہ بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ شاہ جی نے اس کے والدین کے ساتھ مکہ کر کے انہیں کہیں غائب کر دیا تھا، جس کی وجہ سے حیدر بھی اب خاصے سکون میں تھا اور شاہ جی کے ساتھ الیکشن کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ عروہ کی شادی کا مسئلہ اب الیکشنز کی وجہ سے ایک دفعہ پھر التوا کا شکار ہو گیا تھا اس وجہ سے عروہ کیلئے یہ الیکشنز تو خاصے مبارک ثابت ہوئے تھے۔

شاہ جی اور معظم علی ایک دفعہ پھر ایک دوسرے کے مخالف میدان میں اترے تھے۔ دونوں کو ہی ملک کی صف اول کی سیاسی پارٹیوں نے ٹکٹ دیا تھا اور دونوں پارٹیاں ہی خاصی مضبوط اور عوامی شہرت کی حامل تھیں۔ جوں جوں الیکشن کے دن قریب آرہے تھے سیاسی سرگرمیوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔

سجاد بھی پچھلے ایک مہینے سے غائب تھا اور مومنہ خاصی کوفت کا شکار ہو رہی تھی۔ ایک تنہائی نے اس کے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس دفعہ جب سجاد آئیں گے تو وہ صاف صاف بات کرے گی، آج کل وہ بیزار سی ہے، دی پر ہونے والے سیاسی جملے خبروں میں دیکھتی رہتی اور تقریباً روز ہی شاہ جی اور معظم پھوپھا کو اپنے اپنے جلسوں میں لوگوں کو خوشنما خواب اور بڑے بڑے دعوے اور جذباتی تقریریں کرتے دیکھ کر ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے چہرے کا احاطہ کر لیتی تھی۔

”ہونہہ! یہ لوگ قوم کی تقدیر بدلیں گے جو اپنے گھروں کی خواتین کی تقدیر تو بدل نہیں سکتے۔“ وہ حد درجہ قنوطیت کا شکار ہو رہی تھیں۔

جبکہ سروہی کی نظریں معناطیس کی طرح اس فائلوں والے بنڈل پر چپک مگنی تھیں۔ کچھ دیر وہ محویت کے عالم میں مختلف فائلوں کا جائزہ لیتی رہیں اور ایک ایک کر کے اس کو سائیز پر مکتی گئیں۔ ان کی مطلوبہ فائل مل نہیں رہی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، سروہی کا دل بیٹھتا جا رہا تھا اور جوش کے عالم میں وہ خود بھی ان کے پاس آن بیٹھیں تھی۔

”چاہے اس سیشن کی طالبات کی فائلیں تو موجود ہیں، لیکن راحیلہ بتول کی فائل کہاں ہے.....“ وارڈن کی تشویش زدہ آواز پر سروہی کے چہرے پر مایوس کی لہر نے بسیرا کر لیا تھا۔

”حالانکہ اس فائل کو ہوتا تو یہیں چاہئے۔“ وارڈن نے جھنجھلا کر تین چار فائلیں اپنی دائیں طرف پٹخیں ان پر جھنجھلاہٹ اور کوفت نے بھر پور حملہ کیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”بی رلیکس..... آرام اور سکون سے دیکھیں، مل جائے گی۔“ سروہی نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی اسی وقت وارڈن کی جوش اور خوشی سے مل جلی آواز اس کے کانوں میں گھرائی۔

”تھینکس گاڈ..... مل گئی۔“

”کہاں ہے.....؟“ سروہی کے دل کی دھڑکن بے تحاشا تیز ہو گئی تھی۔ اس نے بے چینی سے وارڈن کے ہاتھ میں پکڑی نیلے رنگ کی بوسیدہ سی فائل دیکھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ایک لمحے میں دگنی ہو گئی تھی، جبکہ وارڈن فخریہ نظروں سے سروہی کو دیکھ رہی تھی، جیسے کہ انہوں نے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا ہو۔

”پلیز یہ مجھے دے دیں۔“ سروہی نے بے چینی اور عجلت سے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔

”ہاں! ہاں کیوں نہیں، یہ لوالہ جہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔“

”آمین.....!“ وارڈن کے پرخلموس لہجے پر سروہی نے مشکور نگاہوں سے انہیں دیکھا اور بے تابی سے فائل پکڑ لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ فائل کھولی۔ سامنے ہی درخواست فارم پر راحیلہ بتول کی پاسپورٹ سائز تصویر لگی ہوئی تھی۔ سروہی کی آنکھیں نہ جانے کیوں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

بھی ڈھنگ کی خبر نہیں سنا تا۔ ہر لمحے ایک نیا دم دلوں پر گردا دیتا ہے۔ اب تو خوشی کی خبر سننے بھی ایسے لگتا ہے جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ “اسکرین کو غور سے دیکھتے ہوئے وہ پہلے ایک لمحے کو کھٹکی اور دوسرے ہی پل اس کا دل گویا دھڑکنے لگا، اس کے اعصاب پر لگتا تھا کہ بلند و زبر گریا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے اسکرین کو دیکھ رہی تھی جس پر پٹی چل رہی تھی۔

”دینا پور میں سابقہ ایم این اے پیر محمد کے جلسے پر مخالف پارٹی کی اندھا دھند فائرنگ سے ان کا اکلوتا بیٹا حیدر پیر محمد جاں بحق اور پندرہ پارٹی ورکرز شدید زخمی۔“

* * *

ٹی وی اسکرین پر پٹی چل رہی تھی۔

”دینا پور میں سابقہ ایم این اے پیر محمد کے جلسے پر مخالف پارٹی کی اندھا دھند فائرنگ سے ان کا اکلوتا بیٹا حیدر پیر محمد جاں بحق اور پندرہ پارٹی ورکرز شدید زخمی۔“

اس خبر نے مومنہ کے ہوش اڑا دیئے تھے اور وہ حیرت اور صدمے سے اس خبر کو کھٹکھٹ کر یوں دیکھ رہی تھی، جیسے اس خبر کا تعلق کسی اور سیارے سے ہو۔ دماغ ایک دم سے خالی ہو گیا تھا۔ نہ جانے کب اور کیسے آنسوؤں کی ایک لڑی اس کے گالوں پر بہہ نکلی تھی۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ حالانکہ حیدر کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے تھے۔ وہ حد درجہ منہ بھٹ، خود سر اور ضدی تھا اور اپنی تینوں بہنوں پر بلاوجہ شک کرنا اور ان سے آتے جاتے لڑنا اس کا محبوب مشغلہ تھا، جس کی وجہ سے وہ تینوں اس سے خار کھاتی تھیں، لیکن وہ شاہ جی اور مدیحہ بیگم کا حد درجہ لاڈلا اور سرچڑھا ہوا بیٹا تھا اور ان کے نرم رویے کی بنا پر اس کے اندر اپنی من مانی کرنے کی عادت پروان چڑھی تھی، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود خون کا رشتہ تو ان کے درمیان تھا ہی اور اسی کی کشش تھی، جو اسے رُلا رہی تھی۔

اسے نہیں معلوم وہ کتنے گھٹنے روتی رہی اور روتے روتے سو گئی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ اپنے سامنے والے صوفے پر سجادوں کو انتہائی آرام دہ حالت میں چائے پیتے دیکھ کر وہ پہلے تو چونکی اور پھر ٹھٹھک کر وہیں کا رہٹ پر بیٹھی رہ گئی۔ سر انتہائی بھاری ہو رہا تھا۔ سجادوں نے بہت غور سے اس کے افسردہ چہرے اور متورم آنکھوں کو دیکھا۔

”سارے کے سارے ذہنی مریض، جاہل اور اقتدار کی ہوس کا شکار ہیں اور یہ معظم پھوپھا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آکسفورڈ سے گریجویشن کر کے آئے ہوں گے۔ سب سے زیادہ گند اور جہالت تو ان کے دماغ میں بھری ہوئی ہے۔“ وہ بلیک پینٹ کوٹ میں انتہائی جوش سے تقریر کرتے معظم علی کو دیکھ کر انتہائی تنفر سے سوچ رہی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب سجادوں کا خاص ملازم اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔

”تم یہاں میرے سر پر کیوں سوار کھڑے ہو.....؟“ مومنہ کی نظر اس پر پڑی تھی اور تبھی اپنا سارا غصہ اس نے اس پر اتار دیا۔ وہ حد درجہ تند اور تلخ لہجے پر گھبرا کر وضاحت دینے لگا۔

”بی بی میں تو اگلے مہینے کا راشن دینے آیا ہوں۔ سجادوں سائیں نے بھجوا دیا ہے۔ کہاں رکھوں؟“

”میرے سر پر رکھ دو اور کہاں رکھنا ہے۔“ وہ خاصے چڑچڑے پن سے بولی تھی۔

”جی.....“ وہ بے چارہ گھبرا گیا تھا، تبھی مؤدبانہ انداز میں گویا ہوا۔ ”میں سمجھا نہیں بی بی.....؟“

”میں کوئی فارسی میں تھوڑی کہہ رہی ہوں، اٹھا کر کچن میں رکھ دو۔ وہ منحوس گوشتی بوا کہیں بدروح کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی ہوگی۔ ویسے مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کے منہ میں زبان نہیں ہے اور خود سارا دن اس گنبجے گونگے کے ساتھ اشاروں کی زبان میں نہ جانے کون سی کہانیاں سناتی رہتی ہے۔“ مومنہ نے اپنے اندر کی ساری جلن اس پر نکالی جبکہ وہ آنکھیں نیچی کئے بس سر ہلائے جا رہا تھا۔

”جاؤ اب..... کیا سیکورٹی گاڑڈ کی طرح میرے سر پر سوار ہو گے۔“ اس نے بیزار سی یوں ہاتھ ہلایا جیسے کسی اڑائی ہو۔

”پتا نہیں کس گناہ کی سزا میں یہ قید تہائی ملی ہے مجھے.....“ اس نے غصے میں ریوٹ کنٹرول سے چینل تبدیل کیا۔ اب سامنے اسکرین پر بڑی افراتفری کا منظر تھا۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف اور سراسیمگی بہت نمایاں تھی۔

”اب یہاں کیا مصیبت آگئی؟“ مومنہ نے جھنجھلاہٹ سے سوچا۔ ”ایک تو یہ میڈیا

ہا کہ لوگوں کی ہمدردیاں ماموں کے ساتھ ہو جائیں۔“
مومنہ نے بولنے کے لئے لب کھولے لیکن اس سے کچھ نہیں بولا گیا۔ اس کے چہرے کا
رہج سفید لٹھے کے مانند ہو رہا تھا۔ اس نے خشک ہوتے ہوئے حلق کو تھوک نگل کر ترک کیا۔

”تو پھر کس نے کیا ہے؟“

”اگر تمہاری عقل کام کرتی تو ٹی وی لگا کر ہی دیکھ لیتیں۔ حیدر کا قتل کرنے والا موقع
واردات پر ہی پکڑا گیا تھا اور اس نے اعتراف جرم بھی کر لیا ہے۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”کیا.....؟“ وہ بری طرح خشکی اور اس کے خفا چہرے کو غور سے دیکھا جو اضطرابی
حالت میں صوفے پر بیٹھا بڑی تیزی سے اپنی ٹانگ ہلا رہا تھا۔ مومنہ کے چہرے پر پھسلنے
آنسو اس کو بے چین کر رہے تھے۔

”اب کیا رو رو کر ڈیم بناؤ گی ملک میں.....؟ مومنہ نے شکوہ کناں نظروں سے اسے
دیکھا اور بازو کی پشت سے آنکھیں بیدردی سے رگڑیں۔

”حیدر لالہ کا قتل کس نے کیا ہے؟“

”تمہاری حویلی کی ملازمہ رسیلی کے منگیتنے.....“ سجاد کے جواب پر مومنہ کو یوں لگا
جیسے کمرے کی چھت اس کے سر پر آن گری ہو اس کا پورا وجود ایک آن دیکھے شدید بوجھ کے
نیچے دیتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک نظرا سے دیکھ کر رہ گئی، جبکہ سجاد انتہائی غصے اور طغ سے بولا تھا۔
”ہاں! ہاں اب پوچھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے کیوں قتل کیا؟“ مومنہ خاموشی سے
اٹھکیاں چٹختی رہ گئی۔

”وہ کافی عرصے سے انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ رسیلی کی خودکشی نے اس کا دماغ
خراب کر رکھا تھا۔ وہ تو بہت عرصے سے حیدر کی تلاش میں تھا، لیکن شاہ جی نے اسے
اٹلر گراؤنڈ کر رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ منظر عام پر آیا اس نے حیدر کا کام تمام کر دیا اور اسی وقت
اس نے گرفتاری بھی دے دی۔“ سجاد نے اسے تفصیل بتائی۔ مومنہ کی افسردہ حالت نے
اس کا غصہ خاصا کم کر دیا تھا جبکہ وہ اب سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

”شاہ جی کی حالت خاصی خراب ہے۔“ سجاد کی اطلاع نے مومنہ کو ایک دفعہ پھر سے
بے چین کر دیا تھا۔ اس نے تڑپ کر اسے دیکھا تو وہ مزید گویا ہوا۔

”ظاہر ہے کہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ یہ اور بات کہ جیسا بھی تھا، لیکن ان کی نسل تو اسی

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ اس کے لہجے میں فکر مندی کا عنصر نمایاں تھا، جبکہ مومنہ
صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

”مجھے بہت افسوس ہے حیدر کا.....“ وہ اس کی حالت سے اندازہ کر چکا تھا کہ یہ خبر اس
تک پہنچ چکی ہے، تبھی وہ گلا کھٹکھار کر پنے تلے انداز میں بولا تھا۔

”مجھے جیسے ہی اس حادثے کا پتا چلا یقین مانو بہت زیادہ افسوس ہوا۔ یہ حقیقت میں
ایک رنجیدہ خبر ہے اور میں سنتے ہی فوراً لاہور کے لئے نکل پڑا۔ آج شام عصر کے بعد جنازہ
ہے مجھے معلوم تھا کہ تم بہت زیادہ ڈسٹرب ہو گی اس لیے میں رو نہیں سکا۔ حالانکہ بابا نے کہا تھا
کہ جنازے میں ہماری شرکت ضروری ہے۔ اس لئے اب تھوڑی دیر تک میں یہاں سے
نکلوں گا۔“ مومنہ کی آنکھوں میں بھرے آنسو بے اختیار گالوں پر بہنے لگے۔ سجاد نے
تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھو یہ اللہ کے کام ہیں۔ انسان اس کی رضا کے بغیر ایک جٹکا بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس
کی موت خدا نے ایسے ہی لکھی تھی اور وہ ہو کر رہی۔“ سجاد بول رہا تھا، جبکہ مومنہ کے رونے
سکپیاں بھرنے کی آواز خاموشی میں گونج رہی تھی۔ ایک ہی رات میں اس کے چہرے پر
زردی اور آنکھوں کے نیچے چلتے نمودار ہو گئے تھے۔

”معظم پھوپا نے اچھا نہیں کیا یہ.....!“ وہ بے اختیار سی بولی۔

”کیا مطلب.....؟“ سجاد نے سوالیہ اور جانچتی نظروں سے اسے دیکھا جو رونے
ہوئے اٹھکیاں چٹختی رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی۔ اس نے سخت
صد سے اسے دیکھا۔

”مومنہ! تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ حیدر کا قتل بابا نے کروایا ہے؟“
وہ بے ساختہ نظریں چراگئی اور ذرا توقف کے بعد عجیب سے لہجے میں بولی۔

”اور شاہ جی اور حیدر کی کس کے ساتھ دشمنی تھی.....؟“ مومنہ کے چہرے پر عجیب سی
وحشت تھی۔ سجاد کے کھلے لب پہنچ گئے تھے، فقط ہل بھر کے لئے..... وہ دانت چیں کر اپنے
غصے کو باہر ایلنے سے روک رہا تھا۔

”تمہارا حقیقت میں دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہم لوگ تمہیں اتنے آؤ اور مگہ مے نظر
آتے ہیں جو انکیشن کے دنوں میں ایسی بے وقوفی کر کے اپنے پیروں پر آپ کلباڑی مار لیں

تھی بہت زیادہ کوشش ہو گئے تھے..... اگر وہ آفس سے تھوڑا لیٹ بھی ہو جاتی تو وہ فوراً اسے فون کرنا شروع ہو جاتے تھے اور جب تک وہ گھر نہ آ جاتی ان کی جان سولی پر اٹکی رہتی۔ سروہی کے دل میں خیال آیا کہ اسے اس سلسلے میں عائش کی مدد لینی چاہیے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس دن وہ گھر میں ہی تھی۔ جب صبح صبح عائش کی کال آ گئی اس نے بھی چھوٹے عرا پوچھا۔ ”مس نارزن آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ اس کا لہجہ خاصا خوشگوار تھا۔

”ہاں ٹھیک ہوں خیریت؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”خیریت ہی ہے صبح پاپا ناٹھتے کی ٹیبل پر کھ رہے تھے اللہ خیر کرے سروہی بچی کا ایک ہفتہ سے نہ تو کوئی کالم اخبار میں آ رہا ہے اور نہ ہی کوئی چونکا دینے والا پروگرام تو میں نے سوچا کہ حیرت کی خیریت دریافت کر بی لی جائے کہیں واقعی کوئی مسئلہ نہ ہو۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں تفصیل بتائی۔

”اوہ.....“ وہ کلکلا کر ہنسی اور کچھ لمحوں کے توقف کے بعد حیرت سے بولی۔

”رہی..... آپ کے پاپا میرا کالم پڑھتے ہیں؟“

”ہاں جی بد قسمتی سے ان کا ذوق خاصا خراب ہے۔“ عائش کے شرارتی انداز پر وہ فوراً تپ گئی۔

”شرم تو نہیں آتی اپنے پاپا کے بارے میں ایسے بات کرتے ہوئے.....“

”تو پھر کیسے بات کروں.....؟“ اس نے دوبارہ چھیڑا۔

”عائش.....“ سروہی دھمکی آمیز انداز میں گویا ہوئی۔

”جی سرکار.....“ وہ ابھی تک سابقہ موڈ میں تھا۔

”باز آ جائیں اور سنائیں کہ آج کل کیا ہو رہا ہے؟ گھر میں سب ٹھیک ہیں؟“ سروہی نے بات دانستہ تبدیل کی، اسے معلوم تھا کہ وہ شرارت کے موڈ میں ہے اور اسے تنگ کرتا رہے گا۔ دوسری طرف وہ بھی کچھ سنجیدہ ہوا۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں ماما آج کل میری شادی کے سلسلے میں خاصی سنجیدہ ہیں اپنے کرکل میں کوئی خوبصورت لڑکی کی تلاش کے لئے ہر ایک کو کہہ رہی ہیں۔“

”اچھا.....“ سروہی کا دل دھڑکا۔

سے چلتا تھی۔ بابا اور میں گئے تھے فوراً ان کے پاس لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھے۔ اس لئے ہم کچھ دیر لال حویلی میں بیٹھ کر آ گئے۔ اب جنازے میں بھی جائیں گے بہر حال مخالفت اپنی جگہ لیکن رشتے داری تو ہے ناں.....“ مومنہ سر جھکا کر رہ گئی۔ اس کے پاس بولنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں چاہتے ہوئے بھی تمہیں وہاں نہیں لے جاسکتا لیکن تم ٹی وی پر آخری رسومات دیکھ سکتی ہو۔ میڈیا کے لوگ لال حویلی کے باہر اکٹھے ہیں۔ آخر کو شاہ جی اور پھر تمہارے دادا جدی پشتی جاگیر دار اور شروع سے سیاست میں ہیں اور میڈیا کو تو ایک چٹ پٹا سا موضوع مل گیا ہے۔ کچھ بھی ہے ہے تو ہمارا خاندان اور اس وجہ سے ہم سب لوگ ہی ٹینشن میں ہیں۔“ سجاد کے لہجے کی سچائی پر مومنہ چاہتے ہوئے بھی شک نہیں کر سکی۔ اس کو آج یکے بعد دیگرے حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ سجاد کا طرز گفتگو اور سوچ اسے شدید حیرت میں مبتلا کر رہی تھی کیونکہ ہوش سنبھالتے ہی اس نے شاہ جی اور معظم پھوپا کے درمیان سخت اختلافات ہی دیکھے تھے اور پھر روبینہ پھوپا کے حویلی میں آ جانے کے بعد تو تعلقات میں مزید سرد مہری آ گئی تھی۔

”تم فریش ہو کر اس کے لئے قرآن پاک پڑھو مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ وہاں پہنچے پہنچے بھی پانچ چھ گھنٹے لگ جائیں گے.....“ سجاد نے ہاتھ میں بندھی کھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ مومنہ اثبات میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ وہ بھی غلت میں فوراً نکل گیا تھا۔ دو منٹ کے بعد ہی مومنہ نے جیب اشارت ہونے کی آواز سنی تو وہ بھی وضو کرنے کے لئے واش روم کی طرف چل دی۔

* * *

سروہی کو جب سے اپنی مرحومہ والدہ کے گاؤں کا ایڈریس معلوم ہوا تھا۔ اس کے دل کو بے چینی لگ گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر ساہیوال کے اس گاؤں میں پہنچ جائے جس کا ایڈریس اسے راجیلہ بتول کے ہاشل فارم سے ملا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ لاہور سے ساہیوال اپنی گاڑی پر بھی جاتے ہوئے اسے تین گھنٹے تو ضرور لگ جائیں گے اور پھر ایک ہی دن میں جا کر واپس آنا ساری معلومات اکٹھی کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ پھر اپنی غیر حاضری کا بابا کو جواز دینا ہی تو سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ وہ تو جب سے اس پر فارنگ ہوئی

”جی ہاں! میں نے بھی سوچا ذرا یہ دو چار گھروں سے ہو ہی آئیں، تب ان کو احساس ہوگا کہ اچھی لڑکی آسانی سے نہیں ملتی اور پھر رضا کارانہ طور پر ہم اپنی خدمات پیش کر دیں گے.....“

”اور اگر انہیں کوئی پسند آگئی تب.....؟“ سروہی نے فکر مندی سے کہا تو وہ بے پروائی سے بولا۔

”ڈونٹ وری پاپا اپنے یار ہیں اور تمہارے بہت بڑے فین بھی۔ اس لئے میں بے فکر ہوں، ویسے ہائی داوے تمہیں ٹینشن کس چیز کی ہو رہی ہے؟“

”جی نہیں! مجھے تو کوئی ٹینشن نہیں۔“ وہ صاف کمر گئی۔

”یار کم از کم میرے ساتھ تو جھوٹ نہ بولو.....!“ عائش نے اسے شرم دلائی تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔

”اچھا پھر کس کے ساتھ بولوں؟“

”عوام کے ساتھ اور اپنے قارئین کے ساتھ۔“

”خبردار..... میں اپنے قلم کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتی، آپ میرے اوپر الزام نہ لگائیں۔“ عائش کے جواب پر وہ چینی تھی۔

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے، نہیں لگا تا الزام۔“ اس نے فوراً ہار مان لی اور مزید گویا ہوا۔

”ویسے تم آج کل ہو کن چکروں میں، پچھلے پندرہ دن سے کوئی خیر خبر نہیں، میں نے سوچا کہ پوچھوں یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں۔“ وہ عائش کے فکر مند لہجے پر بے ساختہ مسکرا کر بولی۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، حقیقت میں میرا آج کل باہر کی دنیا سے رابطہ نہیں۔ پچھلے دس بارہ دنوں سے میں نے کوئی اخبار نہیں پڑھا نہ ٹی وی اسٹیشن گئی نہ کسی سے ملاقات ہوئی۔“

”وہ کیوں؟“ عائش نے تفتیشی انداز اختیار کیا۔

”بس ایک اسائنمنٹ پر کام کر رہی تھی۔“ اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

”کیسا اسائنمنٹ.....؟“ عائش کے کان کھڑے ہوئے۔

”یہ تو جب مکمل ہو جائے گا، تب بتاؤں گی۔“ اس نے بھی شرارتی انداز اختیار کیا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ وہ ایسا ہی تھا۔ فوراً مان جانے والا۔ ”ہاں اگر کسی مدد کی ضرورت ہو“

”وہیں آپ کا غلام حاضر ہوں۔“ عائش کے پُر خلوص لہجے پر سروہی کے دل میں ڈمیروں اطمینان اتر آیا تھا۔

”ہاں! کیوں نہیں، آپ کو نہیں کہوں گی تو کس کو کہوں گی۔“ اس نے بے ساختہ جواب دیا تو عائش بھی مسکرا کر رہ گیا۔

* * *

لال حویلی کا گیٹ آج خاص و عام کے لئے کھلا ہوا تھا۔ سرخ رنگ کی اس حویلی کے باہر والے وسیع و عریض لان میں ٹینٹ اور قاتیں لگا کر قل خوانی کے لئے آنے والے لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا، جبکہ اندر والے محن میں خواتین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ سفید بے داغ چاندنیوں پر بے شمار خواتین بیٹھی ہوئی، قرآن پاک پڑھنے میں مصروف تھیں۔ درمیان میں غم اور دکھ سے بڑھ چکا تھا، جی اور گفتگو بیگم بے آواز روتے ہوئے قرآن پاک کے سپارے ہاتھ میں پکڑے بیٹھی تھیں۔ ان کے دائیں بائیں عروہ، اریہ اور روبینہ پھوٹھیں جبکہ مدیحہ بیگم حیدر کے وفات کی اطلاع کے بعد سے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ ٹریکولر لائزر کے زیر اثر مسلسل نیند کے عالم میں تھیں۔ وہ جب ہوش میں آتیں، زور زور سے چپیں مار کر اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگتیں جس کی وجہ سے ڈاکٹر مسلسل ان کو نیند اور سکون کا انجکشن لگا رہے تھے جبکہ شاہ جی کی حالت اب خاصی سنبھل گئی تھی اور آج تو قل خوانی کے لیے آنے والے سیاسی لوگوں کو وہ خود ریسو کر رہے تھے اور دلا درلحہ بہ لہجہ ان کے ساتھ تھا۔

”پھپھو.....!“ سپارہ بند کر کے عروہ نے ہلکی سی سرگوشی کی۔

”ہوں.....“ انہوں نے سر اٹھا کر سرخ نظروں سے اپنی بھتیجی کو دیکھا۔ جس کی آنکھیں بھی شدت گریہ سے متورم ہو رہی تھیں۔

”آپ کو ہوتا ہے معظم پھوپھا، سجاد اور بلاول بھائی بھی آئے ہوئے ہیں باہر۔“ وہ دھمے لہجے میں بولی۔

”کیا.....؟“ روبینہ پھوپھو کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی ان کا دل عجیب سی لے میں دھڑکا تھا۔ وہ بے تابی سے بولیں۔

”تمہیں کس نے بتایا.....؟ کیا تم نے خود انہیں دیکھا ہے؟“ عروہ نے تاسف بھری نظروں سے اپنی پھوپھو کو دیکھا..... بے چینی اور بے قراری ان کے چہرے کے ایک ایک نقوش

سے ابھر رہی تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر عروہ کو حقیقتاً ڈکھ ہوا تھا، تبھی تو اس نے فوراً وضاحت دی۔

”نہیں پھوڑو تو میں ابھی کچن میں گئی، تو وہاں گوگی مجھے بتا رہی تھی۔ اس کا باپ اسے بتا کر گیا تھا۔“

”کیا ابھی بھی وہ لوگ بیٹھے ہیں؟“ انہوں نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”شاید.....“ وہ مبہم انداز میں بولی۔

”عروہ۔“ روبینہ پھوپھو نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اور زیادہ دھیمے لہجے میں کہا۔

”جی پھوپھو.....“ وہ فوراً بولی۔

”اُو ذرا بے جی کے کمرے کی کھڑکی سے ایک جھلک دیکھ کر آئیں، وہاں سے تو لان صاف نظر آتا ہے۔ بہت عرصے سے میں نے اپنے بچوں کو نہیں دیکھا۔“ روبینہ پھوپھو کے بھیکے لہجے پر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ گفتہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”بھابی ہم لوگ ذرا اندر کا جائزہ لے آئیں، ابھی دیکیں باورچی خانے میں پہنچی ہیں۔ پتا نہیں گلو وغیرہ کیا کر رہی ہوں گی۔“ روبینہ پھوپھو کے فکر مند انداز پر گفتہ بیگم سر ہلا کر رہ گئیں۔ وہ دونوں خواتین کے ہجوم سے بچتی بچاتی بے جی کے کمرے تک پہنچی تھیں۔ آج تو لگتا تھا کہ دینا پور کی تمام عورتیں حویلی میں اکٹھی ہو گئی تھیں اور باہر بھی لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔

عروہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کنڈی لگا دی تھی اور کمرے کی لائٹ بند کر کے وہ دونوں مجلس انداز میں کھڑکی کی طرف بڑھی تھیں، بے جی کا کمرہ ایسی لوکیشن پر تھا کہ وہاں سے باہر لان کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکیوں کے آگے بھاری پردے لٹکے ہوئے تھے۔ عروہ نے آگے بڑھ کر پردہ ہلکا سا ہٹایا اور اگلے ہی لمحے اسے بری طرح کرنٹ لگا، وہ فوراً پیچھے ہٹی۔

”کیا ہوا؟“ روبینہ پھوپھو کی بے چینی دیدنی تھی جبکہ وہ خامسے جوش میں بولی۔

”پھوپھو، معظم پھوپا اور بلاول اور سجاد بھائی سامنے ہی بیٹھے ہیں۔“ عروہ کی جوش میں آواز بھی خاصی اونچی ہو گئی تھی۔ روبینہ پھوپھو مجلس انداز میں آگے بڑھیں۔

”کہاں.....؟“

”پھوپھو، دھیان سے بابا کی نظر نہ پڑ جائے۔“ عروہ نے پیچھے سے نصیحت کی جبکہ روبینہ پھوپھو کی پیاسی نظریں سامنے بے شمار لوگوں کے درمیان سر جھکائے بیٹھے سجاد اور بلاول پر جمی

ہوئی تھیں۔ وائٹ کاشن کے سوٹ میں دونوں خامسے کبر و اور جوان لگ رہے تھے۔ روبینہ پھوپھو کی متانے ایک دم جوش مارا تھا۔ ان کی پیاسی آنکھیں کسی طور بھی سیراب ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ یک ٹک انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

”پھوپھو کیا معظم پھوپا کو اتنے غور سے دیکھ رہی ہیں.....؟“ عروہ نے انہیں چھیڑا تو اتنے رنجیدہ ماحول میں بھی ان کے پھیکے اور افسردہ چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”نہیں بیٹا! اپنے وجود کے ٹکڑوں سے نظر ہٹانے کو ہی دل نہیں کر رہا۔ اس ستم گر کو دیکھ کر کیا کروں گی؟ وہ تو ہیں ہی ہر جاں.....!“

”ہر جاں کی ہوں یا بے وفا لیکن کمال کے ہینڈسم بندے ہیں۔ معظم پھوپا ذرا دیکھیں کہیں سے بھی دو جوان بیٹوں کے باپ لگتے ہیں بھلا.....“

”اسی چیز کا تو انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے ساری زندگی۔“ وہ آہستگی سے کھڑکی سے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی تھیں۔ وہ اب بے آواز رو رہی تھیں۔

”پھوپھو کیا ہوا ہے..... اب کیوں رو رہی ہیں؟“ عروہ کے دل پر گھونسا لگا تھا۔

”اپنی بد قسمتی پر رو رہی ہوں۔ آٹھ دس قدموں کے فاصلے پر میرے بچے ہیں اور میں ان سے مل بھی نہیں سکتی اور بچے بھی اتنے بے حس ہیں باپ کی طرح کہ مجال ہے ان کا اپنی ماں سے ملنے کو دل کرے۔ ساری زندگی تریس ہوں ان کے لئے شاہ جی کی ضد اور اتانے میری زندگی برباد کر دی۔ اب پتا چلے گا ان کو کہ اولاد کا ڈکھ کیا ہوتا ہے۔ بچوں کی جدائی میں انسان کیسے پل پل مرتا ہے۔“ وہ روتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں۔

”پھوپھو آپ نے اگر ملتا ہے ان سے تو میں دلاور سے کہوں.....؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا۔

”جب ان کا دل نہیں کرتا تو میں کیوں کہوں؟ ان کو بھی تو پتا ہے کہ دیوار۔ کہ پار ہمیں جہنم دینے والی ماں بیٹی ہے چار قدم چل کر اس سے مل لیں۔“ وہ خود پر قابو پا کر چڑ کر بولیں تو ان کے بچکانا انداز پر عروہ تاہف سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

”اب بھی تو آئے بیٹھے ہیں نا! پتا ہے، ناں کہ اخبارات اور ٹی وی میں واہ واہ ہوگی، تم کیا سمجھ رہی ہو کہ یہ شاہ جی کا دکھ بنانے آئے ہیں، ہرگز نہیں..... یہ تو ایکشن ان کے ہیروں کی مجبوری بنا بیٹھا ہے۔ اس طرح چل کر آنے سے ہر کوئی کہے گا کہ کتنے ظرف والے لوگ

”پھو وہ تو سخت صدمے میں ہیں۔ ان سے تو کسی بھی چیز کی توقع کی جاسکتی ہے۔“
 عروہ نے سادگی سے کہا، تو انہوں نے فوراً اسے جھڑک دیا۔

”اے رہنے دو بی بی! اسے کوئی دنیا سے انوکھا صدمہ نہیں پہنچا۔ میرے بھی تو دو بچے
 جیتے جاتے میری آنکھوں سے دور کر دئیے گئے تھے اور پھر شاہ جی پر اس کی محبت کا ایسا
 بہت سوار تھا کہ انہیں اچھے اور برے کی تمیز ہی بھول گئی تھی۔ ان کے ہر غلط فیصلے کے پیچھے
 انہی مدیحہ بیگم کا ہاتھ ہوتا تھا۔ میں سب جانتی ہوں اور تم شکر کرو کہ یکے بعد دیگرے حالات
 کچھ ایسے ہوئے کہ شاہ جی دوسرے کاموں میں پھنسے رہے، ورنہ اب تک تم بھی ان کے
 بڑے بھائی کے پلے بندھ چکی ہوتیں۔“ پھو گوگی کا لحاظ کیے بغیر بے دھڑک غصے سے بول
 رہی تھیں۔

”اور سنو! رات بھابی صاحبہ کو آمنہ خواب میں نظر آ رہی تھی۔ تب وہ چیخ رہی تھیں کہ
 میرے کمرے میں آمنہ کی روح ہے۔ اب کوئی پوچھے اتنے سالوں میں تو یہ روح ان کو نظر نہ
 آئی، اب حیدر کے مرنے پر رو میں بھی نظر آنا شروع ہو گئی ہیں۔ کل کو انہیں ریلی بھی نظر
 آجائے گی۔ ہم اب ان روحوں کو کیسے سنبھالیں۔ سب شاہ جی کی توجہ حاصل کرنے کے
 پرانے چوٹیلے ہیں، اسی ایک بیٹے کی ماں ہونے کا وہ ناجائز فائدہ اٹھاتی تھیں ناں! دیکھا اب
 نے کیسے رسی کھینچی.....“ عروہ صدمے اور بے بسی سے اپنی پھو کو دیکھتی رہ گئی، جن کو حالات اور
 صدموں نے خاصا تلخ بنا دیا تھا۔ ان کی زبان خاصی زہر آلود ہو چکی تھی اور کچھ عرصے سے تو وہ
 بے جی کو بھی ٹھیک ٹھاک سنا دیتی تھیں اور جیسی ان کی طبیعت بے لحاظ ہو رہی تھی۔ عروہ کو ڈر تھا
 کہ کسی دن وہ شاہ جی کے سامنے ہی نہ پھٹ پڑیں۔

”تم یہاں کیوں ہمارے سر پر کھڑی ہو گئی ہو تمنا نیدار بن کے۔ مردانے میں پیغام بھجوؤ
 کہ دلاور کو بلا لیں وہ ہی کسی ڈاکٹر کو لے کر آئے گا۔“ پھو اپنے سامنے ہونٹ کھڑی گوگی پر ہل
 پڑی تھی۔ ان کے سخت لہجے نے گوگی کو بوکھلا دیا تھا۔ تبھی وہ زور زور سے گردن ہلاتی رہ گئی۔

”اس دفعہ ڈاکٹر آئے تو میں کہوں گی کہ پورے چودہ ٹیکے ایک دفعہ ہی لگا دے۔“ وہ
 غصے سے بڑبڑائیں اور عروہ کے لئے اپنی مسکراہٹ چھپانا دشوار ہو گیا تھا۔ کچھ دلاور کی آمد کے
 علم نے اس کے اندر نئی زندگی بھر دی تھی۔ اس کے اندر کا موسم خود بخود اچھا ہو گیا تھا۔
 وہ دونوں چلتے ہوئے باہر آئیں تو سامنے بریانی تقسیم ہو رہی تھی۔ ایک دھکم پیل کا عالم

ہیں، میں ان کی سب چالوں کو سمجھتی ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر جکڑ کر صدمے سے بولیں
 تو عروہ کو ان پر بے تحاشا ترس آیا۔

”ہو سکتا ہے پھو کہ انہیں حیدر بھائی کے جانے کا واقعی دکھ ہو؟“ وہ خود پر قابو پا کر
 بولی۔

”ہونہ.....“ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائیں تو عروہ کو یوں لگا، جیسے وہ اس کا مذاق اڑا
 رہی ہوں، تبھی وہ طنزیہ انداز میں بولیں۔

”میری بھولی بیٹیجی سیاست میں مخالفوں کا دکھ اپنی خوشی ہوتا ہے اور معظم کو ہتا ہے کہ
 اب حالات بگاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں..... شاہ جی کس کے لئے سیٹ لڑیں گے ان کی تو نسل
 ہی ختم ہو گئی اور پھر حیدر کی کہاں سجاوٹ کے ساتھ بنتی تھی۔ آئے دن تو دونوں لڑتے بھڑتے
 تھے۔ اب شاہ جی کس کے لئے دشمنیاں پالیں گے اس لئے سوچا ہوگا کہ چلو دوستی کا فائدہ
 اٹھائیں پہلے بھی تو شاہ جی حیدر کو ہی ایک سیٹ پر لڑا رہے تھے۔ سجاوٹ کے بالقابل اور اب تو
 میدان صاف ہے۔“ پھو کے زہر آلود لہجے پر عروہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ چاہتے
 ہوئے بھی ان تلخ حقیقتوں کی نفی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا دل بوجھ سے بھر گیا تھا، لیکن وہ چاہتے
 ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے بے چارگی سے بولی۔

”پھو ہمیں باہر چلنا چاہئے۔ حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی ہے، کہیں کوئی گھومتا ہوا
 ادھر ہی نہ آجائے اور ہمیں خواہ مخواہ صفائیاں دینی پڑیں۔“ انہوں نے بے دلی سے سر ہلایا اور
 آگئیں کا ریڈور میں متوحش انداز سے گوگی کو بھاگتے دیکھ کر وہ فوراً خشکیں، وہ ہانپتی ہوئی ان
 کی طرف ہی آ رہی تھی۔

”بی بی! وہ چھوٹی بیگم صاحبہ کو پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر دیواروں پر مار
 رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں، مجھے صنفیہ بی بی کے حجرے میں چھوڑ آؤ۔“

”کیا.....؟“ وہ دونوں بری طرح چونکیں۔

”بھابی بیگم کا دماغ تو نہیں چل گیا جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں..... ساری زندگی
 انہوں نے صنفیہ کے حجرے میں جھانک کر نہیں دیکھا اور قرآن پاک سے اس کی شادی میں
 وہی پیش پیش تھیں، اب کہاں سے صنفیہ کی محبت ان کے دل میں اٹھ آئی۔“ وہ حد درجہ ہتھاری
 سے بولی تھیں۔

تھا۔ دیگ پر چاول پلیٹوں میں ڈالتی بختو بی بی کی حالت قابل دید تھی، وہ پسینے میں بیٹھی ہوئی گاؤں کی دیہاتی اور غریب عورتوں کو حیا دلاتے ہوئے پلیٹیں بھر بھر کر دے رہی تھی۔

”کم بختو! کچھ تو حیا کر لو مرگ والا گھر ہے اور تم لوگ اپنے پیٹ یوں بھر رہی ہو جیسے

شادی کا کھانا ہو.....“

”تو کیا کریں..... کبھی کبھی تو بوٹی کی شکل دیکھنے کو ملتی ہے تب مرگ والا گھر بھی شادی والا گھر لگنے لگتا ہے۔“ سراج الدین کبھار کی لہری بیٹی لالابی انداز میں بولی تھی۔

”ادھر آ کجنت یہ دیگ کا چچ تیرے دوزخ جیسے پیٹ پر ماروں تیرے ہوش ٹھکانے آئیں گے۔ یہ جو تو بوٹیوں کا پھاڑ بنا کر اپنی پلیٹ میں کھڑی ہے یہی تیرے سر پر دے ماروں گی تب تجھے مرگ والے اور شادی والے گھر کا پتا چلے گا.....“ بختو مائی روہینہ بی بی کو دیکھ کر شیر ہوئی اور دانستہ اونچی آواز میں بولی۔ سراج کبھار کی بیٹی نے سر اٹھا کر دیکھا اور سامنے چوبلی کی بی بی کو دیکھ کر وہ مرغ کی ٹانگ منہ میں ڈالنا بھول گئی، روہینہ پھوپھو نے کوفت سے اس کے دونوں چاولوں سے بھرے ہاتھوں کو دیکھا اور دانستہ خاموش رہیں۔

”بختو یہ ونڈی کر کے جلد اندر آ اور باورچی خانے کو سنبھال وہاں بھی اودھم مچا ہوا ہے۔“ روہینہ بی بی کے بیزار لہجے پر بختو نے فخریہ نظروں سے اپنے ارد گرد نیچے بیٹھی خواتین کو دیکھا اور خوشامدی لہجے میں بولی۔

”بس بی بی! آپ فکر مند نہ ہوں، بختو ایک کھنٹے میں سارا پھیلاوا سمیٹ لے گی۔“ جبکہ وہ دونوں سر ہلاتی مدیحہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں جہاں سے شور کی آواز اب باہر آ رہی تھی۔

”ہماری بھالی صاحبہ بھی پورا ڈرامہ ہیں۔“ روہینہ پھوپھو آج نہ جانے کیوں اتنی تلخ ہو رہی تھیں سامنے سے گوگی بھاگتی ہوئی ایک دفعہ پھر اندر آ رہی تھی۔

”یہ منحوس پھر کوئی منحوس خبر ہی لے کر آ رہی ہوگی اب کیا مصیبت آ گئی؟“ وہ پھر چل ہوئیں۔

”بی بی وہ دلاور صاحب ڈاکٹر لے کر اندر آ رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں سب بیمار

پردہ کر لیں۔“ گوگی نے ڈرتے ڈرتے اطلاع دی۔

”ہونہہ.....“ روہینہ پھوپھو نے غصے سے سر جھٹکا۔ ”اب ان بڑھی بیبیوں کو کس نے دیکھا

ہے جو پردے کرتی پھریں۔“ یہ کہہ کر وہ بے جی کے کمرے میں گھس گئیں جبکہ عروہ نے اپنے کمرے کی راہ لی۔ حالانکہ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ ایک نظر اس دھن جان کو دیکھ لے جس کی شکل دیکھنے کو وہ آج کل ترس گئی تھی۔

شام آٹھ بجے ہوش میں آتے ہی مدیحہ بیگم بالکل خاموش تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے گوشتے کا گڑ کھایا ہو۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ بس ٹکڑ ٹکڑ کمرے میں آنے والے کینوں کو دیکھتی رہتیں اور کسی بھی سوال کا جواب نہ دینے کی گویا انہوں نے قسم کھا رکھی تھی۔

عروہ اریہ اپنے کمرے میں تھیں جب انہیں گھر کی ملازمہ نے اطلاع دی کہ شاہ جی زمان خانے میں آ رہے ہیں۔ وہ حیدر کی وفات کے بعد آج پہلی دفعہ ادھر آ رہے تھے درندہ ان کا قیام زیادہ تر مردان خانے میں تھا جہاں وہ دلاور کے ساتھ آنے والے مہمانوں سے مل رہے تھے اور حد درجہ معرفت کی وجہ سے وہ ادھر والی سائیڈ پر نہیں آسکے تھے البتہ خاص ملازموں کے ذریعے ان کے احکامات پہنچتے رہے تھے۔ عروہ نے اچھی طرح چادر لی اور اریہ کے ساتھ دالان خانے کی طرف نکل آئی۔ وہ ابھی ہال کمرے کی طرف پہنچی ہی تھیں کہ سامنے سفید کاشن کے شکنوں سے پُر لباس میں بلیک شال کندھوں پر ڈالے شاہ جی انتہائی افسردہ اور رنجیدہ حالت میں آ رہے تھے۔

عروہ نے پہلی دفعہ ان کے جھکے ہوئے کندھے اور سر دیکھا تھا۔ وہ حد درجہ بڑ حال اور دلگرفتہ تھے۔ باپ کی یہ حالت ان دونوں بہنوں نے پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ ہمیشہ سے اپنی بیٹیوں سے ایک فاصلے پر رہے تھے۔ ان کی ماں بتاتی تھی کہ سونہ آپی بچپن میں ان کی خاصی لاڈلی تھیں لیکن پھر حیدر کے آجانے کے بعد وہ بس پشت چلی گئیں۔

”بابا.....“ اریہ لپک کر ان کے پاس پہنچی۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ عروہ نے دیکھا ان کی آنکھیں حد درجہ سرخ تھیں وہ ضبط کی کڑی منازل کو چھو کر آئے تھے۔

”بابا..... ہمارا بھائی!“ اریہ اونچی آواز میں باپ کو دیکھ کر جذباتی ہوئی اور اگلے ہی لمحے وہ غیر ارادی طور پر ان کے بازو سے لگی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

”اللہ سائیں کی مرضی تھی..... ہم تو اس کی مرضی کے تابع ہیں۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پہلی دفعہ اتنی محبت نری لیکن رنجیدگی کے ساتھ بولے تھے۔ ان کے چہرے کے

ہر نقش سے اداسی، تکلیف اور اذیت جھلک رہی تھی۔ وہ انتہائی شکستہ حال لگ رہے تھے اور پہلی دفعہ انہوں نے اپنے احساسات کو چھپانے کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ان کے ہر انداز سے بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔

”اریبہ بابا کو اندر آنے دو! انہیں کیوں پریشان کر رہی ہو؟“ گفتہ بیگم نے نرمی سے اسے ٹوکا جو بلک بلک کر رو رہی تھی۔ عروہ کی آنکھوں سے بھی روانی سے آنسو بہہ رہے تھے جبکہ شاہ جی نے آنکھ کے اشارے سے انہیں منع کیا اور اسے ساتھ لگائے ہال میں داخل ہو گئے جہاں بے جی اور روبینہ پھوپھی ہوئی تھیں وہ بے جی کے تحت پر آ کر بیٹھ گئے۔

اریبہ پہلی دفعہ باپ کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی۔ اس کے رونے کی شدت میں کمی آچکی تھی۔ بے جی کی بوڑھی آنکھوں میں بھی آنسو تھے، لیکن وہ بھی بہت ضبط سے بیٹھی تھیں۔ اپنا جھروں زدہ ہاتھ انہوں نے بیٹے کے شانے پر رکھ کر دلاسا دیا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھیں لیکن ان کے ہاتھوں کا لمس اور ان کی زبان شاہ جی خوب جانتے تھے۔ وہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے اور بہت لاڈ لے بھی۔

”بس بے جی اللہ کے کام ہیں۔“ وہ کافی دیر کے بعد صرف اتنا ہی بولے تھے جبکہ بے جی صرف گہری سانس بھر کر رہ گئی تھیں۔ ایک محسوس کی جانے والی خاموشی کا وقفہ ہال میں آ گیا تھا۔ شاہ جی کسی گہری سوچ میں تھے۔ سب سے پہلے بے جی نے ہی اس خاموشی کے جوہر کو ختم کیا اور آہستگی سے بولیں۔

”بیٹا! مدیحہ کا کہیں کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں آ رہی۔ روز بروز اس کی حالات خراب ہوتی جا رہی ہے۔ آج شام سے منہ کے کمرے میں ہے اور باہر آنے کو تیار ہی نہیں۔“

”بے جی اسے فی الحال اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ صدمہ خاصا گہرا ہے۔ اسے حقیقت قبول کرنے میں ابھی وقت لگے گا۔“ شاہ جی کا لہجہ مکمل سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔“ بے جی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر کچھ یاد آنے پر بولیں۔

”میں نے سنا ہے کہ معظم آیا تھا آج؟“ روبینہ پھوپھو نے چونک کر اپنی ماں اور بھائی کے سنجیدہ چہروں کو غور سے دیکھا۔

”ہوں.....“ وہ بوجھل پن سے بولے۔

”اب کیسے خیال آ گیا اسے؟ کیا ہماری بے بسی کا تماشا دیکھنے آیا تھا؟“ بے جی کے طعنے لہجے پر روبینہ پھوپھو نے انتہائی ناگواری سے انہیں دیکھا۔ انہیں یہ بات قطعاً پسند نہیں آئی تھی۔

”دنیا داری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے اور پھر ایکشن سر پر ہیں اور معظم کو لوگوں کی ہمدردیاں اور ستائش سمیٹنے کے سارے طریقے آتے ہیں اور وہی ہوا، سیاسی حلقے اس کی اعلیٰ قدرتی کوسراہ رہے ہیں۔“ شاہ جی کے تلخ لہجے پر روبینہ پھوپھو نے یوں بھائی کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ ”رسی جل گئی پر پل نہ گیا۔“

”ضروری تو نہیں کہ ایسا ہو، ہمیں کسی کی نیت پر شک کرنے کا کوئی حق نہیں اور پھر آپ اور معظم بھائی آپس میں فرسٹ کزنز ہیں، دونوں کی رگوں میں ایک ہی خاندان کا خون ہے۔ اختلافات، لڑائیاں اور رجحانات اپنی جگہ لیکن اتنا بڑا صدمہ ہے، ان لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ تکلیف ہوئی ہوگی، جو وہ لوگ یہاں تک آئے اور دلاور بنا رہے تھے کہ سب سے پہلے پہنچے بھی معظم بھائی تھے.....“ گفتہ کی جرأت اور صاف گوئی نے روبینہ پھوپھو کے دل کا ملال خاصا کم کر دیا تھا۔ تبھی ان کے چہرے کے تاثرات خاصے تبدیل ہو گئے تھے ورنہ پہلے ناگواریت کا عنصر نمایاں تھا۔

”گفتہ بیگم تم سیاست کے جھکندوں کو نہیں جانتیں۔ اس میں سب سے اہم چیز اقتدار ہوتی ہے۔ اس کے بعد رشتے ناتے.....!“ شاہ جی کا لہجہ خاصا نرم لیکن الفاظ خاصے ترش تھے۔ گفتہ بیگم نے استہزاء سے مسکراہٹ سے انہیں دیکھا اور اب بڑے جاندار لہجے میں گویا ہوئیں۔

”شاہ جی برا مت مانجے گا۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف سے بتائیں کہ یہی حادثہ خدا خواستہ بلا دل یا سجادوں میں سے کسی کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو کیا آپ بھی صرف دنیا داری اور میڈیا میں واہ واہ سیٹھنے کے لئے مبارک پور جاتے؟“ گفتہ بیگم کے دو ٹوک انداز پر ایک لمحے کو تو شاہ جی کچھ بول ہی نہ سکے لا جواب ہو کر انہوں نے اپنے دل کو ٹولا تو وہاں صرف دکھ اور تکلیف کا احساس بلکورے کھا رہا تھا۔ وہ اس دفعہ واقعی کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ یہی حال بے جی کا تھا جن کا منہ ان کی بات پر کھلا کا کھلا رہ گیا تھا اور انہیں اپنی تھوڑی

پمپ پر صرف ایک ہی گاڑی والا گیس بھردار ہوا تھا، جس کی پشت سروہی کی طرف تھی۔
 ”ایکسکیوز می! یہاں سے گھاس مل جائے گا۔“ سروہی نے گیس پمپ کے ایک ملازم
 سے دریافت کیا۔ ملازم کے پاس کھڑے شخص نے بے اختیار اس کی آواز پر پلٹ کر دیکھا اور
 خوشگوار حیرت میں گھر گیا۔

”ارے آپ..... یہاں کیسے؟ اور کیا آپ اکیلی ہیں..... آپ کی گاڑی نظر نہیں
 آ رہی؟“ دلاور کو اسے دیکھ کر شدید حیرت ہو رہی تھی کیونکہ یہ خاصی ویران سڑک تھی، جبکہ
 سروہی نے اپنی حیرت کو بڑی مہارت سے چھپا لیا تھا، لیکن دل ہی دل میں اسے ایک شناسا
 بندہ دیکھ کر خاصی خوشی ہو رہی تھی۔

”بھئی بڑی کمال کی یادداشت ہے تمہاری؟ تم نے مجھے پہچان لیا۔“ وہ اب خوشگوار لہجے
 میں کہہ رہی تھی، جبکہ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”بھئی ایکسیڈنٹ والا واقعہ کوئی ایسا بھی پرانا نہیں بہ مشکل دو ماہ ہوئے ہوں گے اور پھر
 آپ نے تو میرے اوپر کافی احسانات کیسے تھے اور میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ میں
 احسان فراموش بندہ نہیں۔“

”گڈ.....“ سروہی نے تو صغی نظروں سے اسے دیکھا اور صاف گوئی سے کہا۔ ”حالانکہ
 میرا خیال تھا کہ اگر تم سے دوبارہ کبھی سامنا ہوا تو تم مجھے پہچاننے سے انکار کر دو گے اور میرے
 یاد دلانے پر صاف مکر جاؤ گے کہ کہیں میں تم سے اسپتال کا بل نہ مانگ لوں۔“

”استغفر اللہ! آپ میرے بارے میں اتنی غلط سوچ رکھتی ہیں۔ سن کر خاصا صدمہ
 ہوا۔“ وہ مصنوعی تاسف بھرے انداز میں بولا تو وہ بھی جواباً اسی انداز میں بولی۔

”زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج کل لوگوں کا پتا چلتا ہے اور ویسے بھی میں
 لوگوں سے زیادہ توقعات نہیں رکھتی۔“ وہ اس کے یوں خفا ہونے پر مزہ لے کر بولی۔

”خاتون! آپ کبھی نہیں سدھر سکتیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”مجھے معلوم ہے اس لئے خبردار ایسی کوئی کوشش مت کرنا۔“ سروہی نے وارننگ بھرے
 انداز میں کہا اور پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

”ویسے موصوف آج جا کہاں رہے ہیں؟“
 ”ملتان.....“ دلاور کے جواب پر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

دیر پہلے کی کبھی ہوئی بات پر اب شرمندگی ہو رہی تھی۔ پورے ہال میں صرف روہینہ پھپھوتھیں جو
 پُرسکون اور مطمئن تھیں۔ انہیں نہ جانے کیوں لگ رہا تھا کہ ان کی پیاسی مٹا سیراب ہونے
 والی ہے۔

* * *

وہ دور تک جاتی ویران سڑک کو دیکھ کر خود کو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے دل ہی دل میں
 اور اب بلند آواز میں کوس رہی تھی۔ سروہی کو گھر سے نکلے اڑھائی گھنٹے ہو چکے تھے۔ ایک تو
 بڑی مشکل سے بھانہ کر کے اس نے بابا سے ایک دن کی چھٹی لی تھی اور ان کو یقین دلایا تھا کہ
 وہ ساہیوال کے پاس ہڑپہ کے کھنڈرات پر ایک ڈاکو مٹری فلم بنانا چاہتی ہے چونکہ یہ کوئی
 سیاسی ایٹھ نہیں تھا، اس لئے بابا نے اسے بخوشی اجازت دے دی تھی۔ رات رکنے کے معاملے
 میں وہ کچھ پس و پیش کر رہے تھے لیکن سروہی نے ساہیوال میں مقیم اپنی ایک یونیورسٹی فیلو جس
 کے ساتھ اس کی اچھی دوستی تھی۔ اس سے بات کر کے ان کی خاصی تسلی کروا دی تھی، لیکن
 ایک معاملے میں اس نے جھوٹ بولا تھا۔ ان کو اس نے بھی بتایا تھا کہ ایک فوٹو گرافر اور اس
 کی ایک اسسٹنٹ بھی ساتھ ہوگی، لیکن چونکہ اس کا مقصد راحیلہ جلول کے گاؤں جانے کا تھا
 اس لئے وہ اکیلی ہی تھی اور بس اسسٹنٹ پر ایک رواں لگی کے لئے بالکل تیار عام سی بس میں بیٹھنے
 کی غلطی کر بیٹھی اور ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد شارٹ کٹ کے چکر میں وہ بس ایک ویران سڑک
 پر نہ صرف خراب ہو چکی تھی بلکہ فالت بھی ایسا تھا کہ وہیں پر ٹھیک کرنا ممکن نہیں تھا۔

سوار یوں کی گالیوں اور غصے سے تنگ آ کر ڈرائیور نے کافی سوار یوں کو ایک اور بس
 میں سوار کروا دیا تھا، جو وہیں سے گزر رہی تھی لیکن جگہ کم ہونے کی وجہ سے بہت سے مسافر
 وہیں سڑک پر کھڑے تھے۔ سروہی نے تنگ آ کر خود ہی اکیلے چلنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑا سا
 چلنے کے بعد وہ تھک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی پیروی میں کچھ اور لوگ انتظار کی کوفت سے تنگ
 آ کر چلنے لگے تھے۔

جون کا مہینہ تھا اور سورج سوائیز پر گرمی اور تپش نے برا حال کر رکھا تھا۔ چلتے چلتے
 وہ ایک سی این جی اسٹیشن پر رک گئی۔ ایک چھوٹا اور ویران ساسی این جی پمپ دیکھ کر اسے
 یہاں ویرانے میں پمپ بنانے والے شخص کی بے وقوفی پر سخت غصہ آیا۔ وہ اسے دنیا کا احمق
 ترین انسان لگا تھا۔ پمپ کے پاس پانی کا ٹل دیکھ کر اس کی پیاس جاگ اٹھی۔ اس وقت اس

”اور آپ کہاں جا رہی ہیں؟ آپ کی گاڑی کہاں ہے؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”جناں ہم ساہیوال جا رہے ہیں اور گاڑی گھر پر ہے بابا لے روٹ پر بالکل ڈرائیونگ کرنے نہیں دیتے حالانکہ میری ڈرائیونگ کی مہارت کے تم سب سے بڑے گواہ ہو۔“ وہ سینے پر بازو لپیٹتے ہوئے شرارتی انداز میں گویا ہوئی۔

”اچھا! تو کیا آپ لاہور سے پیدل آ رہی ہیں؟“ دلاور نے بھی خوشگوار لہجے میں پوچھا۔ اسے نہ جانے کیوں اس سے دوبارہ اچانک ملنے کی خاصی خوشی ہو رہی تھی جو اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔

”پیدل تو نہیں! ایک کھٹارا بس پر سفر کا آغاز کیا تھا۔ جس نے یہاں سے ایک کلومیٹر پہلے ہی چلنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب کسی سواری کی تلاش میں پیدل چلتے چلتے یہاں تک آ پہنچی جہاں تم مل گئے اور اب باقی سفر تمہاری اس خوب صورت بی ایم ڈبلیو میں کروں گی۔ مجھے یہاں کسی قسمی بس اسٹاپ پر اتار دینا جہاں سے ہم دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کر سکیں۔“

”آپ مجھے شکل سے اچھی خاصی سمجھدار اور ایجوکیٹڈ لگتی ہیں۔ آپ کو ساہیوال آنے کے لئے یہی تھرڈ کلاس بس ملی تھی؟ آرام سے DAEWOO پر بیٹھیں اور کچھ ہی گھنٹوں میں ایک آرام دہ سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچ جائیں۔“ دلاور کو پہلی دفعہ اسے ڈانٹنے کا موقع ملا تھا جو اس نے بالکل ضائع نہ ہونے دیا جبکہ وہ اس بات پر مصنوعی غصے سے پہلے تو کچھ دیر گھورتی رہی اور پھر بولی۔

”ایڈونچر میری طبیعت کا حصہ ہے اور میں رسک لینے سے نہیں ڈرتی! میں نے زیادہ ابا جی بننے کی ضرورت نہیں! بس اسٹاپ تک چھوڑنا ہے تو ٹھیک! ورنہ خواہ مخواہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا ٹائم ضائع ہو رہا ہے۔“ اس نے رسٹ وایج میں ٹائم دیکھا تو وہ چڑ گیا۔

”کسی دن یہ ایڈونچر آپ کے ایسے گلے پڑے گا..... لگ پتا جائے گا! آپ کی والدہ آپ کی حرکات پر کچھ نہیں کہتیں؟“ والدہ کے نام پر سروہی کے چہرے پر تاریک ساسایہ دوڑ گیا! لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا لیکن اب اس کے لہجے میں خاصی سنجیدگی تھی۔

”سری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”اوہ..... آئی ایم سوری۔“ اسے حقیقتاً فحش تھا۔ وہ اس کے احساسات کو سمجھ سکتا تھا۔

”جی! اسے اس ذہنی کیفیت سے نکالنے کے لئے دانستہ خوشگوار لہجے میں بولا۔“ ویسے آپس کی بات ہے کہ آپ میرے ساتھ سفر کریں گی۔“

”کیوں..... تم کیا کاٹتے ہو؟“ سروہی نے اس کی طبیعت صاف کی تو وہ گڑبڑا کر وضاحت دینے لگا۔

”اصل میں میری ڈرائیونگ آپ کے نزدیک خاصی مشکوک جو ہے۔“ سروہی نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر بولی۔

”تو تمہیں یہ خوشی بھی تھی کہ اگر میں ساتھ جاؤں گی تو تب بھی ڈرائیونگ تم ہی کرو گے! سبحان اللہ.....!“

سروہی کے طنزیہ مگر خوشگوار انداز پر دلاور کے حلق سے بے اختیار تہقہہ بلند ہوا اور اس نے دلچسپ نظروں سے اس دھان پانی لڑکی کو غور سے دیکھا۔

”دیری گڈ..... بہت اچھا جا رہی ہیں آپ۔“ دلاور کا انداز تو صمیمی تھا۔

”میں بہت اچھا نہیں بلکہ تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔ اب مزید میرا ٹائم ضائع مت کرو اور گاڑی کی چابی مجھے پکڑاؤ.....“ اس کے ہٹ دھرم انداز پر دلاور نے ہاتھ میں پکڑی چابی بے اختیار اسے پکڑا دی اور وہ بھی رکی نہیں۔ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسے اندر کے ٹھنڈے ماحول نے خاصا تروتازہ کر دیا تھا۔ اسے سی کی ٹشڈک اس گرم اور حدت والے موسم میں بہت خوشگوار اور بھلی لگ رہی تھی۔

”اور سناؤ کیسی گزر رہی ہے اور گاڑی تو بہت زبردست ہے تمہاری.....“ سروہی نے بیٹھتے ہی اندر کا بغور جائزہ لے کر ستائشی انداز میں کہا۔

”میری نہیں! شاہ جی کی ہے۔“ دلاور کی صاف گوئی پر وہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”اور سناؤ کیا حال چال ہیں تمہارے شاہ صاحب کے.....؟“ وہ گاڑی کی بڑی مہارت سے چلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی جبکہ دلاور نے اس کے بے پردا لہجے پر الجھن بھرے انداز سے اسے دیکھا اور سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”کیا طنز کر رہی ہیں آپ؟“

”کیا مطلب.....؟“ وہ بری طرح الجھی اور گاڑی کی اسپید خود بخود کم کر دی۔ ”میں

کیوں طنز کرنے لگی؟ میں نے تو یونہی ہائی داوے پوچھا ہے تمہیں برا لگا تو آئندہ

”افسوس ہوا۔“

”واقعی آپ کو افسوس ہوا؟“ دلاور کو حیرت ہوئی۔

”کیوں..... میں انسان نہیں ہوں؟“ اس نے مہارت سے گاڑی چلاتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ آپ اس کو پسند جو نہیں کرتی تھیں.....؟“ دلاور نے صاف گوئی سے اپنا خیال بتایا تو ایک میٹکی سی مسکراہٹ سروعی کے چہرے پر پھیل گئی۔

”میں لوگوں سے نہیں ان کے اندر موجود برائیوں سے نفرت کرتی ہوں۔ وہ جس بھی کردار کا حامل تھا، لیکن اس طرح کسی کی موت کی خبر باعثِ افسوس ہے اور مجھے جتنا دکھ حیدر کی وفات کا ہے، اتنا ہی اس کی پارٹی کے تین درکرز کے انتقال کا بھی ہے۔“ سروعی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”خیر تمہارے شاہ صاحب کا کیا ردِ عمل ہے؟ اور اس واقعے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں.....؟“

”ہاں بہت اچھی طرح۔“ دلاور کے جواب پر وہ بری طرح چوکی۔

”کون.....؟“ اس نے سوالیہ انداز میں اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

”رہسلی کا منگیترا، اس نے جذبہ انتقام و رقابت کی وجہ سے ایسا کیا اور موقع پر ہی گرفتاری دے دی۔“

”اوہ.....“ سروعی کے ذہن کی الجھن سلجھ گئی۔

”اب اس خبر پر میں کیا تبصرہ کروں؟“ سروعی نے کندھے اچکا کر سامنے کالی سڑک کو دیکھتے ہوئے گاڑی کی اسپید بڑھائی۔

”کوئی بھی تبصرہ نہ کریں، یہ بتائیں کہ ساہیوال کس سلسلے میں اکیلے جارہی ہیں؟“ دلاور نے گفتگو کا موضوع تبدیل کیا۔

”جہاں تک بات اکیلے جانے کی ہے تو میں ہر جگہ اکثر اکیلے ہی جاتی ہوں اور جہاں تک سلسلے کا تعلق ہے تو بس کچھ معلومات کی تلاش تھی۔“

”اوہ.....“ دلاور بری طرح چونکا۔ ”کیا کوئی خاص موضوع ہے.....؟“ ٹی وی کے لئے پروگرام کرنا ہے یا کوئی فہر لکھتا ہے؟

”کسی کے لئے بھی کچھ نہیں کرنا، بس اس دفعہ اپنی ذات کی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے

تمہارے..... محترم سائیں کے بارے میں نہیں پوچھیں گے“ اسے بھی غصہ آ گیا تھا۔

”اچھا“ میں سمجھا کہ طفر کر رہی ہیں۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”کیوں.....؟“ سروعی نے حیرانی سے اسے دیکھا، جیسے اس کی خرابی دماغ کا یقین

آ گیا ہو، جبکہ دلاور اپنے سابقہ سنجیدہ انداز سے گویا ہوا۔

”ظاہر ہے ان کا وہی حال ہوگا جو ایک جوان اور اکلوتے بیٹے کی وفات پر ایک باپ کا ہو سکتا ہے۔“ وہ اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا تھا۔

”کیا مطلب..... کون سے جوان بیٹے کی موت؟“ سروعی کو حیرت کا شدید جھکاوا تھا۔ دلاور نے اپنا انداز نشست بدلے بغیر گردن موڑ کر اس کے چہرے پر پھیلی حیرت کو غور سے دیکھا وہ کسی طور مصنوعی نہیں تھی۔

”حیرت کی بات ہے کہ میڈیا سے تعلق رکھنے والی خاتون اتنی لاعلم..... میں نہیں مان سکتا۔“ دلاور کے مذاق اڑاتے لہجے پر سروعی کو تھوڑی سی، خجالت محسوس ہوئی تھی وہ سلگ کر بولی۔

”مسٹر میڈیا کے بندے خدا تھوڑی ہوتے ہیں، انسان ہی ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے بھی بیسیوں مسئلے ہو سکتے ہیں اور پھر میں تو پچھلے پندرہ دن سے کسی سے بھی رابطے میں نہیں۔ سیل فون میرا بند ہے، ٹی وی کے پروگرامز کی پیشگی تین ریکارڈنگز کے بعد میں اس سے بے فکر تھی اور گھر میں ٹی وی آج کل میرا بند ہے۔ اخبارات پڑھنے کا ٹائم نہیں ملا، آخر ہوا کیا ہے؟“ وہ بری طرح جھنجھلا رہی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو حیدر سائیں کے انتقال کی خبر نہیں.....“ دلاور کی اطلاع پر وہ ہٹکا جگا رہ گئی، اس کے پاؤں خود بخود دیریک پر آ کر رک گئے تھے۔

”کیا.....؟“ وہ حقیقتاً اس اطلاع پر بھونچکی رہ گئی۔

”کب..... کیسے؟“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ سخت حیران تھی۔

”آج سے تیرہ دن پہلے شاہ جی کے جلسے میں ہونے والی فائرنگ سے وہ اتفاق سے اسٹیج پر سامنے ہی بیٹھا تھا اور موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ اس کے ساتھ تین پارٹی درکرز بھی شدید زخموں کی تاب نہ لا کر چل بے آج کل تو یہ اخبارات اور ٹی وی کا ہاٹ ایڈ تھا۔“

”اوہ آئی سی۔“ سروعی نے ہونٹ سکڑے۔ ”مجھے حقیقت میں علم نہیں تھا، اپنی ہاؤس کر

سفر پر نکلی ہوں دعا کرو کام بن جائے۔“
 ”اللہ آپ کو اپنے نیک مقصد میں کامیاب کرے اگر آپ کو کبھی میری ضرورت ہو تو ضرور بتائیے گا مجھے دلی خوشی ہوگی۔“ دلاور کے پُر غلوس لہجے پر وہ ممنونیت سے مسکرائی۔
 ”وائے ناٹ.....!“

”اور ساہیوال میں کس جگہ جانا ہے آپ کو.....؟“ سروہی نے اپنے مطلوبہ گاؤں کا ہاتھ بتایا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بھئی دلاور اب ڈرائیونگ سیٹ پر تم آ جاؤ اتنی قیمتی گاڑی کو چلانے کا میرا کوئی تجربہ نہیں اور پھر میں یکسوئی سے کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔“ سروہی نے سڑک کے ایک طرف گاڑی روکی تو دلاور نے بھی انکار نہیں کیا اور اگلے ہی منٹ وہ بڑی مہارت کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا جبکہ وہ دوسری سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اب گہری سوچ میں مگن تھی۔

* * *

نایاب نے صبح سے گھر میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اس کا انگلیٹڈ کالکٹ آچکا تھا اور تھوڑی ہی دیر پہلے ممانے اسے اطلاع دی تھی کہ اسے پرسوں نہ صرف یہاں سے روانہ ہونا ہے بلکہ وہاں رملہ اس کے ایڈمیشن فارم اپنی ہی یونیورسٹی میں جمع کروا چکی ہے۔ وہ اتنے شارٹ نوٹس پر پاکستان چھوڑنے کی اطلاع پر بری طرح تھلا رہی تھی اور صبح سے پاؤں پیٹتے ہوئے پاپا کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات ضرور سنیں گے۔ تبھی ان کے گھر پہنچتے ہی وہ فوراً بیڈروم میں پہنچی لیکن سامنے ماما کو دیکھ کر بری طرح ٹھک گئی۔

”ہاں..... ہاں ضرور آؤ“ تمہیں تو یہی معلوم ہوگا کہ میں کلینک پر ہوں اور اب مجھے سامنے دیکھ کر رک کیوں گئی آؤ آکر اپنے پاپا سے میری شکایت کرو تا کہ تمہیں کوئی حسرت نہ رہے۔“ ماما کے سرد لہجے پر وہ ایک لمحے کو خجالت میں مبتلا ہوئی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے سر کو جھٹکا اور لاڈ بھرے لہجے میں باپ سے مخاطب ہوئی۔

”پاپا مجھے انگلیٹڈ نہیں جانا۔ آپ کو ہوتا ہے ناں کہ مجھے رہائش کے لئے پاکستان کے علاوہ کوئی اور ملک پسند نہیں۔“ جشن نعمان نے غور سے اپنی ضدی کا خفا خفا سا چہرہ دیکھا اور غل بھرے انداز میں بولے۔

”تو مت رہو کون کہتا ہے کہ رہو ہم تو تمہیں اسٹڈیز کے لئے بھیج رہے ہیں۔“ نایاب

نے بری طرح چونک کر ان کے لفظ ہم کو سنا اور باپ کے چہرے پر جا بھتی ہوئی نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ پاپا کو اچھی طرح بریف کیا جا چکا ہے اور اسی سوچ نے اسے بری طرح کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔

”لیکن پاپا اسٹڈیز تو میری یہاں پر بھی جاری ہیں فرسٹ سمسٹر کا رزلٹ آچکا ہے اور میری اچھی خاصی پرنسٹن ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”تو ہم نے کب کہا کہ پرنسٹن ٹھیک نہیں..... جب رملہ اور رمیض باہر سے ڈگری لے کر آئیں گے تو تم جانتی نہیں ہو کہ ان کا فوجی کتھا براٹ ہوگا اور عائش بھی اچھی جگہ سیٹ ہو چکا ہے۔ تم خالی ماسٹرز کی ڈگری لے کر کیا کروں گی۔ یہاں ہزاروں لوگ رُلتے پھر رہے ہیں۔“ جشن نعمان نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سابقہ متحمل انداز میں کہا جبکہ مسز نعمان اپنے ہاتھوں پر کیوکس لگانے میں مصروف تھیں۔ وہ بظاہر بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن ان کے کان دونوں باپ بیٹی کی گفتگو کی طرف تھے۔

”پاپا آپ کو پتا ہے کہ جاب میری پراہلم نہیں ہے۔ آپ لوگ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔ میں بس پاکستان سے جانا نہیں چاہتی۔ آپ کے اور ماما کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“ نایاب نے انہیں جذباتی کرنے کے لیے دوسرا حربہ آزمایا۔ اسے معلوم تھا کہ آگے جشن نعمان تھے اور وہ ان سے دلائل میں کبھی بھی نہیں جیت سکتی۔

”نو پراہلم.....“ انہوں نے آرام سے کہا۔ ”تمہاری ماما کچھ عرصے کے لئے تمہارے ساتھ چلی جائیں گی اور میں بھی ہر دوسرے ماہ چکر لگا لیا کروں گا اور پھر رملہ اور رمیض بھی وہیں ہیں تمہیں تمہاکی کا احساس بھی نہیں ہوگا۔“ نایاب نے ناراض نظروں سے ماں اور باپ کو دیکھا اور جھنجھلا کر بولی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دونوں پہلے سے طے کیے ہوئے ہیں کہ مجھے پاکستان سے ہر صورت میں بھیجنا ہے۔ آخر ماما آپ مجھے یہاں سے کیوں زبردستی بھیجنا چاہتی ہیں؟“

”نایاب.....“ جشن نعمان نے تنبیہی لہجے میں اسے گھر کا تو اس اس نے شکایتی نظروں سے باپ کو دیکھا۔ ”مت بھولو کہ تم کس سے مخاطب ہو۔ ہم دونوں نے اپنے بچوں کو آزادی ضرور دی ہے لیکن ان کو شتر بے مہار کی طرح بھی نہیں چھوڑا اور آپ کس اشائل میں اپنا ماما سے بات کر رہی ہیں آپ ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئیں کہ اپنے فیصلے خود کر سکیں۔ رمیض

عاش اور رملہ کے لئے بھی ہم دونوں نے ہی فیصلہ کیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے اور کیا وہ غلط تھا.....؟ تو پھر آپ اپنے لیے کیوں اتنی بے اعتبار ہو رہی ہیں؟“ جشس نعمان کے سخت اور دو ٹوک لہجے پر وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور پھر انگلیاں ملتے ہوئے دانستہ نرم لہجے میں گویا ہوئی۔

”پاپا میں ایسا کب کہہ رہی ہوں؟“

”تو پھر یہ بتائیں کہ آپ کو یہ فیصلہ ماننے میں اتنی ہچکچاہٹ کیوں ہے؟“ وہ سابقہ انداز میں مخاطب تھے اور ان کی جا بختی ہوئی نظریں بیٹی کے تئیں بہت جلد بھانپ گئی تھیں۔

”اُس اوکے“ ایز پووش.....!“ وہ کندھے اچکا کر فوراً کمرے سے نکل گئی جبکہ مسز نعمان کی فکر مند نظروں نے اپنے شوہر کے چہرے کا احاطہ کیا جس پر پریشانی کے رنگ نمایاں تھے۔

”تمہارا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے“ لیکن اس پر گہری نظر رکھو۔ یہ جو اتنی آسانی سے مان گئی ہے اس کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی سوچ ہے اور وہ سوچ کیا ہے؟ اس کا اندازہ تمہیں خود کرنا ہوگا۔ وہ میری ضدی اور خود سر بیٹی ہے اور میں اس کی طبیعت سے بہت اچھی طرح آگاہ ہوں یہ یقیناً اب اس لڑکے سے رابطہ کرے گی۔“ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی ملتے ہوئے انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ مسز نعمان ہاتھ میں پکڑی نیل پالش بند کرنا بھول گئی تھیں جبکہ انداز میں حد درجہ بے چارگی تھی۔

”کیا کہہ سکتا ہوں۔“ جشس نعمان کا لہجہ حد درجہ متشکر تھا جبکہ ان کی سوچ کے عین مطابق نایاب نے سب سے پہلے اپنے بیڈ روم میں پہنچنے ہی بلاول سے رابطہ کیا تھا اور گہرے اداس اور متفکر انداز میں اسے اپنے والدین کے فیصلے کے بارے میں اطلاع دی اور پھر خود سے دوسری جانب بلاول کا اپنی زندگی پر مشتمل لائحہ عمل سننے لگی۔

* * *

”یہ لیس جناب آپ کا مطلوبہ گاؤں آگیا اور دادیں میری ڈرائیونگ کو جواتے کم نام میں آپ کو ساہیوال پہنچا دیا۔“ دلاور نے عین چوک پر جا کر گاڑی روکی تھی جبکہ یہ ایک چھوٹا سا چوک تھا جہاں چھوٹی چھوٹی کافی دکانیں تھیں۔ گاؤں کی حالت خاصی بہتر تھی اور زیادہ مکان کپے تھے۔ گاڑی کھڑی دیکھ کر کافی بچے دائیں بائیں آ کر دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگے۔

”بس ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ تمہارا بہت بہت شکریہ.....“ سروہی کی بے مروتی پر وہ ہکا بکا رہ گیا کچھ دیر کے لیے اور پھر ہوش میں آئے ہی چمک کر بولا۔

”دیے طوطا چشمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک تو اتنی دور لے کر آیا اور منزل پر پہنچنے ہی کیسے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں جیسے پہچانتی نہیں۔“ دلاور کے لڑاکا انداز پر سروہی کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو کیا اب گلے کا ہار بنا کر ساتھ ساتھ لیے پھروں یا پھر لاشی بنا کر ہاتھ میں پکڑ لوں۔“

”کیوں میری انسانی شکل بہت بری ہے کیا؟“ دلاور نے خفا خفا سی نظر اس پر ڈالی جو کہ چہرے پر آنے والی بے تاب ہنسی کو دانستہ چھپا رہی تھی۔

”پھر کیا چاہتے ہو تم؟“ اس نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔

”صاف بات ہے کہ میں اس گاؤں میں آپ کو اکیلے چھوڑ کر تو نہیں جاسکتا جیسا کہ آپ کے انداز سے صاف لگ رہا ہے کہ آپ یہاں پہلی دفعہ آئی ہیں اور پھر راستے میں بھی آپ نے بتایا تھا کہ آپ کی دوست شہر میں فریڈ ٹاؤن میں رہتی ہے۔ اب تو میں آپ کو کسی کے حوالے کر کے ہی جاؤں گا۔“ دلاور کے ہٹ دھرم لہجے پر سروہی نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا جو کسی طور بھی ٹلنے کے موڈ میں نہیں تھا اور اب بے پروائی سے بچوں کو دیکھ رہا تھا جو کہ گاڑی پر ہاتھ پھیر پھیر کر خوش ہو رہے تھے۔

”مرو نہ جاؤ۔“ وہ خفا انداز میں پھاڑ کھانے کو بولی۔ ”اور اب آنکھیں پٹر پٹر کر کے کیوں دیکھ رہے ہو۔ ان افلاطونوں سے پوچھو کہ یہاں پر انٹری اسکول کہاں ہے۔ اس کی پچھلی والی گلی میں جانا ہے۔“ دلاور نے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کو بہ مشکل روکا اور ٹیشہ نیچے کر کے ڈرائیونگ سیدھے لڑکے سے پوچھا تو وہ جوش و خروش سے بتانے لگا کہ یہاں ایک ہی اسکول ہے لیکن وہ پرائمری نہیں ہائی ہے۔ دلاور نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سگ کر بولی۔

”ظاہر ہے، سترہ، اٹھارہ سالوں میں وہ پرائمری اسکول ہائی اسکول بن گیا ہوگا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ دلاور کو بھی اس کی بات دل کو لگی۔

”ادھر آؤ بیٹا ہمیں وہاں تک چھوڑ آؤ گے۔“ دلاور کی آفر پر اس بچے نے بڑے جوش

”اوئے غلیل، تیری دادی برکتے کہاں ہے؟“

”آپ ایسا کریں کہ اندر آ جائیں۔ میں ابھی اپنی والدہ سے ملواتا ہوں۔“ وہ ان کے ملنے اور گاڑی سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا، جبکہ دلاور خاصی حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ انہیں اندر لے آیا تھا۔ گھر کا مگن کچا تھا اور نیم کے درخت کے ساتھ ایک طوطے کا بیجرہ لٹکا ہوا تھا، جس نے انہیں دیکھتے ہی شور مچا دیا تھا۔ سامنے ہی برآمدے میں بھی چارپائی پر ایک بوڑھا وجود لیٹا ہوا تھا۔ وہی دکا ندر بھاگ کر اندر سے موڑے لے آیا تھا اور اپنے بیٹے کو اس نے بوتلوں کے لئے بھی اشارہ کر دیا تھا۔

”خالہ پتر کون آیا ہے؟“ اس بوڑھی کمزور وجود کی خاتون نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح ایک طرف رکھی اور ہاتھ کا چھبنا کر انہیں غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں تحیر و استعجاب سا اترنا۔ شام ڈھل چکی تھی اور چاروں طرف پھیلا سکوت سروی کو اپنے اندر اترتا محسوس ہوا تھا۔ اسی دکا ندر نے سہارا دے کر اپنی بوڑھی والدہ کو بٹھایا اور مؤدب انداز میں بولا۔

”بے بے یہ شہر سے پروئے (مہمان) آئے ہیں اور کسی ماسٹر رفیق کے گھر کا پتا پوچھ رہے ہیں۔“

”ماسٹر رفیق.....!“ اب کہ چوکنے کی باری..... بے بے کی تھی۔
”اے بیٹی، تم ماسٹر رفیق کی کیا لگتی ہو؟ وہ بے چارہ تو بیٹی کے غم میں گل گل کر مر گیا۔“
بے بے کی بات پر سروی نے تڑپ کر انہیں دیکھا اور بے ساختہ ان کی چارپائی پر آ کر ان کا ہاتھ پکڑ کر بے تابی سے بولی۔

”آپ ماسٹر رفیق صاحب کو جانتی ہیں؟“

”لے بیٹا! کیسا عجیب سوال کر رہی ہو؟ دن رات کا آنا جانا تھا۔ اکو اک تو ان کی دمی تھی۔ کیا خوبصورت جوانی تھی! اس بچی کی لیکن موت ایسی ظالم شے ہے کہ یہ کہاں دیکھتی ہے۔ غالموں کو ذرا ترس نہ آیا۔ قبر میں اتار کر ہی سکون سے بیٹھے۔“ بے بے کا انداز شکست خوردہ اور لہجہ خاصا ٹوٹا ہوا تھا۔

”بے بے کون سا گھر تھا ان کا؟ اور اب وہاں کون رہتا ہے؟“ سروی کے چہرے ہاتھ کاٹ اور دگرنگی واضح نظر آ رہی تھی جبکہ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ دلاور چپ چاپ حیرت سے انہیں دیکھے جا رہا تھا، وہ مسلسل خاموش تھا۔

سے ہاں میں سر ہلایا اور فوراً کچھلی سائیڈ کا دروازہ کھولنے لگا۔

دروازہ کھلتے ہی تین چار اور بچے بھی زیر دستی اندر داخل ہونے لگے، ان کے چہروں پر خوشی اور بے تابی تھی جبکہ وہی بچہ ان کو سرانگیں میں ڈالنے لگا تو دلاور نے اسے فوراً منع کیا اور باقی بچوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے چہروں پر خوشی کے رنگ پھیل گئے اور وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہونے لگے۔

”یہ کیا بے وقوفی ہے؟“ سروی نے ہزاری سے یہ منظر دیکھا۔

”بھئی ہمارا کیا جاتا ہے جبکہ ان کے لئے تو یہ بہت انوکھی اور انتہائی مسرت کی بات ہے اور یہ اسے بہت عرصے تک یاد رکھیں گے۔“ دلاور نے نرم لہجے میں کہا اور گاڑی چلا دی۔
”ذرا ایسی حرکت اپنے علاقے میں کرنا پھر تمہارے شاہ جی تمہیں بتائیں گے۔“ سروی نے طنز یہ لہجے میں کہا تو اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”جہاں کر سکتا ہوں وہاں تو کرنے دیں نا.....!“

”آپ کو کس کے گھر جانا ہے؟“ وہی بڑا بچہ اب بڑا مدبر بن کر پوچھ رہا تھا۔

”بس اس گلی میں پہنچاؤ وہ گلی نمبر پانچ ہے نا؟“

”ہاں جی! میں اس گلی کے سب لوگوں کو جانتا ہوں۔“ وہ بڑے فخر سے بتانے لگا جبکہ دلاور نے اس بچے کی ہدایت پر گاڑی گلی نمبر پانچ کے شروع میں ہی روک دی۔ گلی کے کڑ پر ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی، جس پر ایک چالیس پینتالیس سال کا مرد بیٹھا ہوا۔ کوئی حساب کتاب کر رہا تھا۔ گاڑی کی آواز پر اس نے کھاتے کی کاپی بند کر کے تجسس انداز سے انہیں دیکھا۔

سروی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کا دل عجیب سی لے میں دھڑک رہا تھا۔ دلاور نے بھی اس کی پیروی میں دروازہ کھولا اور بچوں کو بھی باہر نکالا۔

”یہاں پر کوئی ماسٹر رفیق صاحب کا گھر تھا؟ آج سے کافی سال پہلے.....؟“

”ماسٹر رفیق.....!“ دکا ندر سوچ میں پڑ گیا اور پھر شرمندگی سے بولا۔ ”جی میں تو چند سال سعودی عرب میں رہ کر آیا ہوں۔ اپنی اماں سے پوچھتا ہوں۔ وہ کافی ضعیف ہیں لیکن حافظہ ماشاء اللہ بہت تیز ہے۔“ دکا ندر نے اپنی دکان کی کڑکی سے اندر جھانکا، یہ پرچون کی دکان اس نے گھر کی بیشک میں کھول رکھی تھی۔

”اے تو کہیں ماسٹر رفیق کی دوہتی (نواسی) تو نہیں؟“ وہ بری طرح چمک کر غور سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ اس کے سارے سوالوں کو بھلائے اب بھیکے لہجے میں اس کا بازو ہلا کر ایک ہی سوال کی گردان کیے جارہی تھیں۔

”تو“ ماسٹر فیکے کی دوہتی ہے نا؟ میں بھی کہوں یہ چہرہ دیکھا دیکھا کیوں لگ رہا ہے اے پتر خالد ذرا بھاگ کر اپنی بہن کو کی کو تو لے آ، وہ تو تیری ماں کی بہت گودھی (گہری) سہیلی تھی۔ دونوں نے اکٹھی شہر والے سکول سے دس جماعتیں پاس کیں۔ تیرے نانے کو تو بہت شوق تھا اپنی دمی کو پڑھانے کا۔ سچ پوچھو ہمارے اندر ہمت نہیں تھی اور تیری ماں بھی تو پورے پنڈ کی اکواک کڑی تھی ڈاکٹرنی کا امتحان پاس کر کے آئی تو تیرے نانا نے پورے پنڈ میں مٹھائی پائی دیسی گھی کے لٹو اور برنی اور سب کو فخر سے بتاتا پھر رہا تھا کہ میری دمی پہلے سال میں ففٹ آئی ففٹ (فرسٹ)۔“ بے بے کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور اب وہ ہچکچوں سے رو رہی تھیں۔

سروہی کا دل رنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ بے تابی اور بے چینی سے ان کے دونوں ہاتھ پکڑنے بڑی محبت اور عقیدت سے ان کے جھریوں بھرے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے خود ہتا نہیں چلا کہ کب آنسوؤں نے اس کے چہرے کا راستہ دیکھ لیا تھا جبکہ دلاور خود بھی بہت بے چینی سے اصل بات جاننے کا خطر تھا۔ بے بے کے بیٹے نے بوتلیں ٹرے میں رکھ کر ان کے سامنے رکھ دی تھیں اور خود بھی حیرانی سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس کی گمروالی دو بچوں کے ساتھ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ گھر میں صرف ایک پوتا تھا بے بے کا۔

”ماں جی یہ کو کی آنٹی کون ہیں؟“ سروہی نے بے تابی سے پوچھا تو وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بتانے لگیں۔

”میری سب سے بڑی دمی ہے دو گھر چھوڑ کر مسجد کے ساتھ والا گھر تیری ماں کا تھا۔ جب تیری ماں کے قتل کی خبر یہاں پہنچی تو تیرا نانا بس پاگلوں کی طرح چپ چاپ مسجد کی دیوار کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ وہ تو اس کے چوری چھپے نکاح کی وجہ سے بہت ناراض تھا، لیکن اس بد قسمت کو کیا پتا تھا کہ اس کی پھولوں جیسی موبہی دمی پر اتنے ظلم ہوئے، کرموں جلی کے بھاگ سو گئے اور بیو (باپ) کو پتا بھی نہ چلا نانی تیری تو تیری ماں کے بچپن میں پیسے سے مر گئی تھی۔ اسے تیرے نانے اور تیری ماں کی دادی نے مل کر پالا تھا، لیکن اپنی نادانی سے اپنی جہد گانی

رول گئی تیری ماں۔“ وہ بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھیں۔
”اب میرے نانے کے گھر میں کون رہتا ہے؟“

”مسجد کا امام اور اس کا نمبر (خاندان)، تیرا نانا ایتنا اسے گمردے کر گیا تھا، بہت نمازی پڑھتا تھا اور امانتدار بندہ ہے تو گھر کے کاغذ ہی لینے آئی ہوگی..... ہے نا؟“ بے بے نے ہاتھوں کا جھجھکا کر غور سے اسے دیکھا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ ماسٹر رفیق کی دوہتی (نواسی) ہے؟“ دلاور نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیا اور سنجیدگی سے پوچھا، لیکن بے بے تو اس کے سوال پر باقاعدہ ناراض ہی ہو گئیں۔
”اے پتر، یہ بال میں نے دھوپ میں پٹے (سفید) نہیں کیے، یہ اپنی ماں کی نری دوجی کا پی ہے۔ اپنی چندا بھی بالکل اس کے جیسی تھی۔ ان بوڑھے ہاتھوں میں پٹی تھی۔ رنج کے شرارتی..... سخت دوپہرے وہ اور کو کی مجھ سے نظریں بچا کر جاسن کے درخت پر چڑھ جاتیں، کیا دن تھے وہ بھی..... اس پنڈ کی ساری میری جیسی بڑھی زنانیوں کو اس کا بچپن جنگی طرح یاد ہے، چاہے شیدے کہہ کر کی زنانی سے پوچھ لے چاہے ٹھوٹھان سے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنی مطلوبہ معلومات خاتون کی بیٹی سے ملیں گی، جو آپ کی والدہ کی سہیلی تھیں، ورنہ یہ ضعیف خاتون تو اپنی یادداشتوں کو کھنگالتی رہیں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت محبت اور خلوص سے ان کا ذکر کر رہی ہیں، لیکن آپ شاید ان باتوں کی متحمل نہ ہو سکیں۔ ان خاتون سے ٹو دی پوائنٹ بات کریں۔“ دلاور نے بہت رواں انگلیوں میں سروہی کو مشورہ دیا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا، جبکہ بے بے اور ان کا دکاندار بیٹا دلاور کی بات کو سمجھ نہیں سکے۔

”بے بے آپ کی بیٹی کو کی کہاں رہتی ہے؟“

”پتر یہ پچھلی گلی میں تندور کے ساتھ والا اس کا گھر ہے تو نے ملنا ہے تو میرا بیٹا اس کے گھر لے جاتا ہے.....“

”ہاں جی! ضرور چلیں، کو کی آپا تو آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گی..... اب تو آپ کی والدہ کی شکل تھوڑی تھوڑی میرے ذہن میں بھی آ رہی ہے۔ ان کا ہمارے گھر میں کافی آنا جانا تھا۔“ خالد بہت خوش دلی سے اسے بتا رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے ان کے مطلوبہ گھر کے سامنے ٹھک گئے تھے جو دو تین منٹ کے فاصلے پر تھا۔

”کو کی آپا! دیکھو کون آیا ہے؟“ وہ ان کے گھر میں داخل ہوئے تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ کالے فرش کے صحن میں لگے نیشن پر وضو کرتی ایک ادھیڑ عمر کی خاتون بہت تیزی سے مڑی تھیں جبکہ برآمدے میں رکھے چولہے کے پاس سالن بناتی سروہی کی عمر کی ایک لڑکی نے بھی بے ساختہ دلچسپی سے انہیں دیکھا اور سالن میں جھج ہلانا بھول گئی۔

”چندا.....!“ ان خاتون کے ہاتھ سے صابن پھسل کر نین میں جا گرا تھا۔ حیرت اور استعجاب کے رنگ بہت شدت سے اجاگر ہوئے تھے۔

”کیا میری والدہ کا پیار کا نام چندا تھا.....؟“ سروہی کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔

”چاند کا نام چندا ہی ہو سکتا ہے تم راحیلہ کی بیٹی ہونا، ویسا ہی قد کاٹھ، ویسے ہی نین نقش لیکن وہ زیادہ خوبصورت تھی۔“ وہ بہت اپنائیت سے اسے گلے لگائے بولی تھیں۔

”کیا نام ہے تمہارا؟ بہت مشکل سا نام تھا۔ ایک دفعہ مجھے لاہور اسٹیشن پر ملی تھی اور میں نے اسے پہچانا نہیں، برقع میں جوتھی، وہ بہت جلدی میں اپنے باپ کی گود میں اور تمہارا بھائی اس کی گود میں.....“ انہوں نے بے ساختہ آگے بڑھ کر دلاور کا ماتھا چوما تو وہ ہکا بکا رہ گیا اور دانستہ خاموش رہا۔

”آؤ، آؤ بیٹا، تمہاری خالہ کا گھر ہے۔ بہت دوستی تھی میری راحیلہ سے۔ بہت سمجھایا تھا میں نے اسے کہ بڑوں سے دوستی کرو تو دروازے بڑے کرنے پڑتے ہیں، مگر نہیں سمجھی اس نے میری بات اور آخر خطا کھائی.....“ وہ افسردہ ہوئیں اور اگلے ہی لمحے سر جھٹک کر اپنی بیٹی کو کھانا بنانے کی ہدایت کرنے لگیں۔

”بس بیٹھو بیٹا میں ذرا نماز پڑھ آؤں.....“ نام لگتا جا رہا ہے۔“ انہوں نے دوپٹہ اچھی طرح لپیٹتے ہوئے ذرا عجلت میں کہا جبکہ سروہی کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی بہت دلچسپی اور تجسس سے ان کی پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا نام ہے آپ کا؟“ وہ بہت شوق سے پوچھ رہی تھی۔

”سروہی.....!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”امی آپ کی والدہ کی بہت باتیں سناتی ہیں..... انہی سے پتا چلا تھا کہ ان کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ڈاکٹر بن رہی تھیں ان کے بعد ہمارے گاؤں کی کوئی بھی لڑکی ڈاکٹر نہیں بنا

سب پرائیویٹ ایم اے یا بی اے کر لیتی ہیں۔ میں نے بھی چار سال پہلے بی اے کیا تھا۔ سیکنڈ ڈویژن میں۔“ سروہی نے بے توجہی سے اس کی باتوں کو سنا اس کی تمام توجہ جائے نماز پر نماز پڑھتی خاتون کی طرف تھی اور وہ بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہی تھی۔

”کاش کچھ ایسا ہو کہ اس لڑکی کے دل کو سکون آ جائے۔“ دلاور نے صدق دل سے تمنا کی۔

”ہاں بیٹا! تمہیں آج کیسے یہاں کا خیال آ گیا؟“ نماز پڑھ کر وہ سیدھی اس کے پاس آئی تھیں ان کی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا، جو سروہی کو مستقل چونکا رہا تھا۔

”اصل میں جو سچ بات ہے تو مجھے ان کے گاؤں کے ایڈریس اور نام پتے کے علاوہ کچھ معلوم نہیں۔“ سروہی نے لمحے کا بھی توقف کیے بغیر ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما اور دلگرفتگی سے کہا اور تھوڑا سا جھج کر بولی۔ ”یا پھر اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے میرے فادر کے قتل کے بعد دوسری شادی کر لی تھی اور میرے سوتیلے بابا اس موضوع پر بالکل بھی بات نہیں کرتے۔ میں نے بار بار کوشش کی کہ وہ کچھ نہ کچھ بتا دیں، لیکن والدہ شاید ان کو نہ بتانے کی قسم دے کر مگنی تھیں۔ وہ میرے بابا کے قاتلوں سے بہت خوفزدہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں اس موضوع پر بالکل بات نہیں کروں، لیکن اتنا انہوں نے مجھے ضرور بتایا کہ امی کو بہت سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ختم کر کے وہ میرے جڑواں بھائی کو چھین کر لے گئے۔ اللہ جانے وہ زندہ ہے یا نہیں، بس اسی چیز کی تلاش مجھے بے چینی رکھتی ہے۔“ سروہی کے انکشاف نے وہاں موجود سب افراد کو بری طرح چونکا دیا تھا۔ وہ سب ایک ہی کیفیت میں تھے۔

”مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ اسے دور کر سکوں..... لیکن سچ بات یہ ہے کہ لاہور جانے کے بعد میرا راحیلہ سے رابطہ بہت کم ہو گیا تھا۔ جب اس کی کورٹ میرج کی خبر یہاں پنڈ میں پہنچی تو تمہارے نانا کو بہت گہرا صدمہ اور شرمندگی ہوئی۔ لوگ طرح طرح کے سوال کر کے انہیں سخت پریشان کرتے تھے اور وہ راحیلہ سے سخت ناراض تھے اور انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ کبھی اس کی شکل نہیں دیکھیں گے۔“

”اوہ.....“ سروہی کو بری طرح جھٹکا لگا۔

”کچھ خبر ہے کہ میری والدہ کی شادی کس خاندان میں ہوئی تھی؟“

”نہیں بیٹا، اس کی کچھ خبر نہیں، لیکن اتنا پتا ہے کہ بہت بڑے جاگیردار لوگ تھے اور وہ

پورے پنڈ میں ماسٹر رفیق کی بہت عزت تھی۔ اس واقعے کے بعد راحیلہ کی دادی کا انتقال ہو گیا اور جب تو وہ مردوں سے بھی بدتر ہو گئے۔ اٹھتے بیٹھتے وہ یہی کہتے تھے۔ ”چند اللہ تیرے دل کو بھی ایسا درد دے جو تو نے مجھے دیا۔“ ان خاتون کی بات پر سروہی کے دل کو کچھ ہوا اس نے بے اختیار نظریں چرائیں۔

”تمہارے دوسرے والد نے کچھ نہیں بتایا کہ وہ اسے کہاں ملی تھی؟“ وہی خاتون اب تجسس اور بے تابی سے پوچھ رہی تھیں۔

”جی بتایا تھا۔“ سروہی نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور آہستگی سے گویا ہوئی۔ ”دارالامان میں۔“

”کیا.....؟“ ان کو بری طرح جھٹکا لگا تھا۔

”ہاں میرے بابا کے انتقال کے بعد ان کے پاس کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ دارالامان چلی گئیں۔ جہاں میرے دوسرے سوتیلے فادر کسی کام سے آئے تھے اور کوئی فخر وغیرہ لکھ رہے تھے۔ وہ کسی اخبار سے وابستہ تھے اور یتیم تھے۔ انہوں نے بھی ساری زندگی اپنے ماموں کے گھر گزاری اور ممانی کے برے سلوک سے تنگ آ کر لاہور چلے آئے۔ بس اس طرح سے ان کی میری والدہ سے شادی ہو گئی۔ امی پڑی لکھی تھیں اور دارالامان کا ماحول ان کو پسند نہیں تھا، پھر شاید قسمت میں یہی تھا، لیکن ان دونوں کی رفاقت بھی مختصر رہی اور ان سے میری ایک اور بہن نور العباب بھی ہے۔“

”کیسے ہیں تمہارے والد؟ اور تمہارے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے؟“ اس خاتون کی دلچسپی اب اس طرف ہو گئی تھی۔

”بہت اچھے، نیک، مہربان اور شفیق، مجھے ساری زندگی احساس نہیں ہوا کہ وہ میرے سکے والد نہیں ہیں، بس دو چار سال پہلے انہی کے کچھ رشتے داروں سے علم ہوا تھا، لیکن میں ان سے زیادہ اس لیے نہیں پوچھتی کہ وہ کہیں ہرٹ نہ ہوں، کیونکہ وہ نور العباب سے زیادہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔“ سروہی کے لہجے میں ان کے لئے بے پناہ پیار اور عقیدت تھی۔

”اللہ ان کو اس کا اجر دے.....“ وہ خلوص دل سے بولی تھیں۔

”آپ کو ان کے نام کا کچھ علم ہے، میرا مطلب جہاں ان کی شادی ہوئی؟“ دلاور کی سوچی وہیں لگی ہوئی تھی۔

بندہ بھی کوئی ڈاکٹر نہیں تھا، بس اپنی بہن کو ملنے ہاسٹل آتا تھا اور وہیں کہیں اس نے راحیلہ کو دیکھا تھا۔ اللہ جنت نصیب کرے راج کے تو خوبصورت تھی۔“ وہ اتنی حیران ہو کر سن رہی تھی کہ بس خاموش لگا ہوں سے سامنے بیٹھی خاتون کو دیکھے جا رہی تھی جیسے وہ کوئی الف لیلوی داستان سنا رہی ہوں۔

”تو پھر وہ آپ کو کہاں ملیں؟“ دلاور نے گہرے لہجے میں استفسار کیا۔ وہ اب ساری کہانی سمجھ چکا تھا۔

”اپنی شادی کے تقریباً ڈیڑھ دو سال کے بعد مجھے کسی سرکاری کام سے لاہور جانا پڑا تھا.....“ وہ ایک لمحے کو رکیں۔ شاید میں آپ کو یہ بتانا بھول گئی کہ میں یہاں سرکاری سکول میں پرائمری ٹیچر ہوں اور وہیں اسٹیشن پر میں نے اسے اس کے شوہر کے ہمراہ دیکھا تھا اور دونوں بچے بھی۔“

”کیا.....؟“ آپ نے میرے والد صاحب کو بھی دیکھا تھا؟“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”ہاں بیٹا.....“ انہوں نے کھینچ کر سروہی کو پھر سے کندھے سے لگا لیا۔ ”ماشاء اللہ بہت اونچا، لمبا اور بھرپور مرد تھا۔“

”انہوں نے کچھ تو بتایا ہوگا کہ ان کی شادی کہاں ہوئی ہے؟“ سروہی نے انہیں ٹوکا تو وہ اس کی بے تابی پر ہلکا سا مسکرائیں۔

”ہاں بس اتنا سا ذکر کیا تھا۔“ وہ ذہن پر زور ڈال کر بولیں۔ ”کہ دینا پور والے ان دونوں کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔“

”دینا پور.....!“ دلاور کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا، پہلی بار اس کے چہرے پر

تردد کے آثار نظر آئے۔ سروہی بنا کچھ کہے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی، جس کے چہرے کے

تاثرات میں جو تبدیلی آئی تھی وہ بڑی نمایاں تھی۔

”دینا پور میں کس خاندان میں.....؟“ دلاور نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”بنا خدا کو جان دینی ہے اس سے زیادہ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا، مجھے تو اسے

اچانک دیکھ کر جو خوشی ہوئی تھی۔ میں تو بار بار اس کے خوبصورت گول منول بچوں کو دیکھے جا رہی تھی اور وہ بار بار مجھ سے ماسٹر رفیق کے بارے میں پوچھتی رہی اور سچ بتاؤں۔“ وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے بولیں۔ ”اسے ماسٹر رفیق کا دل دکھانے اور ان کا اعتماد توڑنے کی سزا ملی.....“

مل وارث آگئے ہیں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کو انہیں بتانے کی بھی ضرورت نہیں، انہیں آرام سے رہنے دیں۔ میں کسی غریب خاندان کو اٹھا کر ان کی بددعائیں نہیں لینا چاہتی بلکہ کسی دن آکر یہ مکان انہی کے حوالے کر جاؤں گی۔ شاید اس طرح میری ماں کی روح کو سکون آجائے۔ بابا بتاتے ہیں کہ وہ نانا کے لئے بہت تڑپتی تھیں۔“ اس نے اٹھتے ہی دلاور کو اشارہ کیا تو اس نے بھی دیر نہیں کی۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ زندگی رہی تو دوبارہ آپ سے ملاقات ہوگی۔ تب آپ سے میں امی کی ڈھیروں باتیں سنوں گی۔ ابھی مجھے لاہور کے لئے واپس نکلتا ہے۔“ سروہی نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر محبت سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

”تمہاری ماں بھی ایسی تھی۔ بہت جلد باز..... جو ٹھان لیتی تھی وہ کر کے چھوڑتی۔“ ان خاتون کے ہیکے لہجے پر سروہی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں اور وہ بمشکل مسکرائی۔

”دماغ ٹھیک ہے آپ کا۔ اس وقت رات کے نو بج رہے ہیں اور آدمی رات کو آپ واپس لاہور پہنچیں گی۔ اس وقت آرام اور سکون سے اپنی دوست کے گھر جائیں اور صبح لاہور کے لئے کوچ پکڑ لیجیے گا سمجھیں؟“ گاڑی میں بیٹھتے ہی دلاور نے اپنائیت سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے شاید اتنی جلدی مان جانے کی توقع نہیں تھی۔ اس لئے حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”نہیں.....“ سروہی نے گاڑی کی سیٹ سے سرٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

”بس ٹھیک ہے آپ آرام سے اپنی فریڈ کے گھر رہیں۔ میں یہاں کسی ہوٹل میں قیام کر لیتا ہوں۔ صبح آپ کو لاہور چھوڑ آؤں گا۔“

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟“ وہ آنکھیں کھول کر جھٹکے سے اٹھی اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ”خواتون صبح سے چپکے ہو رہے ہو آرام سے اپنے مالکوں کے پاس جاؤ۔“ دلاور نے اسے اپنے سابقہ انداز میں آتے دیکھ کر سکون بھری سانس لی اور خوشگوار لہجے میں کہا۔

”سوچ لیں میری مدد کے بغیر آپ کا مسئلہ حل بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ میں دینا پور کے بچے اور ایک ایک خاندان کو جانتا ہوں۔“

”نہیں بیٹا! میں نے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔“ انہوں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”اس کے علاوہ کوئی اور بندہ جسے ان کے بارے میں کچھ علم ہو۔“ سروہی نے بے چینی سے پوچھا۔

”نہیں بیٹا!“ انہوں نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا تو سروہی کا چہرہ اتر گیا۔

”لیکن.....“ وہ کچھ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولیں تو سروہی اور دلاور کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”ایک جگہ سے کچھ پتا چل سکتا ہے.....“

”کہاں سے؟“

”ڈاکٹر سحیہ سے۔“

”کیا..... آپ ڈاکٹر سحیہ کو جانتی ہیں؟“ سروہی بری طرح اچھلی سحیہ کے نام سے ملنے والے خطوط پر اس نے بار بار سوچا کہ یہ خاتون کون ہو سکتی ہیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

”ہاں جن دنوں راحیلہ لاہور میں پڑھتی تھی ایک دفعہ اپنی ہاسٹل کی ایک سہیلی کو یہاں پنڈ میں لائی تھی اور میری بھی اس سے کافی گپ شپ رہی تھی۔ وہ تین دن یہاں رہی اور ہم تینوں نے خوب باتیں کی تھیں اس کے بعد میں نے دوبارہ اسے نہیں دیکھا پھر راحیلہ نے نکاح کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ ماسٹر رفیق نے اس کی متغنی اپنے دوست کے بیٹے سے کر رکھی ہے.....“

”لیکن آپ نے دوبارہ کہاں انہیں دیکھا؟“ سروہی نے بے چینی سے بات کاٹی۔

”لاہور میں جو ہر ٹاؤن کے علاقے میں مین روڈ پر ایک بہت بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں وہ الرٹا سائونڈ اسپیشلسٹ تھی۔ میری بڑی بیٹی کا پہلا بچہ وہیں ہوا تھا اور میں نے اسے وہاں دیکھا، لیکن اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا اور پتا نہیں ایسا کیوں کیا حالانکہ وہ وہی تھی۔“

”بہت بہت شکریہ آپ کا، ہم خود ہی ان خاتون کو تلاش کر لیں گے۔“ سروہی بے تابگی سے اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ وہ خاتون اس کے عجلت بھرے انداز پر ہونچکی رہ گئیں۔

”اے بیٹا! رات کا ٹائم ہے، کھانا شانا کھاؤ اور صبح نکل جانا، یہ تمہاری خالہ کا گھر ہے اور صبح میں تمہیں تمہارے نانا کا گھر بھی دکھا کر لاؤں گی اور مولوی صاحب کو بتا بھی آؤں گی کہ

”اچھا ٹینشن مت لو آجائے گی۔ میں اس کے ڈیپارٹمنٹ کا چکر لگا کر آتا ہوں۔“
انہوں نے بمشکل انک کر کہا۔ دل تھا کہ کسی طور سنبھل نہیں رہا تھا۔
”ٹھیک ہے پھر راستے میں مجھے بھی پک کر لیجے گا۔ دل کو پچھے لگے ہوئے ہیں ایک منٹ کو سکون نہیں آ رہا۔ ان کے لہجے میں حد درجہ تشویش تھی۔
”او کے۔“ وہ چلتے چلتے رکے اور پھر بری طرح ٹھٹکے۔

”نایاب.....!“ وہ بڑبڑائے تو دوسری طرف وہ بھی بری طرح چونکیں۔

”کہاں ہے.....؟“ وہ حد درجہ حیران اور پریشان ہو رہی تھیں۔

”یہاں کورٹ کی پارکنگ میں لیکن یہ یہاں کیا کر رہی ہے..... اور یہ لڑکا کون ہے؟“
جشن نعمان نے ایک فطری سی غصے کی لہر کو بمشکل دبایا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑے تھے جبکہ ان سے کافی فاصلے پر بلیک پراؤڈ میں بیٹھی ان کی لالہابی بیٹی خاصے خوشگوار موڈ میں تھی جبکہ اس کے ساتھ موجود شاسا لڑکا حد درجہ پُر اعتماد تھا اور اس کے چہرے پر کچھ پالینے کی چمک تھی۔

”کہیں یہ دونوں.....“ ایک زہریلی سوچ نے ان کے وجود کا احاطہ کر لیا تھا اور دوسری طرف موجود ان کی مزاج آشیا شریک حیات اپنے شوہر کی ادھوری بات کا مطلب فوراً سمجھ گئی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے سیل فون پھسل کر سفید ماربل کے فرش پر دور جا گرا تھا۔ اسی وقت ایک نرس اندر داخل ہوئی اور بہت معروف انداز میں بولی۔
”ڈاکٹر صاحبہ! ایک مریضہ بہت زیادہ اصرار کر رہی ہے آپ سے ملنے کو۔“

* * *

”عجیب بد مزاج، خردماغ اور بد اخلاق خاتون ہیں، یہ ڈاکٹر سعدیہ۔ سمجھتی کیا ہیں خود کو..... پتا نہیں ان جیسی سٹرل خاتون کے ساتھ میری امی کی دوستی کیسے ہو گئی۔ تیسرا چکر ہے اور ان محترمہ کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔ پہلی دفعہ کہا کہ ٹائم ختم ہو گیا، دوسری دفعہ بیماری کا بہانہ کر دیا اور اب تیسری دفعہ پھر بلوا کر ڈاکٹر زکی کسی ہسپتال کا حصہ بنی بیٹھی ہیں اور ملنے کے لئے پانچ منٹ کا وقت بھی نہیں۔“ سروہی گاڑی مین روڈ پر لاتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھی، اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ وہ ان سے ملنے کے لئے جتنی بے چین تھی وہ اتنا ہی لفٹ کا بورڈ لگائے ہوئے تھیں۔ حالانکہ آج ہی ایک تجربہ کار نرس نے اسے اہم اطلاع دی تھی کہ بیٹی نے

”زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں مجھے جب تمہاری ضرورت ہوگی تمہیں فون کر لوں گی۔“
اب آرام اور شرافت سے اپنے علاقے جاؤ سمجھے.....!“
”او کے میم.....“ اس نے خوشدلی سے کندھے اچکائے اور گاڑی مطلوبہ علاقے کی طرف موڑ لی۔

☆☆

جشن نعمان کی آج صبح سے عجیب سی کیفیت تھی۔ اپنے اندر اٹھتی گہری فکروں کو دبا رہے ہوئے وہ اپنے آفس چلے آئے تھے۔ ایک عجیب سی بے چینی اور انہونی کا احساس انہیں تڑپا رہا تھا اور بلڈ پریشر بھی آج حد سے بڑھا ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ آفس آگئے تھے اور اس وقت ان کا دل کر رہا تھا کہ فوراً گھر پہنچ جائیں۔ ساری ہمت جمع کر کے وہ بلا خرگمر جانے کے لئے اٹھ ہی کھڑے ہوئے اپنے اسٹنٹ کو ہدایات دے کر وہ اپنے آفس سے باہر آئے۔ ڈرائیور کو بھی فون کر کے گاڑی پارکنگ سے نکالنے کا کہہ دیا۔ اس وقت بھی وہ سستی سے چلتے ہوئے باہر آ رہے تھے جب ان کی مسز کی کال نے ان کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا دیا۔

انہوں نے فون اٹینڈ کیا تو دوسری طرف ان کی مسز غصے اور تشویش کے طے طے انداز میں شروع ہو چکی تھیں۔

”دیکھ لیں اپنی ضدی بیٹی کا حال۔ میں نے آج منع بھی کیا تھا کہ یونیورسٹی مت جانا آرام سے پیکنگ کرو کل صبح چھ بجے تمہاری فلائٹ ہے اور میں کلینک پہنچی ہوں تو مجھے ملازمہ نے بتایا ہے کہ وہ ایک گھنٹے کا کہہ کر کیمپس چلی گئی ہے کہ دوستوں سے مل کر آ رہی ہوں اور اب اسے گئے تین گھنٹے ہونے کو ہیں۔“ جشن نعمان کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوئی بہت تیزی سے انہوں نے خود کو سنبھالا اور اگلے ہی لمحے دانستہ سرسری لہجے میں بولے۔

”تم نے اس کے سیل فون پر کال کر لینی تھی۔“

”آپ کا کیا خیال ہے کہ نہیں کی ہوگی؟“ ایک طرف ان کو نہ جانے کیوں بات بے بات غصہ آ رہا تھا۔

”پھر.....؟“ انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نمبر بند جا رہا ہے۔“ انہوں نے روہا سی آواز میں کہا۔

ان کی مرضی کے خلاف کسی منشر کے بیٹے سے نکاح کر لیا ہے جس کی وجہ سے وہ بری طرح پریشان ہیں۔

”اب نکاح ان کی بیٹی نے کیا ہے، اس میں میرا یا لوگوں کا تو قصور نہیں جو وہ زمانے بھر سے خفا ہوئی بیٹھی ہیں۔“ وہ مسلسل غصے میں اکیلے بڑبڑا رہی تھی۔

اسی وقت اس کے سیل فون پر عائش کا نام جھلک گیا تو اس کا موڈ اور زیادہ خراب ہو گیا، تبھی فون انینڈ کرتے ہوئے وہ فوراً سلام دعا کیے بغیر شروع ہو گئی۔

”خیال آ گیا آپ کو میرا.....؟ سارے جہاں میں چھاپے مارتے پھرتے ہیں اور میرے لیے تھوڑا سا بھی تاہم نہیں کہ بندہ پوچھ لے کہ زندہ ہو یا مر گئیں.....!“ سروہی کے مان بھرے لہجے پر عائش کے چہرے پر ایک پھسکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”بس یا رکھو خاندانی مسائل میں پھنسا ہوا تھا سر کھانے کی فرصت نہیں تھی۔ آج کچھ ریلیکس ہوا ہوں تو فوراً تم سے رابطہ کر رہا ہوں، تم نے بھی کون سا خود سے پوچھ لیا۔“ اس نے بھی شکوہ کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ تبھی وہ ڈھیلے انداز میں وضاحت دینے لگی۔

”بس میں بھی کچھ ایسے ہی مسئلوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ تم بتاؤ کہ خیریت تو تھی ناں.....؟“

”ہاں یار! پاپا کو ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آفس سے بھی چھٹیاں لینی پڑیں اور پاپا کی بیماری کی اطلاع سن کر رملہ اور رمیض بھی پاکستان آئے ہوئے ہیں۔“

”اوہ.....! ویری سیڈ..... تم نے بتایا ہی نہیں ورنہ میں ان کی عیادت کو ضرور آتی اب کیسے ہیں وہ.....؟“ وہ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

”اب کچھ بہتر ہیں، کل ہی ان کو گھر شفٹ کیا ہے، لیکن بہت کمزور ہو گئے ہیں وہ۔“

”اللہ ان کو زندگی اور صحت دے.....“ سروہی کے پُر خلوص لہجے پر اس نے فوراً آمین کہا۔

”تم سناؤ کہاں بڑی رہیں آج کل کچھ لکھ بھی نہیں رہی ہو آج صبح پاپا اخبارات میں تمہارا کالم ڈھونڈ رہے تھے تو میں نے کہا کیوں دوبارہ اپنی طبیعت خراب کرنی ہے، محترمہ خاصا تلخ لکھتی ہیں۔“ عائش کا لہجہ اب کچھ فریش تھا، تبھی وہ بھی خوش دلی سے بولی۔

”تم تو میری شہرت سے جلتے ہو تمہیں کب گوارا ہے کہ تمہارے پاپا میرے فین

نہیں۔“

”ہاں میں یہ قطعاً گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ سر کے علاوہ تمہارے ساتھ کوئی اور ریلیشن شپ قائم کریں۔“ عائش کے برجستہ انداز پر وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”فضول باتیں مت کرو اور یہ بتاؤ کہ میں تمہارے پاپا کی عیادت کے لئے کب آؤں؟“

”پاپا کی عیادت..... یا ان کے ہینڈسم بیٹے کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرنے۔“ وہ فریش ہونے کے لئے اس کو چھیڑ رہا تھا۔

”بس جو بھی..... ایک ٹکٹ میں دوسرے ہو جائیں تو کیا بات ہے۔“ وہ بھی کچھ دیر پہلے کی کوفت اور جھنجلاہٹ کو بھلائے اب شوخ ہو رہی تھی، ایک نرم اور خوش کن سا احساس آہستہ آہستہ اس کے وجود کے گرد حصار سا بن رہا تھا۔

”پھر ایک ٹکٹ میں دوسرے کب کرنے ہیں؟“

”جب تم چاہو.....!“

”چلو پھر کل شام میں ملتے ہیں۔“ عائش نے فوراً پروگرام طے کیا تو وہ بھی فوراً مان گئی۔

* * *

نایاب کے بلاول کے ساتھ نکاح کی خبر کچھ گھنٹے بھی نہ چھپ سکی۔ جسٹس نعمان نے اپنے اختیارات سے فوراً پتا کروا لیا تھا اور نایاب کے گھر واپس آنے پر صبح سے ایک قیامت کا سال تھا۔ نایاب کو اندازہ تو تھا کہ ماما اور پاپا خفا ہوں گے، لیکن ان کا ردِ عمل اتنا شدید ہو گیا اس کا ہرگز اندازہ نہیں تھا۔ اوپر سے جسٹس نعمان کے ہارٹ اٹیک نے اس کے ہاتھ پیر ہلا دیے تھے۔ وہ مسلسل سارے خاندان کی طنزیہ نظروں اور کاٹ دار جملوں کی زد میں تھی۔ اس کی انجینڈ کی سیٹ فی الحال منسوخ کر دی گئی تھی اور اگلے چوبیس گھنٹوں میں رملہ اور رمیض بھی پاکستان پہنچ چکے تھے۔ تینوں بہن بھائی نایاب کی اس حرکت پر ششدر تھے، انہیں گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ رملہ نے تو اسے ٹھیک ٹھاک سنا دی تھیں جب کہ مسز نعمان کی حالت بھی خاصی خراب تھی اور نایاب کے پاس اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کو نہیں تھا۔ باپ کی حالت دیکھ کر اسے اپنا کچھ گھنٹے پہلے کیا گیا جذباتی فیصلہ سراپا ہی بے وقوفی لگ رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ بلاول کی کوئی بھی کال اپنے سیل فون پر انینڈ نہیں کر رہی تھی۔ جب ڈاکٹر نے کارڈیو میں کھڑے

پانچوں لوگوں کو ان کی سیریس حالت پر دعا کرنے کی تلقین کی تو نایاب اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”آئی ایم سوری ماما“ میں ہرگز ایسا نہیں چاہتی تھی۔ بس غصے میں مجھ سے یہ بے وقوفی ہو گئی۔ پاپا ٹھیک ہو جائیں تو جیسا وہ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔“ نایاب کے ملال زدہ لہجے پر مسز نعمان کی ٹینشن کچھ کم تو ہوئی تھی، لیکن ان کا تمام تر دھیان اپنے شریک حیات کی طرف تھا۔

”تم اپنی بکواس بند رکھو۔“ رملہ کی قہر آلود نگاہوں میں صاف جتنا ہی ہوئی لافلتی تھی جب کہ نایاب گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی، جہاں بیزار بیزار رمیض کھڑا تھا، البتہ عائش کا رویہ بہتر تھا، حالانکہ دل ہی دل میں وہ بھی بد دل ہوا تھا، اسے سخت حیرت تھی کہ انہیں ہتا ہی نہ چلا کہ ان کی سب سے چھوٹی بہن اتنی بڑی ہو چکی ہے کہ بڑے بڑے فیصلے خاموشی سے تنہا کرنے لگے۔

رات گئے جشن نعمان کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو نایاب کی جان میں جان آئی اس وقت رشتے داروں اور ملنے ملانے والوں کا تانتا سا بندھا گیا تھا۔ رملہ ایک منٹ کے لئے پاپا کے بیڈ کے پاس سے اسٹھنے کو تیار نہیں تھی اور نایاب شرمندگی اور خفت سے سب سے علیحدہ کوئے میں کھڑی تھی۔ اس کے اندر ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھ کر باپ کی خیریت ہی پوچھ لے اور انہوں نے بھی حالت بہلنے پر عائش، رمیض اور رملہ کو پوچھا تھا۔ جب کہ نایاب کو انہوں نے صاف نظر انداز کر دیا تھا۔ نایاب کو سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی فی سب بہن بھائیوں کو دکھائی دے رہی تھی، لیکن وہ دانستہ اس سے لائق ہو رہے تھے۔

زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوگا؟ نایاب نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اتنے محبت کرنے والے رشتے اس سے خفا ہو جائیں گے۔ پاپا کے چہرے پر اس کے لئے کوئی بھی اپنائیت کا اثر نہیں تھا اور نایاب شرمساری اور فکر مندی سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

جشن نعمان کے ارد گرد کھڑے تمام بہن بھائیوں کے چہروں پر غصہ اور دکھ تھا۔ تین دن کے بعد نعمان صاحب کو جب گھر منتقل کیا تو نایاب کا حوصلہ اور صبر جواب دے گیا۔ وہ اس کے بعد ایک دفعہ بھی باپ کے سامنے نہیں آئی تھی اور انہوں نے بھی اپنی سب سے زیادہ لاڈلی اولاد کے بارے میں ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا تھا، جب کہ نایاب نے خود کو کمرے میں بند

کر رکھا تھا۔ زندگی ایک دم پھسکی، بے کار اور بے رنگ سی ہو گئی تھی، اس کے لئے۔ بلاول سخت پریشانی میں تھا۔ نایاب کا سیل فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ نعمان صاحب کے ہارٹ ایک کی خبر اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ نایاب سے بات کرنا چاہتا تھا کہ صورت حال کا اندازہ ہو سکے، لیکن دوسری طرف فونٹ کا بورڈ تھا۔ اس نے ایک دن ہمت کر کے گھر کے نمبر پر فون بھی کر لیا تھا، لیکن ملازمین ہی اٹینڈ کر رہے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ نایاب بی بی نے کسی بھی فون کی اطلاع کو سختی سے منع کر رکھا ہے اور وہ خود کو حد درجہ بے بس محسوس کر رہا تھا اور اسی بے بسی نے اسے اپنا یہ مسئلہ سجاد کے ساتھ ڈسکس کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ناياب کی رات گئے آنکھ کھلی تو ایک دم سے وحشت زدہ تنہائی نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھولی تو باہر شاید بجلی کڑی تھی اور تیز ہوا کے ساتھ بہت سی ٹھنڈی بوندیں اس کے چہرے سے ٹکرائیں..... وہ گھبرا کر ننگے پاؤں باہر نکل آئی۔

رات کے دو بج رہے تھے اور ماما پاپا کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ ڈھیلے احوالے ٹراڈ اور ٹی شرٹ میں انتہائی خوفزدہ انداز سے ان کے کمرے کا دروازہ ٹاک کرنے لگی۔

”یس.....“ پاپا کی نقاہت زدہ آواز پر اس نے فوراً دروازہ کھولا، سامنے ہی پاپا چشمہ لگائے قانون کی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے اور ماما گہری نیند میں تھیں۔ نعمان صاحب نے غور سے اس کا وحشت زدہ، خوفزدہ اور شرمسار چہرہ دیکھا تو ان کے دل کو کچھ ہوا۔

”پاپا.....!“ وہ ان کے دیکھتے ہی سسک اٹھی اُسے زندگی میں پہلی دفعہ اپنے دوستوں جیسے باپ سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

خاموشی کا طویل وقفہ پورے کمرے میں پکڑنے لگا۔ وہ خاموشی سے ان کے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ انہوں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر اسے بیٹھنے کو جگہ دی..... نایاب کو اپنا سر کسی بھڑے کے مانند دکھتا محسوس ہو رہا تھا۔

”آئی ایم سوری پاپا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بلیوی میں بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میں نے اتنا بڑا اسٹیپ کیسے اٹھایا؟ لیکن اب میرا ڈوب مرنے کو دل کرتا ہے۔“

نایاب جو خود کو ریلیکس رکھنے کی کوشش کر رہی تھی ایک دم پھٹ پڑی۔ نعمان صاحب نے ایک ہلکے کناں نظر اپنی بے وقوف سی بیٹی پر ڈالی..... جس کے حلق میں آنسو اٹک گئے تھے اور اب وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

”سمجھ نہیں آتا نایاب کہ مجھ سے کہاں سے غلطی ہوئی؟ ہماری تربیت میں کہاں کوتاہی رہ گئی تھی؟ حالانکہ اپنے چاروں بچوں میں سب سے زیادہ فیور میں نے تمہیں ہی دی ہے۔ حقیقت میں تم نے میرا دل دکھایا ہے۔ میرا سارا مان، اعتبار ہر چیز ختم کر دی۔“ وہ حد درجہ دکھی تھے۔

”تمہاری ماما مجھ سے کہتی تھیں کہ آپ رملہ پر نایاب کو فوقیت دیتے ہیں، حالانکہ وہ زیادہ فرمانبردار ہے۔ ہم نے اسے جو کہا اس نے وہی کیا اور نایاب بیٹا آپ کو تو زندگی کے ہر معاملے میں چوائس کا حق دیا تھا، لیکن آپ اس حق کا اتنا غلط استعمال کریں گی اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا.....“ نعمان صاحب کی دل گرفتہ آواز پر مسز نعمان نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور روتی سسکتی نایاب کو پاس بیٹھے دیکھ کر انہیں ایک لمحے میں ساری صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔

”نایاب کیوں اپنے پاپا کو مزید تنگ کر رہی ہو.....“ ان کے لہجے میں حد درجہ بیزاری تھی۔

”دیکھیں..... دیکھیں پاپا، ماما بھی مجھ سے کیسے بات کرتی ہیں، جب میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں اور بارہا ان سے کہہ چکی ہوں کہ آپ لوگ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی، پھر آپ لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہے.....؟“ نایاب کے لب کپکپا رہے تھے۔ دونوں میاں بیوی کا دل دکھ اور ترحم سے بھر گیا۔ تبھی نایاب نے پاپا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”بے شک پاپا، آپ میری طرف سے خلع کا کیس کل ہی دائر کر دیں۔“ وہ اب پاپا کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر لگائے ادنیٰ آواز میں رو رہی تھی جب کہ پاپا اور ماما دم بخود ہو کر اسے دیکھ رہے تھے جسے معاملے کی سنگینی کا شاید اندازہ نہیں تھا۔

”بہت بے وقوف اور جلد باز ہو تم.....“ جسٹس نعمان کو اپنا سارا غصہ ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور ان کی مجبوری تھی کہ وہ بہت زیادہ دیر تک اپنی اس لاڈلی بیٹی سے فٹا

نہیں رہ سکتے تھے۔ تبھی وہ انتہائی مضبوطی سے اس کا سر سہلانے لگے، مسز نعمان بھی کسی گہری سوچ میں مگن ہو گئی تھیں۔

* * *

وہ آندھی اور طوفان کی طرح بیڈ روم میں داخل ہوا تھا۔ نماز پڑھ کر دعا مانگتی مومنہ نے چونک کر اپنے مجازی خدا کو دیکھا، جس پر حد درجہ غلٹ سوار تھی۔ وہ وارڈ روب کے اوپر سے بیک کھینچ کر زمین پر اتار چکا تھا اور اب بہت تیزی سے اپنے اور اس کے کپڑے بیڈ پر ڈھیر کیے جا رہا تھا۔ مومنہ حیران ہوئی اور بڑے بڑے قدم اٹھاتی اس کے سر پر پہنچ گئی۔

”کیا ہوا.....؟ ہم کہیں جا رہے ہیں کیا.....؟“ مومنہ نے بغور اسے دیکھا۔

”ہاں.....!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کیا مصیبت ہے..... اب کہاں جا رہے ہیں؟“ مومنہ پر جھنجھلاہٹ کا شدید حملہ ہوا۔

”دینا پور.....“ سجاد کے جواب پر اسے شدید جھٹکا لگا۔ اس نے سجاد کے تباہ زدہ چہرے کو غور سے دیکھا اس کے دل کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔

”دینا پور جا رہے ہیں یا مبارک پور؟ اور خیریت تو ہے ناں.....؟“ اس نے اپنے دھڑدھڑکاتے دل کو بمشکل سنبھالا۔

”کیا تم ہر بات کے پیچھے پڑ جاتی ہو، کہہ تو دیا ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔“ وہ بیڈ کی دراز سے اپنے کچھ کاغذات نکال رہا تھا۔

”تو پھر اتنی ایمر جنسی نافذ کرنے کا مقصد؟“ وہ بری طرح چڑھ گئی۔

”مومنہ مجھے تنگ مت کرو، میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں، فوراً تیار ہو جاؤ۔ پھر نہ کہنا کہ یہ رہ گیا اور وہ رہ گیا کیونکہ جہاں تم جا رہی ہو، ہو سکتا ہے، وہاں تمہیں ایک طویل عرصے تک رہنا پڑے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکنا نہیں اور فوراً باہر نکل گیا۔ مومنہ کے چہرے پر ہر اس بڑھ گیا تھا۔ اس کے جملے نے اس کی تمام تر توانائی نچوڑ لی تھی۔

”مجھے وہاں طویل عرصے تک کیوں رہنا پڑے گا؟“ اور کیا شاہ جی کے ساتھ ان کے کوئی مذاکرات ہوئے ہیں۔“ بہت سارے وہم دل و دماغ میں دھرتا دے کر بیٹھ گئے تھے۔ اس نے ادھر ادھر ہاتھ مار کر جو کچھ ہاتھ لگا بیک میں ڈال لیا تھا، وہ حد درجہ غائب دماغ تھی اسے پتا ہی نہیں چلا کس سوٹ کا دوپٹہ اور کس کی شرٹ وہیں بیڈ پر رہ گئی تھی۔

اور نعمان صاحب کو بطور خاص دیکھا جو خود ہی مسکرا رہے تھے۔

”بھائی وہ کھالیں گی؟ آپ کیوں ٹینشن لے رہے ہیں اور کمرے میں سروی آپنی کے علاوہ بھی کچھ اور لوگ ہیں؟ ان پر بھی توجہ دے لیں۔“ رمیض کے معنی خیز لہجے پر عائش اور سروی بری طرح گڑبڑا گئے، تبھی سروی کو احساس ہوا کہ وہ سب لوگ انہیں اچھا خاصا نوٹ کر رہے ہیں اور اس سوچ نے اس کا اعتماد ڈانوں ڈول کر دیا تھا، لیکن بہت جلد اس نے خود کو سنبھال کر مسز نعمان سے سرسری انداز میں پوچھا۔

”آئی آپ کس ہسپتال میں ہوتی ہیں؟“

”الٹھا ہسپتال جو ہر ٹاؤن.....!“ کچپ کی بوتل نعمان صاحب کو پکڑاتے ہوئے مسز نعمان کا سرسری لہجہ سروی کو بری طرح چونکا گیا، وہ پڑا کا ٹکڑا منہ میں ڈالنا بھول گئی۔

”آپ وہاں ڈاکٹر سعدیہ کو جانتی ہیں؟ انٹراساؤنڈ اسپیشلسٹ ہیں؟“ سروی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے کمرے میں موجود تمام کینوں کو بری طرح چونکا دیا تھا۔ وہ حیرانی سے سروی کو دیکھ رہے تھے، جس کا انداز دلچسپ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ واقعی ڈاکٹر سعدیہ کو نہیں جانتی۔

”ہاں..... بہت اچھی طرح جانتی ہوں، آپ کو ان سے کوئی کام ہے کیا.....؟“ ڈاکٹر سعدیہ نے اُلجھن بھرے انداز میں پوچھا، یہ لڑکی انہیں حد درجہ چونکا رہی تھی۔

”جی، مجھے ان سے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ملنا تھا، لیکن وہ شاید بہت بڑی خاتون ہیں، میں تین دفعہ ملاقات کے لئے گئی، لیکن مل نہیں سکی۔ آپ مجھے ان سے ملوا سکتی ہیں.....؟“ سروی کے حد درجہ سنجیدہ انداز پر عائش نے بے بسی سے اسے دیکھا جب کہ رملہ اور رمیض سے اپنی مسکراہٹ کو چھپانا دو بھر ہو گیا۔

”کیا آپ مجھے کام کی نوعیت بتا سکتی ہیں؟“ مسز نعمان کی دلچسپی ایک دم اس لڑکی میں بڑھ گئی تھی جو پنک کمر کے سوٹ میں سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے بڑے پُر اعتماد انداز میں ان کی طرف متوجہ تھی۔ سروی نے ان کی اس تشویش پر تعجب سے انہیں دیکھا اور پھر رمیض کو جو درجہ شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔

”حد درجہ سادہ خاتون ہیں، یہ تبھی بھائی کی باتوں میں آگئیں۔“ مسز نعمان نے تنبیہی نظروں سے رمیض کو دیکھا اور سروی کی طرف متوجہ ہوئیں، جو اُلجھن میں مبتلا تھی کہ ان کو کیا

ٹھیک دس منٹ کے بعد ملازم بیک اٹھانے اندر آ گیا تھا۔ اس نے بڑی ساری بلیک چادر میں خود کو ڈھانپ لیا تھا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی وہ باہر جیب میں آ بیٹھی تھی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس نے سجاد کی پشت کو دیکھا وہ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھا۔ گاڑی بہت جلد بانی پاس پر آ چکی تھی اور سجاد حد درجہ خاموش تھا۔ اسی وقت اس کے میل فون پر آنے والی کال نے مومنہ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور اگلے ہی لمحے اس اپنے ہاتھ پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ بہت ساٹ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”بابا انشا اللہ ہم جنازے کے ٹائم تک پہنچ جائیں گے اور جنازے کا ٹائم عصر کی نماز کے بعد ہی ہے نا.....؟“

”اب کون.....؟“ مومنہ کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا اور اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سجاد سے پوچھ لے کہ کس کے جنازے میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں؟ اس کی قوت گویائی گویا سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

”اچھا تو آپ ہیں سروی.....؟ مجھے یقین ہی نہیں آرہا کہ میں اتنی میلھڈ بچی سے حقیقت میں مل رہا ہوں۔“ نعمان صاحب نے پچھلے ایک گھنٹے میں کوئی پانچویں دفعہ یہ فقرہ بہت محبت اور شفقت سے دہرایا تھا۔

”پاپا اب ایسے کوئی پر نہیں لگے ہوئے، محترمہ کو جو آپ انہیں سر پر چڑھائے جا رہے ہیں۔“ عائش نے خوشگوار لہجے میں چھیڑا تو مسز نعمان نے غور سے اپنے بیٹے کو دیکھا، جس کے چہرے پر غیر معمولی چمک کا اضافہ ہو چکا تھا، رملہ اور رمیض نے بھی بھائی کی حد درجہ دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے کو معنی خیز اشارہ کیا تھا۔

وہ آج سروی کو خاص طور پر ماما اور پاپا سے ملوانے لایا تھا، حالانکہ اس کا کہنا تھا کہ سروی پاپا کی عیادت کے لئے آئی ہے، لیکن ماما نے ایک لمحے میں بھانپ لیا تھا کہ یہ لڑکی ان کے بیٹے کی زندگی میں کوئی خاص درجہ رکھتی ہے اور نعمان صاحب بھی بھرپور انداز میں چونکے تھے اور اپنی متوقع بہو کے حوالے سے انہیں عائش کا انتخاب زبردست لگ رہا تھا۔

”سروی یہ ماما کے ہاتھ کا پڑا کھا کر دیکھو، بھلا تم یقین کر سکتی ہو کہ یہ کسی کامیاب ڈاکٹر کے ہاتھوں کا بنا ہوگا؟“ عائش کے بے تکلف لہجے پر مسز نعمان نے چونک کر اپنے بیٹے کو دیکھا

بتائے اور پھر کچھ سوچ کر اس نے بتانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

”اچھو لی، وہ میری امی کی بہت اچھی دوست تھیں.....“ سروہی کے جواب پر سب چونکے۔

”کیا نام ہے تمہاری والدہ کا.....؟“ انہوں نے بے چینی سے پوچھا تو اس نے تعجب سے پھر انہیں دیکھا۔

”راحیلہ جول.....“ سروہی کے جواب پر انہیں جھٹکا لگا تھا۔ نعمان صاحب کے چہرے کے تاثرات بھی بہت تیزی سے بدلے تھے جب کہ مسز نعمان بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ایسی نظریں جن میں حیرت اور بے یقینی صاف پڑی جاسکتی تھی۔

”کہاں ہوتی ہیں وہ.....؟“ انہوں نے تھوک نگل کر حلق تر کیا، اب انہیں سمجھ آئی تھی کہ اس کا چہرہ اور نقوش شناسا کیوں لگ رہے تھے۔

”آپ جانتی ہیں انہیں..... میرا مطلب ہے میری والدہ کو..... انہوں نے میڈیکل کے تیسرے سال میں کالج چھوڑ دیا تھا، آپ نے میڈیکل کس کالج سے کیا تھا؟“ سروہی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”تم مجھے پہلے بتاؤ کہ تمہاری والدہ کہاں ہوتی ہیں“ انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

”ان کا انتقال ہو گیا ہے آج سے کافی سال پہلے۔“

”کیسے.....؟“ وہ سابقہ انداز میں بولیں۔

”ان کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔“ سروہی کی بات پر کمرے میں دھماکہ ہی تو ہوا تھا۔

”دیکھا نعمان صاحب وہی ہوا ناں.....!“ مسز نعمان کے انداز میں مبہم ہی بے بسی تھی اور آنکھوں میں ملال اور دکھ کے رنگ اتر آئے تھے۔

سروہی نے سخت حیرت سے بے آواز روتی خاتون کو دیکھا، جوٹھو سے بڑی نفاست سے اپنی آنکھیں اور ناک پونچھ رہی تھیں۔ عائش سے اس سے زیادہ مبرنہ ہوا۔

”میری ماما کا نام ہی ڈاکٹر سعدیہ ہے۔“ عائش کے انکشاف پر وہ اپنی جگہ سے بے اختیار اٹھی اور ان کے صوفے پر بیٹھ کر حد درجہ الجھن سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، کمرے میں ایک تکلیف دہ خاموشی پھیل گئی تھی۔

”آئی ایم سوری..... مجھے پتا نہیں تھا، لیکن آپ رو کیوں رہی ہیں؟“ اس کا اشتیاق

نظری تھا۔

”اس لئے کہ وہ میری عزیز جان دوست ہی نہیں بھابی بھی تھی۔ تم میرے سکندر بھائی کی

بٹی ہو.....“ وہ اس کے ماتھے پر بوسہ دے رہی تھیں۔

سروہی کو یوں لگا تھا جیسے کمرے کی چھت سر پر آن گری ہو، اس کی الجھن سوانیزے پر پہنچ گئی۔ کمرے میں صرف ڈاکٹر سعدیہ کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ بار بار اسے خود سے لپٹا کر پیار کر رہی تھیں۔ عائش، رملہ اور رمیض سخت حیرانی سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

”میں نے بہت کہا تھا کہ راحیلہ محبت کا یہ سفر بہت کٹھن ہے، اپنے قدم پیہیں سے موڑ لو، کیونکہ شاہ جی تو ویسے ہی بہت خار کھاتے ہیں، سکندر بھائی سے کیونکہ بڑے ابا کی غیر خاندان میں ہونے والی شادی کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا تھا اور پھر بڑے ابا کی وفات کے بعد ان کی حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہی تھی۔ بہت ظلم کمایا ہے، شاہ جی نے.....“ وہ اب آنسو صاف کر رہی تھیں، لیکن دوسرے ہاتھ سے انہوں نے اس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”وہ مجھ سے دو سال جونیئر تھی اور میری روم میٹ تھی۔ حد درجہ سادہ اور مخلص لڑکی تھی۔ میں نے اسے بہت کہا تھا کہ ہمارے ساتھ انگلینڈ چلو، کیونکہ شاہ جی سے تو میری بھی شادی ہضم نہیں ہو رہی تھی لیکن نعمان مجھے فوراً باہر لے آئے، ہم لوگ تو دو چار سال پہلے ہی پاکستان آئے ہیں۔“

”شاہ جی آپ کے کیا لگتے ہیں؟“ سروہی بری طرح الجھی ہوئی تھی۔

”میرے بڑے بھائی ہیں۔“ ان کی آنکھوں کے کنارے پھر بجینے لگے۔

”اور میرے قادر.....؟“

”وہ بھی بھائی تھے لیکن بڑے ابا نے دو شادیاں کی تھیں، بیوی کو خاندان والوں کی مخالفت کی بنا پر طلاق دے دی، لیکن بچے کو لے آئے تھے۔ سکندر بھائی کے ساتھ سب کا سلوک تو اچھا نہیں ہوتا تھا کیونکہ حویلی میں بے جی کی حیثیت خاصی مضبوط تھی، لیکن شاہ جی کی نسبت وہ ہم بہنوں سے بہت پیار کرتے تھے اور مجھے اکثر ہاشل چھوڑنے اور لینے آتے تھے، وہیں انہوں نے راحیلہ کو دیکھا تھا۔“ سروہی نے بے یقینی سے سامنے بیٹھی خاتون کو دیکھا۔ ان کا لہجہ اتنا سچا ٹھوس اور مستحکم تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے مزید سوال جواب نہیں کر پائی

وہ قدرت پر حیران تھی جس نے عجیب انداز سے اسے اپنے خاندان سے ملوایا تھا۔

”پھوپھو.....! کیا آپ کو یقین ہے کہ میرے بابا اور میری امی کا قتل شاہ جی نے ہی کرایا ہوگا.....؟“ سروہی نے الجھن بھرے لہجے میں پوچھا کیونکہ مسز نعمان جن کو سکندر شاہ کی موت کی تو خبر تھی، لیکن راحیلہ کی موت کے صدمے نے بالکل مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ ان کی آنکھوں اور چہرے پر صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔ وہ پھمکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

”اور بیٹا ان کی کس کے ساتھ دشمنی تھی۔ ان کے نکاح کی خبر جب حویلی پہنچی تو بے جی اور شاہ جی دونوں بہت چراغ پا ہوئے تھے، سکندر بھائی اسے لے کر کسی خفیہ جگہ منتقل ہو گئے تھے، لیکن اباجی کی وفات پر جب وہ حویلی آئے تو واپس آتے ہوئے بقول شاہ جی ڈاکوؤں کی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے، لیکن لوگ اندھے تھوڑی ہوتے ہیں۔ اس وقت راحیلہ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ پھر میں اور نعمان تو انگلینڈ چلے گئے تھے اور کسی سے رابطہ نہیں رہا۔“ انہوں نے گہری سانس بھر کر اس کے ہاتھ کی پشت کو سہلایا تھا۔ سروہی کی تو گویا روح تک بھونچال کی زد میں تھی۔ آنسو تھے کہ ٹپکنے کو بے تاب جب کہ رملہ رمیض اور عائش پر تو گویا حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے وہ حق دق سے سارا قصہ سن رہے تھے۔

”اما، آپ کون سی فلم کی اسٹوری سن رہی ہیں جس میں پھڑے ہوئے رشتے دار اچانک مل جاتے ہیں۔“ رمیض نے حد درجہ تعجب و بے یقینی سے کہا اور وہ جو کسی گہری سوچ میں تھیں، چونک اٹھیں۔

”بیٹا! زندگی فلموں سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے، ابھی تم نے ہماری حویلی کا ماحول نہیں دیکھا۔ جہاں لڑکیوں کے بعض اوقات سانس لینے پر بھی پابندی لگ جاتی ہے۔“

”کیا.....؟ دماغ خراب ہے کیا، حویلی والوں کا.....؟“ وہ برجستہ بولا تھا جب کہ ڈاکٹر سہدیہ کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”بی بی جی..... ڈرائنگ روم میں کوئی معظم علی صاحب اور ان کے بیٹے آئے بیٹھے ہیں۔“ ملازم کی اطلاع پر ڈاکٹر سہدیہ کے چہرے کی رنگت اڑی جب کہ نعمان صاحب کو پہلی دفعہ نایاب کی کمی کا احساس ہوا۔

”نایاب کہاں ہے سہدیہ.....؟“ انہوں نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا جب کہ وہ جو بری طرح ابھی بیٹھی تھیں۔ انہیں اپنے کندھے پر سروہی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا جو پریشانی

سے انہیں کلم صم دیکھ رہی تھی۔

”پھوپھو کیا ہوا؟“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر یہ معظم علی وہی تو نہیں ہیں جو شاید منسٹر بھی ہیں۔“ سروہی کا دل کوفت سے بھر گیا۔

”یہ آپ کے کیا لگتے ہیں.....؟“ وہ ایک دفعہ پھر ابھی تھی جبکہ وہ آہستگی سے کھڑی ہوئیں اور نرمی سے بولیں۔

”میرے تو چچا زاد کزن اور بہنوئی جب کہ آپ کے وہ پھوپا اور چچا بھی لگتے ہیں۔“

”کیا.....؟“ سروہی کو یہ حوالہ جات بالکل بھی پسند نہیں آئے تھے، ابھی اس کے چہرے پر کوفت اور بیزاری کے سائے بڑی تیزی سے پھیلے تھے۔

”مبارک ہو سارے ناپسندیدہ لوگ تمہارے رشتے دار نکل آئے۔“ عائش نے ماحول کی سنگینی کو کم کرنے کے لئے اسے چھیڑا تو وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ ایک لمحوں کو تو وہ دھک سے ہی رہ گئی تھی۔

”چلیں نعمان صاحب آج یہ مرحلہ بھی نبٹا آئیں۔“ ڈاکٹر سہدیہ پر جیسے بے حد غلٹ و پریشانی سوار تھی۔

”ٹیک اٹ اپ بی بی..... بی ریکس.....“ انہوں نے انگلیوں کی پوروں سے پریشانی مسلط ہوئی بیگم کو تسلی دی جبکہ وہ خاموشی سے لب دانتوں سے کچل رہی تھیں۔

”آؤ بیٹا آپ بھی آؤ اس وقت آپ جیسی بولڈ اسپیکر کی سخت ضرورت ہے۔“ نعمان صاحب نے بھی ماحول کی کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش میں خوشگوار انداز اختیار کیا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی حالانکہ..... اس وقت تھکن و جود میں جھنجھلاہٹ اعصاب پر پنچے گاڑے ہوئے تھی۔

* * *

اس انکشاف پر لگتا تھا کہ دلاور کے سر پر جھٹ آن گری تھی۔

وہ کم صم چپ چاپ ہسپتال کے بیڈ پر بے بسی کی حالت میں پڑے شاہ جی کو دیکھ رہا تھا۔ جن پر ایک ہفتہ پہلے سوتے ہوئے فاج کا زبردست ایک ہوا تھا اور پورے ایک ہفتے سے وہ صبح شام چوبیس گھنٹے اس مہنگے پرائیویٹ ہسپتال میں شاہ جی کے ہمراہ تھا۔ ان کے جسم کا دایاں حصہ مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔

اور شاہ جی قدرت کی اس ستم ظریفی پر شکوہ کرتے بھی تو کیسے.....؟ ساری زندگی جو بویا اب وہی کاٹ رہے تھے۔

مدیہ بیگم جن کی آنکھوں سے ہر وقت غرور اور لہجے میں دوسروں کے لئے تحقیر کے شعلے نکلتے تھے۔ اس وقت وہ ہوش و حواس سے بے گانہ لان میں بیٹھی خاک اٹھا کر اپنے سر میں ڈالتی رہتیں اور زیادہ دماغ التنا تو اونچی آواز میں قہقہے لگاتیں، کبھی ان کو رسی کی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی تو کبھی آمنہ آکر خوابوں میں ڈراتی، یہی حال شاہ جی کا تھا۔ جب یہ سوچے کہ حویلی اور زمینیں ساری جائیداد اب کس کام کی؟ تو دل و دماغ پر وحشت اور مایوسی پہنچ گزرتی۔ مسلسل ذہنی تھکن نے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا تھا اور جس کا نتیجہ اس فالج کی صورت میں سامنے تھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے تمام معاملات دلاور کے سر پر چل رہے تھے، لیکن آج رات شاہ جی کو نہ جانے کیا ہوا تھا۔ وہ اعصاب کی جنگ سے ہار کر اس کے سامنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس حقیقت کا پردہ چاک کر گئے تھے، جس سے بہت کم لوگ واقف تھے۔

دولت، جائیداد اور اقتدار بہت آزمائش والی چیزیں ہیں، وہ نہیں جانتا تھا کہ اتنے سال بعد اسے پتا چلے کہ وہ شاہ جی کے کسی منشی کا بیٹا نہیں..... اس نے تو ہوش سنبھالتے ہی یہی سنا تھا کہ اس کے والدین کسی حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے اور وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس نے اس کہانی پر من و عن یقین کر لیا تھا، لیکن اب تو لگتا تھا کہ اس کے سر پر دھماکا ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سامنے بیڈ پر لیٹے ہوئے شخص سے نفرت کرے یا ہمدردی.....؟

ایک ہفتے میں ہی آسمان سے زمین پر گرنے والا یہ شخص مکافات عمل کا شکار ہوا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ بہت سالوں سے ہویا ہوا ضمیر بھی جاگ اٹھا تھا اور اسی کے زیر اثر انہوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ان کے سوتیلے بھائی سکندر کا بیٹا ہے، جسے وہ جائیداد تقسیم نہ ہونے کے خوف سے اغوا کر کے لے آئے تھے اور یہ کہ اس کے والدین کی موت کے ذمے دار بھی وہی تھے۔

وہ کسی دھن میں اس کے سامنے یہ راز تو کھول بیٹھے تھے، لیکن اب اس کے سپاٹ اور جامد وجود سے انہیں خوف آ رہا تھا۔ وہ اس وقت سے شاک کی حالت میں بس کمرے کی چھت کو گھورے جا رہا تھا، کبھی کبھی ایک سرد نگاہ ان کے بے بس وجود پر بھی ڈال لیتا تھا۔ وہ اس

وقت اپنے اعصاب کے ساتھ ایک بہت بھاری جنگ لڑنے میں مصروف تھا۔ کبھی دل کہتا کہ اس ظالم اور متکبر انسان کا حشر نشر کر دے، اس کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور اسے ایک اذیت ناک موت سے ہمکنار کر دے۔“

”دلاور علی، تمہارا نام دلاور ہے کیا کسی بے بس، نہتے اور بیمار بندے سے ایسا سلوک کرو گے؟ تف ہے تمہاری مردانگی پر.....“ دوسرے لمحے دل کہتا۔

”آخر تمہارے بے قصور والدین کا کیا قصور تھا؟ جو اس ظالم شخص نے ان سے زندگی کی سانسیں چھین لیں اور پھر تمہارا مذہب خود کہتا ہے کہ اگر تم پر کوئی ظلم کرے تو تم اتنا ہی بدلہ اس سے لے سکتے ہو اور پھر ظالم کو چھوڑ دینا اسے شہ دینے کے مترادف ہے۔“ اسی وقت ضمیر نے دل کو دھکا دیا اور کہا۔

”تم کیوں ایک انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا رہے ہو اور بہکا رہے؟ اگر مذہب بدلہ لینے کی اجازت دیتا ہے تو آگے یہ بھی تو کہتا ہے کہ اگر معاف کر دو تو یہ افضل ہے۔“ دلاور کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر شاہ جی نے بے بسی سے اسے دیکھا اس وقت وہ اس کے ساتھ اس پرائیویٹ روم میں تھاتھے۔ تھوڑی دیر پہلے گفتگو بیگم عرہ اور اریہ ان کو دیکھنے آئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اب وہ دلاور کے رحم و کرم پر تھے۔

”مم..... مجھے..... معاف..... کر دو..... مم..... مجھ پر..... رحم کرو.....“ وہ بے آواز روتے ہوئے اس سے معافی مانگ رہے تھے۔ خوف نے ان کی حالت غیر کر دی تھی اور یوں بھی جب انسان کو موت کی چاپ سنائی دینے لگے تو وہ آخری حد تک جانے کی کوشش کرتا ہے اور زندگی بھر کیے ہوئے گناہ اور زیادتیاں اس کا دامن پکڑ کر اسے خوفزدہ کرتی ہیں، ڈراتی ہیں، تب انسان پیچھے کی طرف بھاگنے کی بہت کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح وقت کا پہرہ پیچھے کی طرف گھوم جائے..... مگر وقت کی ڈور انسان کے ہاتھ سے پھیل جاتی ہے اور پچھتاوے ہی پچھتاوے رہ جاتے ہیں..... اور یہی حال شاہ جی کا ہوا تھا..... ان کو یاد آ رہا تھا کہ کس طرح انہوں نے اپنی بہن روینہ کو اپنی انا کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ معصوم سی آمنہ کو صرف اور صرف اپنی ضد کی خاطر معظم کے چھوٹے بھائی سے بیاہنے کے بجائے بارہ تیرہ سالہ بچے کے ساتھ بیاہ دیا تھا اور جائیداد باہر نہ چلی جائے اس خوف سے صفیہ کی شادی قرآن شریف سے کر دی تھی۔ اپنے سرکش، خود سر اور آوارہ بیٹے کے ہر ناجائز کام پر اس کی پشت پناہی کی تھی۔

دلاور اب کھڑا ہو گیا تھا۔ پرائیویٹ ہسپتال کے کاریڈور میں اب اس نے ٹہلنا شروع کر دیا تھا، وہ جتنا خود کو پُر سکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اتنا ہی اس کے اندر الاؤ بھڑکتا جا رہا تھا۔ اس انکشاف نے لگتا تھا کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود کر دی گئیں، اعصاب پر بھاری بوجھ آن پڑا تھا، چلتے چلتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ وہ باہر رکے بیچ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔

”میری والدہ کون تھیں؟“ اس سوال کے پیدا ہوتے ہی اسے یوں لگا جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو وہ پھرتی سے اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر شاہ جی کے سر پر پہنچ گیا۔ شاہ جی کی رال بہہ رہی تھی اور سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی..... انہوں نے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا وہ بہت تیز..... نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”شاہ جی ایک احسان مجھ پر کریں مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ میری والدہ کون تھیں؟“

”تمہاری پھتی سحدیہ..... کی دوست..... کس..... سا ہیوال سے۔“ انہوں نے ایک ایک کر بے شکل بات مکمل کی تھی۔

”کیا میری کوئی جڑاؤں بہن بھی تھی.....؟“ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”مم..... مجھے علم میں نہیں.....“ انہوں نے بے بس لہجے میں جواب دیا۔

”کیا وہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھیں.....؟“ وہ تڑتڑ سوال کر رہا تھا۔

”ہاں.....!“ شاہ کے ہاں سے میں سر ہلاتے ہی اس کے ذہن کی گرہ کھل گئی تھی۔

”شاہ جی کاش کہ میں ایک بزدل، گھٹیا اور کمینہ انسان ہوتا اور اپنے سامنے پڑے اپنے والدین کے قاتل کا خون کر دیتا، لیکن افسوس کہ میری رگوں میں جن والدین کا خون دوڑ رہا ہے اس کی کشش مجھے ایسا کرنے سے روک رہی ہے..... آپ نے جو کچھ کیا، اس کے کیے کا پھل کچھ تو دنیا میں پالیا اور کچھ آخرت میں پائیں گے، لیکن جو حسن سلوک آپ نے میرے ساتھ روا رکھا ساری زندگی میں اس کی وجہ سے آپ کو دل سے معاف کرتا ہوں۔“ دلاور کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر شاہ جی نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا..... وہ اب بے آواز رہے تھے۔ دلاور کو اپنے سامنے پڑے بے بس وجود پر بہت ترس آیا۔

”میں کوشش کروں گا کہ اگر آپ کو علاج کی غرض سے باہر بھی لے جانا پڑا تو دریغ نہ کروں۔ میں آج ہی ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔“ دلاور نے ان کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دہانی تو د

آکھ کے اشارے سے منع کرنے لگے۔ اس لمحے جانے کیوں دلاور کو لگا، ان کے اندر زندگی کی رتی بجھ گئی ہے۔

ڈاکٹر سحدیہ اور نعمان صاحب کے ڈرائنگ روم میں حد درجہ گہرا سناٹا تھا۔ حالانکہ اس وقت ان دونوں میاں بیوی کے علاوہ معظم علی، بلاول، رملہ، عائش، نایاب، رمیض اور سردی موجود تھے، معظم علی بلاول کے کہنے پر ان کے ہاں آئے تھے، لیکن سامنے اپنی فرسٹ کزن اور سابقہ بیوی کی بہن سحدیہ کو دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔

کئی لمحوں تک تو ان سے بولا نہیں گیا۔ وہ بے یقینی سے بس دیکھتے رہ گئے۔ حیدر کی اچانک موت اور شاہ جی کی بیماری نے انہیں خوف میں مبتلا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے خاصا مثبت پہنچ ان میں آیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ پچھلے آدمے کھٹے میں چار دفعہ بلاول اور نایاب کی جذباتی غلطی پر ان سے معافی مانگ چکے تھے اور سحدیہ سخت حیرت سے ان کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ رہی تھیں۔ حویلی کی روایات کے مطابق اپنے کزنز سے ان لوگوں کا زیادہ میل جول تو نہیں تھا لیکن روینہ باجی کے حوالے سے وہ ان کے بہنوئی تھے اور ان سے متعلقہ ہر اچھی بُری خبر حویلی میں فوراً پہنچ جاتی تھی۔

”آپ نے روینہ باجی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ سحدیہ نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو گلہ کرنے سے روک نہیں سکیں۔

”میں مانتا ہوں کہ میں نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ اپنے ازنی پُر اعتماد انداز میں بولے۔

”لیکن اس میں زیادہ قصور آپ کے بھائی کا تھا، دوسری شادی کوئی گناہ تو نہیں..... اور مجھے حیرت ہے شاہ جی پر کہ اگر وہ ساری زندگی تایا یعنی اپنے والد اور میری دوسری شادی کو معاف نہیں کر سکے تو انہوں نے خود ایسا کیوں کیا.....؟“

”ان کو آپ کی اسٹیج پر پر قارم کرنے والی ایکٹریس سے شادی پر اعتراض تھا۔“ سحدیہ نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔

”چلیں..... میں مانتا ہوں کہ ان کو یہ اعتراض تھا تو پھر تایا نے تو دوسری شادی سید فیملی میں ہی کی تھی، اس عورت کا گناہ غریب ہونا تھا، کیا.....؟“ معظم علی کی دلیل پر وہ کچھ لمحے کے لئے کچھ بول ہی نہیں سکیں۔

”بہر حال.....!“ نعمان صاحب قدرے توقف کے بعد بولے۔ ”جو ہوا سو ہوا“ باوجود اس کے کہ ہمیں اس چیز نے بہت دکھی کیا، لیکن بعض بچوں کی محبت والدین کے پیروں کی زنجیر بن جاتی ہے، اس کے سمسٹر رہتے ہیں، تب تک رملہ بھی فارغ ہو کر آجائے گی، تب رخصتی کریں گے۔“ نعمان صاحب کے قدرے نرم لیکن سنجیدہ لہجے پر بلاول اور نایاب کے چہروں پر پھیلنے والی مسرت کے رنگ بڑے فطری بے تھے۔

”یہ جو بچی سامنے ہے یہ تو آپ کی بیٹی ہے، جب کہ ساتھ میں.....؟“ معظّم علی جو کہ سروی کو وہاں دیکھ کر سخت حیرت زدہ تھے۔ زیادہ دیر تک اپنی حیرت چھپانہ سکے..... سروی کے لیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”یہ سکندر بھائی کی بیٹی ہے اور آپ کی بھی بھتیجی ہوئی۔“ سعدیہ نے سادگی سے کہا تو..... تو وہ بے اختیار پہلو بدل گئے۔

”کیا مطلب؟ سکندر کا صرف ایک بیٹا نہیں تھا؟ شاہ جی سے تو یہی سنا تھا۔“ معظّم علی کو الفاظ تلاشنے میں دقت ہوئی۔

”ان کو پتا ہوتا تو یہ زندہ تھوڑی ہوتی۔“ سعدیہ کے لہجے میں تلخی در آئی۔

”ہوں تو کیا یہ آپ کے پاس ہی رہتی تھی؟“ معظّم علی کے حیران لہجے پر سروی نے چوک کر انہیں دیکھا، جنہوں نے فوراً سر جھکا لیا تھا۔

”بس کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔“ ڈاکٹر سعدیہ نے گول مول بات کی تو وہ کندھے اچکا کر رہ گئے۔

”بھئی سعدیہ کچھ کھانے والے کا بندوبست کروائیں۔ آج تو آپ کے میکے کے لوگ پہلی دفعہ آئے ہیں۔“ نعمان صاحب کے گفتگوئے انداز پر سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسی لمحے معظّم علی اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے وہ جھٹکے سے کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔

”اوہ نو.....! ایک گہری اور لمبی سانس لے کر وہ بلند آواز میں بولے۔

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ سب نے دہل کر ان کی طرف دیکھا، جن کے چہرے پر ڈکھرنج اور ملال ہی ملال بکھرا ہوا تھا۔

”اور معاف کیجیے گا روبینہ کو چھوڑنے کا میرا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔ وہ میری پہلی اور خاندانی بیوی تھی۔ میرے دو بچوں کی ماں تھی، لیکن اس نے شاہ جی کے بھڑکانے پر اپنا گھر خراب کیا اور اس کو طلاق میں نے نہیں دی تھی، اس نے شاہ جی کے کہنے پر خلع کے لئے عدالت میں درخواست دے دی۔ میں اپنے گھر کی باتیں اخبارات میں اچھالنا نہیں چاہتا تھا، تبھی مجبوراً فارغ کر دیا۔ حالانکہ میں نے اسے بارہا فون کر کے منانے کی کوشش کی اور کہا..... مبارک پور کی خویلی میں تمہارے علاوہ کوئی نہیں آئے گا، مگر اسے نہ جانے کس چیز کا زعم تھا اور اس کے بعد بھی زندگی ساری اس نے کبھی اپنی اولاد سے بھی رابطہ نہیں کیا۔ یہ بیٹھا ہے بلاول آپ اس سے پوچھیں، ایسا بھی کیا شاہ جی کا ڈر کہ وہ اپنی جوان اولاد سے بھی بات نہ کر سکے۔“ معظّم علی نے بتایا، تو سعدیہ کو بھی تاسف نے گھیر لیا۔

”بہر حال! یہ میرا بیٹا آپ لوگوں کے سامنے ہے اور یہ صرف میرا بیٹا نہیں آپ کا بھانجا بھی ہے، پسند کی شادی جرم نہیں لیکن جو طریقہ انہوں نے اپنایا، وہ قطعاً پسندیدہ..... نہیں۔ ہمارے معاشرے میں..... یہ ماشاء اللہ ایجوکیٹڈ، خوب صورت اور ہر لحاظ سے قابل لڑکا ہے، اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو جو غلطی یہ کر چکے ہیں، ہم لوگ اسے بہتر طریقے سے پینڈل کر سکتے ہیں، لیکن یہ اگر آپ کو اس لحاظ سے پسند نہیں تو جو فیصلہ آپ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔“

”دیکھیں معظّم صاحب.....!“ نعمان صاحب مُردار انداز میں مخاطب ہوئے۔ ”میں آپ کی اس پیشکش کی دلی قدر کرتا ہوں۔ بہر حال جو ہوا یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ بہتر طریقہ نہیں تھا، لیکن اب ہم محض اپنی ذاتی انا یا کسی جذبے کی تسکین کی خاطر کسی کی زندگی سے کھیل نہیں سکتے اور یہ بچہ بھی عائش کے بہترین دوست کا دوست ہے اور عائش بھی اسے ذاتی طور پر جانتا ہے، مجھے تو اس میں کوئی ایسی خامی نظر نہیں آئی، سوائے اس کے کہ یہ بھی میری بیٹی کی طرح بے وقوف اور جلد باز ہے.....“ نعمان صاحب کی بات پر سنجیدہ اور خاموش بیٹھے بلاول نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ شرمندگی اس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

”بہر حال.....!“ وہ تھوڑا سا زکے..... نایاب نے خوفزدہ انداز سے باپ کی طرف دیکھا، جب کہ سعدیہ اب مطمئن تھیں، جب کہ سروی سخت حیرت سے سب کچھ سن رہی تھی، ساتھ بیٹھی رملہ نے اسے مختصر الفاظ میں نایاب کی اس حرکت کے بارے میں بتایا تھا، تبھی ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”ہاں بیٹا.....!“ انہوں نے گہری سانس لی اور بے چینی سے پہلو بدلا کیونکہ کان عرصے کے بعد اس نے خود سے کوئی بات کی تھی، ورنہ اب خواتین کے باتوں کے جواب میں ہی چند الفاظ بولتا تھا۔ البتہ خواتین کے علاوہ حویلی کے تمام معاملات کو وہ پہلے کی طرح معاملہ نبی سے سرانجام دے رہا تھا۔

”بولو بیٹا.....!“ بے جی نے محبت اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بے جی! جو کچھ ہوا مجھے نہیں معلوم اس میں خدا کی کیا مصلحت تھی۔ میرے برا بھلا کہنے سے یا شاہ جی سے کوئی بدلہ لینے سے میرے مرحوم والدین واپس نہیں آجائیں گے۔ میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے ان کو معاف کر دیا ہے۔ دولت کی ہوس انسان سے برے بھلے کی تمیز چھین لیتی ہے اور ہوس کے زیر اثر انہوں نے سب کچھ کیا.....“ اس نے ہلکا سا توقف کیا اور جب بولا تو اس کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔ ”لیکن میں اب جو کچھ کر رہا ہوں وہ صرف اللہ کی رضا اور اپنے ضمیر کی خاطر اس لیے مجھ پر یقین رکھیں میں آپ لوگوں کے ساتھ کچھ برا نہیں کروں گا..... اس لیے پلیز میری طرف سے کبھی بھی خوفزدہ ہو کر یا بدگمان نظروں سے مت دیکھا کریں میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں، لیکن بد اعتمادی کی ایک نظر بھی نہیں.....“ بے جی اور دروازے میں کھڑی گلختہ بیگم، روبینہ پھوپھو اور مومنہ، عروہ شرم سے پانی پانی ہو گئیں انہوں نے خفت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”اور اگر آپ کو یہ شبہ ہے کہ میں کسی لالچ کے تحت یہ سب کچھ کر رہا ہوں تو میرا یقین کریں ایسا ہرگز نہیں..... شاہ جی کے ٹھیک ہوتے ہی میں تمام پھوپھو اور مومنہ، عروہ اور روبینہ کا حصہ ان کو دلوادوں گا اور حویلی کی کسی عورت کے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے رکا تو گلختہ بیگم فوراً بولیں۔

”دلاور بیٹا..... مزید کہہ کر ہمیں شرمندہ مت کر، ہم لوگ تو بس اس وجہ سے خوفزدہ تھے کہ کہیں تم ہمیں چھوڑ کر نہ چلے جاؤ اور شاہ جی نے تو ساری زندگی کسی کے ساتھ بتائی نہیں۔“

”تائی ای میں بھلا ایسا کیوں کروں گا؟ اور کہاں جاؤں گا بتائیں.....؟“ وہ ان کے سامنے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بہت نری اور اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔ وہاں موجود سب خواتین کو اپنی پلکیں بھٹکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور بہت دنوں کے بعد عروہ کو اپنا آپ

ہسپتال کے کارڈیور کے اختتام پر کھڑی عروہ نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”دلاور بابا ٹھیک تو ہو جائیں گے ناں.....؟“

دلاور خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر کھست خوردگی سے سر جھکا لیا۔ عروہ نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں مایوسی اور بے بسی کے رنگ نمایاں تھے۔ وہ پہلی کی نسبت خاصا کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور گہرے حلقے وہ پچھلے بیس دن سے دن رات شاہ جی کے ساتھ تھا، جن کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔

”دلاور.....!“ اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے لائق سے اس شخص کو بازو سے ہلایا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا جس کی پلکوں پر چند قطرے نکلے ہوئے تھے۔ دلاور کا دل تاسف سے بھر گیا۔ جب سے دلاور کی حقیقت شاہ جی نے بے جی اور گلختہ بیگم کو بتائی تھی۔ وہ سب لوگ اس سے بے پناہ خوفزدہ تھے اور بعض اوقات شرمندگی سے آنکھیں چرانے لگتے۔

روبینہ پھوپھو تو بار بار ہاتھ مل کر کہتیں۔ ”شاہ جی نے ہمیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ عروہ کو اس کے چہرے پر ان گنت حکایتیں غمتی بگڑتی نظر آتیں..... بے جی کو لگتا کہ دلاور کی خاموشی کے پیچھے کوئی طوفان چھپا ہوا ہے..... وہ لوگ خنجر تھیں کہ وہ کچھ تو بولے، کوئی ناراضی بھری نظر، کوئی ملاحتی جملہ، کوئی طنز یا انداز یا کوئی دھمکی، لیکن وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا اور خاموشی سے شاہ جی کے کام کیے جاتا۔ کبھی کبھی بے جی اس کی طرف سے مٹھک ہو جاتیں کہ کہیں وہ شاہ جی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے، لیکن اگلے ہی لمحے اسے دلجمعی اور خلوص سے ان کے کام کرتے دیکھ کر وہ اپنی سوچ پر بری طرح شرمندہ ہو جاتیں۔

اس دن ڈرائیور بے جی کو لے کر اسپتال آیا تو شاہ جی کے ساتھ والا کمرہ انہوں نے حویلی کی خواتین کے لیے مخصوص کر دیا رکھا تھا، اس میں بے جی کے سامنے بیٹھتے ہی اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”بے جی..... اگر آپ اجازت دیں تو شاہ جی کو باہر لے چلیں، میں نے کچھ ڈاکٹرز سے مشورہ کیا ہے اور ان کی رپورٹس بھی باہر بھجوائیں ہیں، وہاں سے مثبت جواب آیا ہے۔“

”بس بیٹا جو بھی مناسب سمجھو کرو یا کرو..... شاہ کے بعد اب تم ہی تو واحد سہارا ہو۔“

بے جی کی آنکھیں نم اور لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

”بے جی ایک بات کہوں.....؟“ وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور محبت سے ان کا

جیب لال حویلی کی طرف جانے والی لمبی اور تارکول سے بنی سڑک کی طرف مڑ گئی تھی۔ پوری سڑک پر دائیں بائیں بے شمار گاڑیاں کھڑی تھیں اور حویلی کا بڑا سارا گیٹ کھلا ہوا تھا اور سامنے وسیع اور کشادہ لان میں لگا ٹینٹ بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مومنہ کو کسی غیر معمولی واقعے کا احساس ہوا..... تبھی وہ گھبرا کر تشویش زدہ آواز میں بولی۔

”یہ حویلی میں اتنے لوگ کیوں اکٹھے ہیں.....؟ کیا ہوا ہے؟“

ہر طرف ایک جم غفیر تھا..... ان کی جیب اندر داخل ہو چکی تھی؛ جیب کے شیشے نیچے کرتے ہی اندر سے آنے والی خواتین کی دھاڑیں مار مار کر رونے والی آوازیں اور بین نے مومنہ کو حواس باختہ کر دیا تھا..... اس نے ہراساں ہو کر سجاد کو دیکھا جو بہت دھیمے اور رنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”شاہ جی انتقال کر گئے.....“ اور مومنہ کو یوں لگا تھا جیسے ساری حویلی اس کے اوپر آن مری ہو۔

* * *

وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا، سبھی رنگ اتار کے شہر کا کوئی فحش تھا مرے شہر میں کسی دور پار کے شہر کا چلو کوئی دل تو اداس تھا، چلو کوئی آنکھ تو نم رہی چلو کوئی در تو کھلا رہا، شب انتظار کے شہر کا سو متاع جاں کو لیے ہوئے پلٹ آئے تیرے گرفتہ دل کے بیچتے کہ ملا نہیں، کوئی اعتبار کے شہر کا مری طرز نغمہ سرائی سے، کوئی باغباں بھی تو خوش نہ تھا یہ مرا مزاج ہے کیا کروں کہ میں ہوں بہار کے شہر کا کسی اور دیس کی اور کو سنا ہے فراز چلا گیا سبھی دکھ سمیٹ کے شہر کے سبھی قرض اتار کے شہر کا

شاہ جی کی تدفین کو آج پانچواں روز تھا۔ پوری حویلی میں ایک طرف سوگ اور دکھ کی کیفیت طاری تھی اور دوسری طرف ڈاکٹر سجدہ یہ اور ان کے بچوں کو دیکھ کر بے جی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے احساسات کو کس طرح بیان کریں۔ وہ کبھی ان کے بچوں کو پیار کرتیں تو

ہلکا پھلکا محسوس ہوا تھا۔

* * *

جیب دھول اڑاتی ہوئی دینا پور کے کچے کچے راستوں پر گمازن تھی۔ آج موسم خاصا گرم تھا اور سورج بھی سوانیزے پر..... باہر کے مقابلے میں جیب کے اندر کی فضا خاصی ٹھنڈی تھی۔ اسے سی کی کولنگ نے موسم کی سنگینی کو خاصا کم کر دیا تھا، مومنہ کا دل سہا ہوا تھا..... اسے راستے میں شدید سردی کی وجہ سے سجاد نے ایک ٹیبلٹ دے دی جسے کھانے کے فوراً بعد ہی اسے نیند آ گئی تھی۔ اب اس کی آنکھ کھلی تو پہلے تو اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ کہاں ہے؟ اور یہ احساس ہونے کے بعد اسے صبح کا واقعہ یاد آیا تو دماغ میں ایک دفعہ پھر دھماکے سے محسوس ہونے لگے تھے۔

اس نے کن آنکھوں سے اگلی سیٹ پر بیٹھے حد درجہ سنجیدہ سے سجاد کو دیکھا اور پھر جیب کے شیشوں سے باہر کے مناظر دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ دینا پور پہنچنے والے ہیں۔ اسے حد درجہ تھابت اور کمزوری کا احساس ہو رہا تھا اور آج کل تو اسے اپنے اندر اچھی خاصی تبدیلیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن یہ بات سجاد سے شیر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

”کیا ہم واقعی لال حویلی جا رہے ہیں.....؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہوں.....!“

”بے جی تو ٹھیک ہیں ناں کہیں خدا نخواستہ.....!“ اس کا دل نہ جانے کیوں بار بار اپنی ضعیف دادی کی طرف ہی جا رہا تھا۔

”جا کر دیکھ لینا.....!“ اس نے مبہم سا جواب دیا۔

”آپ بتا کیوں نہیں دیتے؟“ اس نے اضطرابی لہجے میں کہا تو وہ تحمل سے بولا۔

”ممبر کرو، ہم لوگ دینا پور پہنچ تو چکے ہیں۔“

”شاہ جی جان نکال دیں گے۔ آپ کے ساتھ میری بھی.....!“ مومنہ نے غصے سے

اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں کہتے۔“ خلاف معمول سجاد کی آواز بہت ہلکی تھی۔ مومنہ کو اس کے غیر معمولی پن نے گھبراہٹ میں مبتلا کیا تھا، صاف ظاہر تھا کہ وہ اس موضوع پر بات کرنے سے کتر رہا تھا۔

کبھی سروہی کا ماتھا چوتیس تمام گرہیں مکمل چکی تھیں۔ روہینہ پھوپھو بیٹھے بیٹھے کبھی بھائی کی موت پر آنسو بہانے لگتیں تو کبھی سجاو اور بلاول کو اپنے پاس بیٹھا لیتیں۔ حویلی کے معاملات بے جی نے دلاور کے سپرد کر دیئے تھے۔ مدیحہ بیگم کو ان کے میکے والے آکر لے گئے تھے۔ دلاور نے بہت کہا کہ وہ ان کا علاج کروائے گا، لیکن ان کے بھائی کسی طور پر بھی راضی نہیں ہوئے تھے۔

”معلم علی بھی روز حویلی کا چکر لگا رہے تھے اور بے جی کے پاس بیٹھ کر چلے جاتے“ آج پورے پانچ دن کے بعد سروہی کو سجدہ پھوپھو میسر آئیں تو وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”پھوپھو.....! پلیز میری امی کے بارے میں بتائیں، کیسی تھیں وہ.....؟ ان کی شادی کیسے ہوئی؟“ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور پوری حویلی میں سکوت طاری تھا۔ رملہ اپنی کزن زعروہ، اریہ اور مومنہ کے کمرے میں تھی، جب کہ نایاب کا ٹھکانا بے جی کا کمرہ تھا۔ سجدہ اس کے بچکانہ انداز پر مسکرائیں جب پولیس تو ان کا لہجہ سہیلی کی محبت میں پور پور ڈوبا ہوا تھا۔

”بہت خوب صورت اور مخلص لڑکی تھی، حالانکہ مجھ سے دو سال جونیئر تھی۔ ہماری پہلی ملاقات ہاسٹل میں ہوئی تھی اور ہرگز رتا دن ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا اور وہیں ایک دفعہ سکندر بھائی نے اسے دیکھا تو میرے پیچھے پڑ گئے۔ ان دونوں کی محبت بہت مصوم اور پاکیزہ تھی.....“ سجدہ اپنے ماضی کی یادوں میں ڈوبی ہوئی بتا رہی تھیں۔

”پھر راحیلہ مجھے اپنے گاؤں لے کر گئی۔ میں نے باتوں باتوں میں اس کے والد سے پوچھا تو وہ اپنے اصولوں اور ذات پات کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھے اور وہیں راحیلہ پر انکشاف ہوا کہ وہ اس کی بات چیت اپنے کسی دوست کے بیٹے سے ملے کر چکے ہیں۔ راحیلہ کو اپنے پڑھے لکھے باپ کی اس بات نے بہت پریشان کیا۔ انہی دونوں شاہ جی سکندر بھائی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ وہ ان کی دوسری بیگم مدیحہ کے بھائی کی طلاق یافتہ بیٹی کے ساتھ شادی کر لیں، جو سکندر بھائی سے پورے دس سال بڑی تھیں اور سکندر بھائی ان بے جی کے شادیوں کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے بہت مزاحمت کی، لیکن شاہ جی بہت ضدی تھے اور راحیلہ کے والد یعنی تمہارے نانا بھی کسی طور راضی نہیں تھے..... مجبوراً دونوں کو یہ قدم اٹھانا پڑا..... راحیلہ کا خیال تھا کہ وہ اپنے والد کو مٹا لے گی، لیکن.....!“

”لیکن کیا.....؟“ سروہی نے بے تابی سے پوچھا۔

”لیکن.....!“ سجدہ نے صوفی کے پشت سے ٹیک لگا کر ٹکان زدہ انداز میں آنکھیں موندیں، وہ دونوں نیچے کارپٹ پر براجمان تھیں۔ ”لیکن سکندر بھائی کی موت نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اسے اپنا میڈیکل بھی درمیان میں چھوڑنا پڑا۔ ان کی موت کے بعد اس نے مجھے روتے ہوئے فون کیا تھا۔ ان دنوں میں ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ میرے اور نعمان کے نکاح کی خبر کھلی نہیں تھی، لیکن بھائی صاحب کے جارحانہ انداز نے مجھے بھی خوفزدہ کر دیا، تبھی میں اور نعمان صاحب خاموشی سے باہر چلے گئے۔“

”پھر..... پھوپھو.....؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ انہوں نے اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”حالانکہ میں نے اسے کہا تھا کہ میرے ساتھ باہر چلو، لیکن وہ راضی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد مجھے پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا، اب تمہی سے پتا چلا کہ وہ دارالامان چلی گئی تھی اور اس کی دوسری شادی کی بھی مجھے کوئی اطلاع نہیں..... لیکن اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ذاتی طور پر بہت دکھ ہے۔“ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”پھوپھو.....!“ سروہی نے کچھ سوچ کر ان کو پکارا۔

”ہوں.....!“

”ایک بات پوچھوں اگر آپ کو برا نہ لگے تو.....؟“ چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”ارے بھئی، بتا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بے فکر ہو کر پوچھو.....!“

”پھوپھو.....! آپ کو شاہ جی نے حویلی کی روایات کے برعکس پڑھایا، لکھایا اور بتاتی ہیں کہ آپ ان کی بہت لاڈلی بہن تھیں اور آپ کو بعض اوقات وہ خاصی رعایت دے جاتے تھے، پھر آپ نے ایسے شادی کیوں کی؟“ سجدہ دھیرے سے مسکرائیں۔

”میں حویلی کی سب سے شرارتی، ذہین لیکن باغی لڑکی تھی۔ یہ شاہ جی کا واقعی مجھ پر احسان ہے کہ انہوں نے مجھے پڑھنے کی اجازت دی، لیکن میں بچپن سے اپنے خاندان میں رائج غیر اسلامی رسومات کے سخت خلاف تھی۔ مجھے سخت نفرت تھی ان سے..... اور جب شاہ جی نے روہینہ باجی اور آمنہ کو اپنی انا کی بھینٹ چڑھایا اور صفیہ کی شادی قرآن پاک سے کر دی“

پر اتر آتا ہے اور بعض دفعہ تو مرد بس عورت کے جذبات سے کھیل رہا ہوتا ہے اور وہ بے وقوف اسے محبت سمجھ لیتی ہے جیسے کہ رسلی نے کیا اور بعض دفعہ تقدیر عجیب کھیل کھیل جاتی ہے جیسے کہ تمہاری ماں کے ساتھ ہوا۔“

”ہوں ٹھیک کہتی ہیں آپ.....“ سروہی کے دل میں اوپر سے نیچے تک تاسف ہی تاسف بھر آیا۔

”بہر حال مبارک ہو اللہ نے تمہیں تمہارے بھائی سے ملوایا۔“ سعدیہ پھوپھو نے خوش دلی سے کہا تو وہ آہستگی سے مسکرا دی۔

”کیسا لگا آپ کو میرا بھائی.....؟“ وہ بہت دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

”ماشا اللہ بہت خوب صورت اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔ سکندر بھائی بالکل ایسے ہی تھے۔“ وہ محبت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں اور سروہی کا دل خوشی سے لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آج کل آتے جاتے دلاؤ کو تنگ کر رہی تھی اور چھیڑ رہی تھی کہ وہ جان بوجھ کر اس سے انجان بنا ہوا تھا اور وہ بھی بس مسکرا کر رہ جاتا۔

روبینہ پھوپھو ابھی ابھی مومنہ کا تفصیلی چیک اپ کروا کے واپس لوٹی تھیں۔ جب سے خوشی سے بے حال تھیں اور سجاد دل جان کر انہیں تنگ کر رہا تھا اور بار بار تکلفہ مامی سے کہتا۔

”آپ امی پر نظر رکھیے گا، کہیں وہ میری معصوم سی بیوی کے لئے سخت گیر ساس نہ بن جائیں اور ماموں جان کے کیے کی سزا وہ اسے دینا شروع ہو جائیں۔“ جواباً روبینہ پھوپھو اسے مصنوعی غصے سے گھور کر رہ جاتیں۔

آج کل حویلی میں ہونے والی رونق نے سعدیہ کے مزاج پر خاصا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اوپر سے نایاب اور اربیبہ خاصی شوخ و چنچل لڑکیاں تھیں۔ ان کے قہقہے اور فرمائش آتے جاتے جلتنگ کا سماں باندھ دیتے۔ بے جی اٹھتے بیٹھتے اپنے بچوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی تھیں کہ اللہ انہیں نظر بد سے بچا کر رکھے۔ سروہی بابا کی اجازت سے کچھ دنوں کے لئے نور الصباح کو بھی حویلی میں لے آئی تھیں۔ وہ بھی وہاں آ کر خاصی خوش تھی۔

”بھئی زوجہ محترمہ! آپ تو اب کی حویلی میں آ کر لفٹ ہی نہیں کروا رہیں۔ ہر وقت کبھی دادی ساس تو کبھی خالہ ساس کے نرغے میں رہتی ہیں..... لگتا ہے مبارک پور لے جانا ہی پڑے گا۔“ سجاد دل نے آج دالان میں اسے گھیر ہی لیا تھا۔ اس وقت دوپہر کا وقت تھا اور سب

میں نے تبھی سوچ لیا تھا کہ مجھے اپنی زندگی خود بتانی ہے۔“

”لیکن نعمان اکل آپ کو کہاں ملے؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اپنے آفس میں.....!“ وہ مسکرائیں۔

”کیا مطلب.....؟“ سروہی کو ان کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ سعدیہ کے لبوں پر پُر شفقت مسکان پھیل گئی تھی۔

”جن دنوں روبینہ باجی اپنے بچوں کے لئے روتی تھیں، خلع کے بعد تب میں ان کے آفس گئی تھی۔ یہ ان دنوں پریکٹس کر رہے تھے اور تب میں نے قانونی نکتہ نظر سے پوچھا تھا کہ کیا بچے ماں کی تحویل میں دیے جاسکتے ہیں لیکن بھائی صاحب ہی نہیں مانے اور کچھ باجی نے بھی مزاحمت نہیں کی، لیکن اس سلسلے میں میری اکثر نعمان صاحب سے بات چیت رہتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ انہیں میرے خیالات اور حویلی کے رسم و رواج کا پتا چلا تو یہ مجھے کافی مشورے دیتے تھے۔“

”پھوپھو پھر کیا ہوا؟“ سروہی کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”پھر شاہ جی نے میرا رشتہ مدیہ بیگم کے اس بھائی کے ساتھ طے کر دیا، جس کی تیسری یا چوتھی شادی وہ عروہ سے کروا رہے تھے اور اس وقت شجاعت صاحب کی دوسری شادی تھی اور مدیہ بھابی مجھ سے بہت خاں کھاتی تھیں اور یہ رشتہ اسی خاں کا منجہ تھا۔“

”اوہ.....!“ سروہی کو دلی یوسف نے آن گھیرا تھا۔

”بس پھر فیصلے ہوتے گئے، لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ میرے اوپر شاید خدا کا خاص کرم تھا۔ ورنہ اس طرح سے ہونے والی شادیوں کا انجام عموماً اچھا نہیں ہوتا اور اس کے اثرات زیادہ تر لڑکیوں کو بھگتتے پڑتے ہیں۔ ہر لڑکی میری طرح خوش قسمت نہیں ہوتی اور میں نے جن حالات میں شادی کی تب میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا اور یہی قدم جب نایاب نے اٹھایا تو مجھے دلی صدمہ ہوا کیونکہ جس ماحول سے میں نکل کر آئی تھی میری بیٹی اسی کا حصہ بننے جا رہی تھی اور.....“ وہ بات کرتے کرتے رکیں۔ سروہی تجسس سے اٹھ بیٹھی اور اشتیاق بھری نظروں سے دیکھا۔

”اور پھر نعمان صاحب بہت ایجوکیٹڈ سلجھے ہوئے ٹھنڈے مزاج کے حامل انسان تھے۔ انہوں نے کبھی مڑ کر مجھے طعنہ نہیں دیا، ورنہ اس قسم کے واقعات میں مرد بہت جلد کم ظرفی

”اے سعدیہ.....! تم یہ کیا کہہ رہی ہو.....“ بے جی کا تو حیرانی کے مارے برا حال تھا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ رات کے اس پہر وہ گلغفہ اور روبینہ کے ہمراہ ان سے یہ بات کرنے آئی ہیں اور وہ ہکا بکا ان تینوں کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔ روبینہ اور گلغفہ کے تاثرات سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ سعدیہ انہیں بھی اپنے فیصلے پر متفق کر چکی ہے۔

”لیکن سعدیہ.....“ بے جی حد درجہ ہچکچاہٹ سے بولیں۔ ”لوگ کہیں گے کہ حویلی کی خواتین کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو شاہ کے مرتے ہی ایسے فیصلے کرنے لگی ہیں۔“

”بے جی آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ صفیہ مجھ سے اور آمنہ سے بھی چھوٹی ہے اور قرآن پاک سے شادی ایک غیر اسلامی رسم کے ساتھ غیر صحت مندانہ فعل ہے۔ آپ کیوں نہیں اسے ایک نازل زندگی گزارنے دیتیں۔“ اس بار روبینہ جھلائی تو گلغفہ نے محل سے کہا۔ ”دیکھیں بے جی جب سعدیہ بتا رہی ہے کہ اس کے جیسے اچھا خاصے پڑھے لکھے ہیں بلکہ ایک مشہور و معروف سرجن ہیں جنہوں نے اپنی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی نہیں کی۔ پچھلے دس سال سے تنہا ہیں اور کوئی بچے بھی نہیں مجھے تو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ مومن کو ہنستے مسکراتے دیکھتی ہوں تو اس بے چاری کا بھی خیال آتا ہے کہ اس کا بھی انسانی خوشیوں پر اتنا حق ہے جتنا ہمارے بچوں کا۔“

”اور پھر بے جی.....“ سعدیہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”جب میرے جیسے اعتراض نہیں اور روبینہ باجی نے صفیہ سے بھی پوچھا ہے اور وہ بھی رضامند ہے تو آپ بس اپنی بیٹی کی بھلائی سوچیں..... آپ کا دل نہیں کڑھتا اسے اس حالت میں دیکھ کر.....“ سعدیہ کی بات نے انہیں گہری سوچ میں مبتلا کر دیا تھا۔ سعدیہ نے اپنی بات کے اختتام پر بے جی کا جھریوں زدہ ہاتھ پکڑا اور التجائیہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”خدا کی قسم بے جی مجھے صفیہ کی حالت پر رحم آتا ہے۔ اس کے صبر کا مزید امتحان نہ لیں اور میرے اوپر یقین رکھیں میں اپنی بہن کے بارے میں غلط نہیں سوچوں گی۔“

”میں جانتی ہوں میری بچی.....“ بے جی نے اپنا ہاتھ بے ساختہ سعدیہ کے ہونٹوں پر رکھا اور غم آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر بے ساختہ ساتھ لگا لیا۔ مومنہ بھی اسی لمحے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے بہت حیرانی سے آنسو ضبط کر کے بے جی کو تسلیاں دیتے ہوئے سعدیہ پچھو

اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ عائش نے بھی اپنی ڈیوٹی پر جوائنک دے دی تھی اور نعمان صاحب بھی دو چار دن بعد چکر لگا لیتے تھے۔ رملہ اور رمیض جو ایک ماہ کی چھٹی لے کر آئے تھے یہاں کی رونق دیکھ کر ان کا بھی واپس جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

”بھئی محترمہ میں آپ سے مخاطب ہوں.....؟“ سجاد نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو مومنہ نے نیکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں آپ کی طرح فارغ تھوڑی ہوں۔ سو کام کرنے والے ہوتے ہیں۔“

”ماشا اللہ زبان کی دھار تو حویلی میں آکر خاصی تیز ہو گئی ہے.....“ سجاد نے خوشگوار لہجے میں کہتے ہوئے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیا۔

”میں تو شروع سے ایسی تھی۔ وہ تو حالات کے بھنور میں میری گویائی سلب ہو گئی تھی۔“

”ماشا اللہ..... کیا طرز گفتگو ہے کیا اردو دانی ہے۔“ اس نے متبسم لہجے میں جتنی بے ساختگی سے کہا تھا۔ اتنا ہی بے ساختہ مومنہ کا ہتھکڑیاں بے جی کے کمرے کی طرف جاتی گلغفہ بیگم اور سعدیہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے بڑی خوشگوار حیرت سے ہتھکڑیاں سنا تھا۔

”خیر ہے بیٹا اتنی دوپہر میں کون سے زعفران کے کھیت نظر آگئے تم لوگوں کو؟“ سعدیہ نے ان کو روک کر چھیڑا تو مومنہ کو ماں کے سامنے تھوڑی سی خجالت محسوس ہوئی۔

”کچھ نہیں خالہ یہ مومنہ مجھے کہہ رہی تھی کہ کب مجھے سسرال لے کر چلو گے یہاں تکے کی بھیڑ بھاڑ میں میرا دل گھبراتا ہے۔“ سجاد کے شرارتی لہجے پر مومنہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”سعدیہ پچھو میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ یہ اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں۔“ مومنہ نے گھبرا کر وضاحت دی وہ بری طرح جھلا گئی تھی۔ سعدیہ پچھو نے آگے بڑھ کر سجاد کا کان پکڑا اور مصنوعی غصے سے بولیں۔

”میاں اپنے بڑوں سے ہوشیاری..... سیدھے سادے طریقے سے کہو کہ میرا اپنا دل کر رہا ہے کہ بیگم کو واپس اسی قید خانے میں لے جاؤں۔ اگر ایسا کچھ سوچا ہے تو ذہن سے نکال دو ابھی شاہ صاحب کے چالیسویں سے پہلے کچھ نہیں ہوگا۔“

”ہائے خالہ میرا کان..... دیکھیں ممائی آپ کے سامنے آپ کے داماد پر تشدد ہو رہا ہے اور بس مسکرائی جا رہی ہیں آپ.....“ اس نے دہائی دی جب کہ گلغفہ بیگم اس کے احتجاج کو خاطر میں لائے بغیر ہنسنے لگیں۔

”اے ہے اس بچی کا دماغ ٹھیک ہے؟ کیا ہم کچھ نہیں لگتے اس کے.....“ بے جی نے تیزی سے بات کاٹی۔

”کیوں گفتہ بھابی آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“ روبینہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”میرے لیے بے جی کا فیصلہ اہم ہے، وہ بڑی ہیں، جیسا چاہیں۔“ گفتہ کی بات نے بے جی کا دل ایک دم بڑھا دیا تھا۔ وہ خوش دلی سے بولیں۔

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میرے لئے عائش اور دلاور دونوں ہی برابر ہیں۔“ ساتھ ہی مومنہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”اے بیٹا ذرا کہن سے کوئی چیز لا کر منہ تو میٹھا کرا دو.....“ مومنہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بے جی ایک اور بات کہوں.....؟“ سعدیہ جھجکتے ہوئے بولیں۔

”ہاں ہاں بولو.....“ انہوں نے بے تکلفی سے کہا۔

”دیکھیں بے جی میں ذات پات اور امیر غریب کے فرق کے چنداں اہمیت نہیں دیتی۔ میرے لیے یہ چیزیں بے معنی ہیں اور جو لوگ بے غرض ہو کر دوسروں کے لئے قربانی دیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔“ بے جی، روبینہ اور گفتہ بیگم نے حیرت سے سعدیہ کو دیکھا، جن کی تہید بے معنی نہیں تھی۔

”میری شاہ جی کے قل والے دن سروہی کے باپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ حد درجہ شریف اور نیک انسان تھے۔ میں نے اتنے قناعت پسند لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ سروہی ہماری بچی تھی، لیکن انہوں نے سکے باپ سے بڑھ کر اس کی پرورش کی اور اسی وقت میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ وہ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ سروہی تو اپنا خون تھی اور نور العباس کا کسی نے نہ سوچا۔“ بے جی نے ان کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

”تو کیا مسئلہ ہے، تم اپنے رمیض کے لئے دیکھ لو، اچھا ہے کہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر نما آجائیں گی۔“ بے جی کی بات پر سعدیہ کے چہرے پر بے ساختہ خوشی کے رنگ پھیلے تھے۔

”بس بے جی مجھے آپ کی اجازت ہی درکار تھی۔“

بہت بہت مبارک ہو سعدیہ..... اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں تمہاری رملہ کو کہیں نہ جانے دیتی۔“ گفتہ بھابی کے پُر خلوص لہجے پر وہ بے ساختہ مسکرائیں۔ جب کہ مومنہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باقی لڑکیوں کو یہ اہم اطلاعات پہنچانے کے لئے نکل تو سامنے سے آتے ہوئے

کو دیکھا اسے اپنی یہ پڑھی لکھی اور دوستانہ مزاج کی پچھو بہت اچھی لگی تھیں۔

”بس جیسا تم لوگ مناسب سمجھو کس ماں کا دل نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد خوش ہو۔“ بے جی کی رضا مندی پر تینوں خواتین کے چہرے پر اطمینان کے رنگ پھیل گئے تھے۔ مومنہ نے چائے کی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور خود بھی وہاں بیٹھ گئی۔

”اور بے جی مجھے آپ سے ایک اور بات کرنی ہے۔“ سعدیہ آج کل بے جی سے کچھ زیادہ ہی لاڈ اٹھوا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر انہوں نے آج ہی ساری باتیں کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”عائش نے مجھے سروہی کے لئے کہا ہے اور نعمان صاحب کو بھی وہ بچی اس لحاظ سے بہت پسند ہے اور پھر میر بہت اچھی دوست اور سکندر بھائی کی بھی تو بیٹی ہے شاید اس طرح شاہ جی کی کسی زیادتی کا مداوا ہو جائے۔“ سعدیہ نے بہت سہجاء سے بات کی تھی، لیکن بے جی کے چہرے پر ایک لمحے کو تاریک سا سایہ دوڑ گیا تھا۔ وہ تذبذب کی کیفیت میں تھیں۔ وہ کچھ توقف کے بعد رنجیدگی سے بولیں۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں، تمہاری اولاد ہے..... جو مناسب سمجھو.....“

”کیوں بے جی..... عائش آپ کا کچھ نہیں لگتا.....؟“ سعدیہ کی زیرک نگاہوں نے ان کا تذبذب بھانپ لیا تھا، تبھی وہ صاف گوئی سے بولیں۔

”مجھے سروہی سے کوئی خا نہیں، لیکن پتا نہیں کیوں عائش کو دیکھ مجھے فوراً عروہ کا خیال آیا تھا۔“ سعدیہ کا چہرہ ان کی بات سے جھج سا گیا تھا۔ گفتہ بیگم نے چونک کر اپنی ساس کو دیکھا۔

”بے جی آپ کو دلاور کو دیکھ کر عروہ کا خیال کیوں نہیں آتا.....؟ گھر کا بچہ ہے، آپ کے سامنے پلا بڑھا ہے اور پھر آج کل کے دور میں بچوں کی خوشیاں زیادہ اہم ہوتی ہیں اور حیرت ہے اگر آپ کو پتا نہیں چلا۔“ روبینہ پچھو کی صاف گوئی پر بے جی نے الجھ کر انہیں دیکھا..... جب کہ گفتہ بیگم بالکل خاموش تھیں۔

”میں سمجھی نہیں روبینہ، تمہاری بات؟“

’اماں اس بات میں تو کوئی الجھاؤ ہے ہی نہیں۔ میرے سامنے کی بچیاں ہیں، سارے انداز پہنچاتی ہوں اور پھر مجھ سے سروہی نے خود بات کی ہے اور کہا تھا کہ ہمارے والدین تو ہیں نہیں جو بات کریں۔“

سجاول سے بری طرح ٹکرا گئی۔

”تم کیا ادھر ادھر رات کو چھاپے مار رہی ہو؟“ سجاول کا موڈ حویلی میں آ کر خاما خوشگوار رہنے لگا تھا۔

”کچھ نہیں آ کر بتاتی ہوں۔“ اس نے تیزی سے اسے دھکیلا اور ساتھ ہی عروہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی وہ اسے بے بسی سے جاتے دیکھتا رہ گیا۔

* * *

ہمیں خبر ہے بھلا ہم ہواؤں پر قادر ہیں

طوفانوں کا رخ بھی بدل سکتے ہیں

تمہارے ہونٹوں کی خزاں رسیدگی کو

گلاب زتوں میں بدل سکتے ہیں

اک بار میری جاں

میری بن کے تو دیکھو.....

تمہیں نہیں خبر شاید.....

ہاں.....

یہ ممکن ہے ہوا رخ بدل بھی سکتی ہے.....

من چاہے رستے پر چل بھی سکتی ہے.....

حویلی میں آج بھر پور چراغاں تھا۔ ڈھول کی تھاپ اور ڈیک کی اونچی آواز نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

مہمانوں کے لئے سجائے آرائشی گیٹ پرٹی پنک ساڑھی میں نظر لگ جانے کی حد تک تیار سروہی اور بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس عائش دونوں کھڑے مہمانوں کو ریسو کر رہے تھے۔ سروہی عائش اور نور الصباح اور رمیض کی شادی تو دو ماہ پہلے ہی ہو گئی تھی۔ رمیض تو اپنی مزو کو لے کر فوراً انگلینڈ چلا گیا تھا جب کہ نایاب اور بلاول کی رخصتی ان کے ایگزیم تک ملتوی کر دی گئی تھی۔ دلاور اور عروہ کی شادی بھی انہی کے ساتھ طے کی گئی تھی۔

لیکن آج اللہ کے فضل سے دونوں شادیاں خیریت سے انجام پا گئی تھیں۔ آج دلاور اور بلاول کا ولیمہ خاصی دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔

مومنہ کو اس کے دو ماہ کے بیٹے نے زچ کر رکھا تھا اور وہ سجاول کی تلاش میں ادھر ادھر محوم رہی تھی تاکہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاسکے۔

صفیہ پھوڈا رک بلیو کام والے سوٹ میں ہم رنگ جیولری پہنے اپنے شوہر کے ساتھ بار بار اسٹیج کی طرف چکر لگا رہی تھیں وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی ہمار ہی میں بہت خوش اور مطمئن تھے۔ صفیہ کو بار بار کھل کر ہنستے دیکھ کر بے جی کے دل سے اپنی بیٹی سعدیہ کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں جس نے انہیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا تھا۔ روبینہ پھوپا اب اپنے پوتے کو اٹھائے بھلانے میں مصروف تھیں۔ وہ خاصی آسودہ حال اور خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

سعدیہ پھوپہ نے نعمان صاحب کو اشارہ کر کے وہ منظر دکھایا جس میں سروہی اسٹیج پر دلاور اور عروہ کے درمیان زبردستی کھس کر شرارتی انداز میں تصاویر بنا رہی تھی۔ اس شوخ و چنچل لڑکی نے ان کے گھر میں رونق میں اضافہ کر دیا تھا۔ رمیض اور نور الصباح کچھ مصروفیات کی بنا پر ویسے میں شامل نہیں ہو سکے تھے لیکن بار بار فون کر کے اس خوشگوار ماحول کا حصہ بن رہے تھے۔

سروہی عائش کی تلاش میں گیٹ کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کچھ لوگ کتنے بد قسمت ہوتے ہیں جو بھوٹی انا اور دولت کی ہوس میں اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ خوشیاں ان کے دروازوں پر دستک دینا بھول جاتی ہیں اور وہ غلط رسوم کو رواج دے کر زندگی کو مزید تاریک اور گھٹن زدہ بنا دیتے ہیں لیکن جس طرح مٹھی میں ریت کو قید نہیں کیا جاسکتا اسے معلوم تھا کہ مثبت طرز عمل سے آنے والی روشنی کو بھلا کب تک روکا جاسکتا ہے۔

وہ یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ حویلی کی باگ ڈور اب جن ہاتھوں میں ہے وہاں اب کبھی مایوسی، جہالت اور گھٹن کے بادل نہیں چھائیں گے۔

(ختم شد)

تجاشا اصرار پر کروایا تھا۔

سخت غصے میں انتہائی عجلت کے ساتھ پتلی کمرے میں داخل ہوئی۔ اپنا بیک اس نے گھما کر میٹرز پر پھینکا۔ اس کا چہرہ غصے اور بے عزتی کے احساس سے لمحہ بہ لمحہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کڑے تیوروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ نازد کمرے میں اس کی آمد سے بے خبر اب ”کاناٹاگا“ گانے کے بولوں میں گم تھی، پتلی کچھ دیر تو اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی رہی، پھر واش روم میں گھس گئی۔ واش بیسن کے پاس کھڑے ہو کر پورے پانچ منٹ ٹھنڈے پانی کے جھپکے منہ پر مارے پھر اسٹینڈ پر لگا تو لیا گھسیٹ کر منہ صاف کیا اور باہر نکل کر تو لیا گول مول کر کے کارپٹ پر پھینکا، کچھ دیر وہ نیچے پاؤں کارپٹ پر بے چینی سے گھومتی رہی۔ ٹھگ آ کر اس نے ڈیک بند کیا۔ میوزک بند ہونے پر نازو نے چونک کر نکلیہ اپنی آنکھوں سے ہٹایا اور تعجب سے اسے دیکھا، جو غصے کی زیادتی سے ایک ہاتھ کا مکا دوسرے ہاتھ کی پتیلی پر مارے ہوئے ٹھل رہی تھی۔ اس کی سرخ و سپید رنگت دھک رہی تھی۔ اسکا رلٹ ریڈ شرٹ اور بلیک ٹائٹ ٹراؤزر نے اس کے جسم کے قیامت خدو خال کو خاصا نمایاں کر رکھا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ اس نے تھوڑی سی گردن اٹھا کر تشویش زدہ لہجے میں دریافت کیا تو پتلی نے کارپٹ پر پڑے کٹن کو غصے سے زوردار ٹھوکر ماری اور غصیلے لہجے میں بولی۔

”اس منہ مخوس گندے مارے ہاسٹل میں سوائے ان چندال عورتوں کے کسی کی جرأت ہے، جو پتلی کو کچھ کہہ سکے۔“ وہ بولی نہیں پھنکاری تھی۔

”کیا ہوا، آنٹی لوگوں نے کچھ کہا ہے؟“ نازو نے تجسس سے پوچھا۔

”ظاہر ہے ان منہ مخوس عورتوں کے علاوہ اور کسی کو میری کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ ابھی تو خدا نے ان کو اوقات میں رکھا ہوا ہے۔ ذرا کچھ ڈھنگ کی ہوتیں تو آسمان کو ٹاکی لگا دیتیں۔ کبھی کبھی تو میرا دل کرتا ہے سکندر شاہ کی حویلی کے پالتو کتے ان کے پیچھے لگا دوں یا پھر ان کی گز بھر لپی زبان پر کونسلے تو ضرور رکھوا دوں۔ کافی لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔“ پتلی نے غصے سے مقہمیاں بھینچیں۔ اس کے لہجے سے چنگاریاں اٹھ رہیں تھیں۔ وہ بے خونی سے بول رہی تھی۔ نازو یک ٹک اس کا پڑے جوش سرخ چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔

”اچھا فضول باتیں مت کرو، لو شاہاش یہ پانی پیو۔“ نازو نے اٹھ کر پانی کا گلاس زبردستی اسے پکڑایا، جواب غصے سے اسے گھورتے ہوئے بہ مشکل پانی نگلنے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں

نارسائی

پرائیوٹ ورکنگ دوسن ہاسٹل کے کمرانمبر تین میں فل آواز میں ڈیک پر ”کلیوں کا جن“ گانا چل رہا تھا۔ سردی کی شدت اور ہلکی ہلکی بوند باندی نے موسم خاصا آفت کر دیا تھا، لیکن کمرے کے اندر چلنے والے الیکٹرک ہیٹرنے موسم کی شدت کو کم کر دیا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ کارپٹ پر پڑے دو میٹرز میں سے ایک پر نیلے اور دوسرے پر گلابی پھولوں والی چادریں بچھی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر ایک براؤن کلر کا کبیل بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا، جبکہ اس کے سامنے بچھے ہوئے دو اور میٹرز پر بے پروائی سے لیٹی ہوئی نازو کے پاؤں تیز میوزک کی ڈھن پر متحرک تھے۔ منہ پر نکلیہ رکھے آنکھیں بند کیے وہ شاید بھرپور طریقے سے میوزک کو انجوائے کر رہی تھی۔ اس کے پاس ہی ناشتے کے خالی برتنوں کی ٹرے میں چائے کا گم اوندھا پڑا ہوا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی بے تحاشا سامان اور بے ترتیبی کا احساس پہلی نظر میں ہی محسوس ہو جاتا تھا۔ اس کمرے کی چاروں کین پھونڈ، بے پروا اور ست واقع ہوئی تھیں۔ کمرے کی بائیں دیوار میں واقع وسیع و عریض وارڈروب کے چاروں خانے کپڑوں، کاسٹیکس، جیولری اور مختلف اشیا سے لدے ہوئے تھے۔ وارڈروب کے سب سے اوپر والے خانے میں دو بیک ایک بریف کیس اور کچھ خالی ڈبے زبردستی کھسائے ہوئے تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی دائیں کونے میں کارپٹ پر رکھے کمپیوٹر کے پاس سی ڈیز کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جسے ترتیب سے رکھنے کا وقت شاید کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ پورے کمرے کی دیواروں پر عمارہ عرف پتلی کے ہوشربا پوز والے فوٹویشن کی مختلف تصاویر پوسٹر سائز میں لگی ہوئی تھیں، جن پر پہلی نظر ڈالنے سے ہی انڈیا کی کسی بے باک فلسفہ یا ماڈل گرل کا گمان ہوتا تھا۔ حالانکہ اس نے ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں جاب کرتے ہوئے، بھی کبھی ماڈلنگ وغیرہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور یہ فوٹویشن بھی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے ماہر فوٹو گرافر کے بے

اس کے مزاج کی حدت میں کافی کمی آچکی تھی۔ اب وہ اپنے شولڈر کٹ بالوں کو زبردستی جوڑے میں قید کر رہی تھی۔

”اچھا اب بتاؤ کہ کس نمبر والی آنٹی نے کیا کہا ہے؟“ نازو نے نرمی سے پوچھا تو وہ ایک دفعہ بھر ہنک اٹھی اور انگلی کے اشارے سے اسے وارننگ دے کر بولی۔

”خبردار ان منحوس عورتوں کو آنٹی شائی کہا۔ ان کے سفید چائے میں کوئی بھی کالا بال ہے کیا؟ وہ یقیناً میری بوا کی عمر کی ہیں اور ان کو اتنی عزت دینے کی ہرگز ضرورت نہیں پورے ہاسٹل کی لڑکیوں کا ان تین عورتوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر ان کی شادیاں نہیں ہوئیں تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ ہر وقت ٹیرس میں بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کی ٹوہ میں رہتی ہیں اور رعب ایسے ڈالتی ہیں جیسے مفت میں ہمیں بٹھا رکھا ہو۔“

”لیکن آخر ہوا کیا ہے؟“ نازو نے اکتا کر پوچھا اور ٹانگیں پھیلا کر ایک دفعہ پھر لیٹ گئی۔ وہ خاصی بے زار بے زاری تھی۔

”ہونا کیا ہے؟“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔ ”آج مجھے آفس سے سکندر شاہ ڈراپ کرنے آئے تھے اور وہ درمیان والی چنڈال عورت اپنے چٹے چائے (سفید بال) میں کالی مہندی لگائے ٹیرس میں بیٹھی تاکہ جھانک کر رہی تھی، حالانکہ ہلکی ہلکی بوندا باری میں بھلا باہر بیٹھنے کی کیا تنگ بنتی ہے اور ایسے میں جب آپ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہوں۔ خیر مجھے دیکھتے ہی اپنے ازلی کینے لہجے میں بولیں۔ ”یہ کالی گاڑی والا کچھ زیادہ ہی ہمارے ہاسٹل کے چکر نہیں لگانے لگا۔“

”اچھا! پھر؟“ نازو حیرت سے اٹھ بیٹھی اچانک اس واقعے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ”تب تم نے کیا کہا؟“ اس نے بے تابی سے پتلی سے پوچھا، جواب بے پروائی سے اپنے خوبصورت مخروطی اگلیوں والے ہاتھوں پر لوش سے مساج کر رہی تھی۔

”میں نے کہا کہ آنٹی اگر آپ کو اعتراض کالی گاڑی پر ہے تو ڈونٹ وری سکندر اب وائٹ کٹر میں ٹوڈی کا نیا ماڈل لے رہے ہیں۔“ پتلی نے اپنے ازلی بے باک لہجے میں اطلاع دی تو نازو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے ایسے ہی کہا ہوگا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ خطرناک حد تک منہ پھٹ۔

”اچھا پھر آنٹی نے کیا کہا؟“ نازو کو اب نئی فکر نے گھیر لیا۔

”وہ کچھ کہنے جیسی ہوتی تو کہتیں۔ بس کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اتنے میں ان کا چالیس سالہ انٹرنیشنل کنوارا بھائی ٹیرس پر آ گیا اور میں گولی کی طرح اڑتی ہوئی اندر۔“

”اوہ نو.....“ نازو نے پریشانی سے اس کا مطمئن سراپا دیکھا اور تنبیہی لہجے میں کہا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی ان کے منہ لگنے کی؟“

”کیوں میں ان کے باپ کا کھاتی ہوں کیا جو ان سے ڈروں۔ ان سے ڈرتی ہے میری جوتی۔ جب ہم اس مہنگے ہاسٹل کے تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں تو ان کا کیا حق بنتا ہے ہماری پرسنل لائف میں خواہ مخواہ گھمیں۔ ایک تو اپنے بنگلے میں ہاسٹل کھولا ہوا ہے۔ اوپر سے اکم ٹیکس کے خوف سے ظاہر بھی نہیں کرتیں۔ دوسرے ہر ماہ ایک لاکھ سے زائد تو کرائے کی مد میں کما رہی ہیں اوپر سے ہزار پانچ سو ہر ماہ کسی نہ کسی مزید خرچ کے نکال لیتی ہیں۔ کبھی موٹر ٹھیک کروانی ہے تو کبھی کینز اور یہ ہماری شرافت ہے جو چپ چاپ دے دیتے ہیں۔“

پتلی نے جل کر جواب دیا تو نازو نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔

”وہ بات تو ٹھیک ہے یا! لیکن یہ بھی تو دیکھو ناں کہ یہ اتنے مہنگے اور صاف سترے علاقے میں واقع ہے اور پھر یہ بنگلا بھی تو زبردست ہے۔ پہلے تو آنٹی لوگوں نے اپنی رہائش کے لئے ہی بنایا تھا۔ وہ تو بعد میں انہیں بزنس کرنے کا خیال آیا تو پورشن علیحدہ کر لیا، ورنہ باہر سے تو پتا نہیں چلتا کہ اس بنگلے کے اندر کوئی پرائیوٹ ہاسٹل بھی کھلا ہے اور سب سے بڑی بات کہ صاف سترے اور اچھے خاصے بڑے کمرے ہیں۔“

”تو وہ اس اچھے خاصے بڑے کمرے کے ہر ماہ ہم سے بارہ ہزار بھی لیتی ہیں، کوئی مفت کا یتیم خانہ نہیں کھول رکھا انہوں نے اور پھر چلو تم میں تو جاب کر رہے ہیں سوئی اور کرن تو اسٹوڈنٹس ہیں۔ ذرا سوچو ان دونوں کے لئے ہر ماہ تین تین ہزار دینا کتنا مشکل ہے اور سب سے بڑی بات تین ہزار دینے کے بعد میں بھی اپنا کرو یہ اسٹاکس سا کیبن بنا کر ہمیں دے دیا ہے کہ آفس سے آنے کے بعد یہاں متھادو اور کتنا خرچا ہو جاتا ہے۔ مجھے اعتراض ان خرچوں پر بھی نہیں بلکہ ان تین عدد آئنیوں کی ساسوں جیسی روک ٹوک پر ہے۔ ایک تو پیسے دو اوپر سے ان کی روک ٹوک بھی سنو مجھ میں تو اتنا حوصلہ نہیں۔“ پتلی کا خون کھول رہا تھا جبکہ نازو سر پکڑ کر رہ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس سینے سے خارج کی۔

”اچھا چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ کھانا کھاؤ گی۔ میں نے قہر مٹر بنایا ہے۔“

صبح ادا کاڑھ سے آتے ہوئے امی نے قیمہ دیا تھا اور لاہور پہنچنے کے بعد میرا آفس جانے کو دل نہیں کیا، سوچا کہ ریست کیا جائے۔ اس لئے خوب دل لگا کر تم تینوں کے لئے کھانا تیار کیا ہے۔ بس سوئی اور کرن آجائیں تو پھر نکالتی ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ پنکی نے کسٹمندی سے بکھرے بالوں کو سینٹا اور ایک بھر پور انگریزی لے کر وہیں نیم دراز ہو گئی، پھر اس کی آنکھ سوئی کے آنے پر ہی کھلی جو بچوں کی طرح تیز تیز بولتی آرہی تھی اور ابھی شاید ٹی وی لاؤنج میں تھی۔

”ارے نازو آئی آپ آگئیں کیا؟“ خوشی سے کانپتی بے یقینی سی چیخ بے ساختہ اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

”یس مائی ڈیر!“ اس نے اٹھ کر پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ لگایا۔ وہ اپنا بیگ کارپٹ پر پھینک کر اس کے گلے لگی بول رہی تھی۔

”اوہ کاش! کالج سے آتے ہوئے میں کچھ اور مانگ لیتی۔“ اس کا لہجہ بڑھ جوش تھا۔

”اچھا وہ بھی مانگ لیتا، مجھے کرن سے تو مل لینے دو۔“ نازو نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے پیچھے کھڑی کرن کو دیکھا، جو خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

”آپ تو ادا کاڑھ جا کر ہمیں بھول ہی گئیں۔ دس دن کا کہہ کر پورے تیرہ دن لگا کر آئی ہیں.....“ کرن نے بھی پیار بھرا شکوہ کیا۔

”بس یار چھوٹی بہن کی شادی تھی اور چونکہ میں سب سے بڑی ہوں، اس لئے ساری ذمہ داری مجھ پر تھی۔“ نازو نے شفقت بھرے لہجے میں جواب دیا تو پنکی نے لمبی سی جمائی لے کر عجیب سے لہجے میں کہا۔

”یار اس دفعہ جا کر اپنی ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دینا اور کہنا کہ تین بہنوں کی شادیاں میں نے بننا دی ہیں۔ اس لئے اب میرے حال پر رحم کرو مجھے پیسے بنانے والی مشین کے بجائے ایک انسان سمجھ کر میرے مستقبل کے بارے میں سوچو۔“ نازو خاموش سی ہو گئی۔ سوئی اور کرن نے شکایتی نظروں سے پہلے پنکی باجی کی طرف دیکھا اور پھر نازو آپی کی طرف جو خاصی تھکی تھکی اداس اور بکھری ہوئی لگ رہی تھیں۔

”شکر ہے نازو آپی آگئیں۔ میں کرن کے ہاتھوں کے بد مزہ کھانے کھا کر بس فوت ہونے والی تھی اور پنکی باجی کا تو آپ کو پتا ہے ان کا کہنا ہے کہ چولہے کے پاس جا کر میری

اسکن مجلس جائے گی۔ اس لئے اپنی مدد آپ کے تحت سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔“ سوئی نے دانستہ خوشگوار لہجے میں بات چلی تو نازو دھیرے سے مسکرا دی۔

”ڈارلنگ! آتے ہی میری شکایتیں بہت بری بات ہے۔“ پنکی نے مصنوعی ناراضی سے اسے دیکھا تو وہ بے اختیار ان کے ساتھ لپٹ گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد سوئی کی گدگدی سے پنکی کے قہقہے چھت کو پھاڑ رہے تھے۔

* * *

پنکی اور نازو نے اکٹھے ہی ماس کیونٹیکیشن میں ماسٹرز کیا تھا۔ وہ دونوں پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل میں روم میٹس تھیں۔ تھیس کے دوران پنکی کو ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں جاب کی آفر ہوئی تو اس کی کوششوں سے نازو کو بھی ایک ادارے میں پی۔ آر۔ او کی جاب مل گئی۔ ماسٹرز کے بعد دونوں کو یونیورسٹی کا ہاسٹل چھوڑ کر پرائیوٹ ہاسٹل میں شفٹ ہونا پڑا۔ لیکن پرائیوٹ ہاسٹل کے مختلف مسائل کی وجہ سے انہوں نے چھ ماہ میں تین ہاسٹل تبدیل کیے تو کسی نے انہیں ”ستارہ ہاسٹل“ کا بتایا اور اب پچھلے دو سال سے وہ دونوں یہیں تھیں۔ ایک سال قبل پہلے کالج میں بی۔ کام پارٹ ون میں داخلے کے بعد جب کرن کو ہاسٹل کی سہولت نہ ملی تو وہ ایک کلاس فیلو کے توسط سے یہاں پہنچی۔ آنٹی ستارہ نے اسے نازو آپی اور پنکی باجی کے کمرے میں شفٹ کر دیا۔ انہی دنوں کرن کی کیپس میں مریم عرف سوئی سے ملاقات ہوئی، جس کا لاء ڈیپارٹمنٹ میں دوپہر کی کلاسز میں داخلہ ہوا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس کی بہتات کی وجہ سے دوپہر اور شام کے اسٹوڈنٹس کو ہاسٹل میں رہائش نہیں ملتی، اس لئے ان اسٹوڈنٹس کا سب سے بڑا اور سنگین مسئلہ یہی تھا۔ مریم اپنے مسلم ٹاؤن والے ہاسٹل میں خاصے مسائل کا شکار تھی۔ جب اسے کرن نے اپنے ہاسٹل کا بتایا تو وہ فوراً وہاں شفٹ ہو گئی، جہاں اس کی بھولی بھالی پیاری سی صورت دیکھ کر پنکی باجی نے اس کا نام مریم مسٹر دکر کے سوئی رکھ دیا تھا اور جب سے وہ کیپس کے باہر سب کے لئے سوئی تھی اور وہ چاروں پچھلے ایک سال سے اکٹھے بہت خوشگوار انداز میں گزارہ کر رہی تھیں۔

صبح ان چاروں کے نکلنے کے اوقات ایک ہی تھے، لیکن شام کو پنکی اور نازو ساڑھے پانچ یا چھ بجے تک آجاتی تھیں۔ اس کے بعد سوئی آتی اور سب سے آخر میں کرن آتی، جسے اسی ٹاؤن میں دو بچوں کو ٹیوشن پڑھانے بھی جانا ہوتا تھا، چونکہ پنکی اور نازو جلد آ جاتیں اس لئے

کھانا بنانے کی ذمہ داری ان کی تھی۔ جس میں زیادہ کام نازیہ عرف نازو ہی بناتی، البتہ صبح ناشتہ وہ دونوں یعنی کرن اور سوینی بناتی تھیں۔ ہاسٹل میں مقیم باقی لڑکیوں کی نسبت ان چاروں میں اچھی ہم آہنگی تھی۔ کچھ سوینی اور کرن ان دونوں کا احترام بھی بہت کرتی تھیں۔ اس لئے کوئی مسئلہ نہیں بنتا تھا، لیکن ان چاروں کی نسبت اکثر ہاسٹل کی دوسری لڑکیوں کے آئے دن مسئلے اور جھگڑے ہوتے۔ جسے انتہائی ناخوشگوار موڈ کے ساتھ آنٹی ستارہ اور ان کی بہنیں بناتی تھیں۔

* * *

سردی کی شدت میں ایک دم اضافہ ہو گیا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے سخت دھند پڑ رہی تھی۔ موسم کی سنگینی نے کاروبار زندگی کو معطل کر رکھا تھا۔ ایک تو دیکھ ایذا تھا۔ اوپر سے بے تحاشا سردی، دھند اور ٹھنڈی سرد ہواؤں نے سب لڑکیوں کو اپنے اپنے کمروں میں دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ چاروں بیٹھ جلائے کبل میں دہکی گرم چائے اور ابلے ہوئے انڈوں سے اپنی سردی کو کم کرنے میں مصروف تھیں، جب آنٹی ستارہ کی ٹی وی لاؤنج میں اونچی آواز میں کسی کو ڈانٹنے میں مصروف آمد کا پتا چلا۔ پنگی نے دونوں ہاتھوں کو گرڑتے ہوئے سردی کی شدت کو کم کیا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں کہتی ہوں آفرین ہے اس عورت پر اتنی سردی میں اتنا بڑا لان عبور کر کے یہاں فک پڑی ہے۔ پتا نہیں کون سا کیڑا کاٹتا ہے جو اسے سکون نہیں لینے دیتا۔“

”پنگی! ذرا دھیان سے وہ باہر ہیں۔“ نازو نے تنبیہی لہجے میں کہا تو وہ بے پروائی سے کندھے اچکا کر بولی۔

”میں کون سا کسی سے ڈرتی ہوں۔“

”میں ذرا دیکھتی ہوں کہ آج کس کی شامت آئی ہے۔“ سوینی اچھی طرح شال اٹیپے ہوئے تجسس بھرے انداز میں کھڑی ہوئی اور بظاہر بے پروا انداز سے باہر نکلی تو سامنے لاؤنج میں آنٹی ستارہ اکرامبر پانچ کی منظر پر گرج رہی تھیں۔

”آخر میں کب تک صبر کروں۔ آج پندرہ تاریخ ہو گئی ہے اور تم پچھلے پانچ دنوں سے مجھے لارے لگا رہی ہو، گوکہ ابو نے مئی آرڈر بھیجا ہوا ہے اور وہ شاید پیدل آرہا ہے، جو ابھی تک نہیں پہنچا۔ اچھا تم لوگوں نے تماشا بنا رکھا ہے۔ ایک تو لاہور کے سب سے مہنگے علاقے میں

سب سے اچھے ہاسٹل میں رہنے کا شوق ہے، اوپر سے سمجھتی ہیں کہ میں نے شاید یہاں دارالامان کھول رکھا ہے۔ بہت ہو گئی بھئی بھلائی کا تو زمانہ نہیں مجھے صبح ہر حال میں کرایہ چاہیے ورنہ احمد بخش سے کہہ کر سارا سامان سڑک پر رکھوا دوں گی۔“ ستارہ آنٹی کے چہرے کے سرد اور سپاٹ تاثرات سے منزہ خاصی ہراساں ہو گئی تھی۔ اوپر سے دائیں بائیں کمروں سے جھانکتی لڑکیاں اسے مزید خفت اور شرمندگی سے دوچار کر رہی تھیں۔

”جج..... جی آنٹی میں صبح آپ کو کرایہ دے دوں گی، کل خود ڈاک خانے جا کر پتا کر کے آؤں گی۔“ وہ شرمندہ لہجے میں بولی تھی۔

”میری بلا سے چاہے ڈاک خانے جاؤ، چاہے تھانے، مجھے تو ہر حال میں کرایہ چاہیے۔“

آنٹی ستارہ کے طنز کے اس نوکیلے پتھر سے وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔

”جی آنٹی آپ پریشان نہ ہوں۔ میں صبح انشاء اللہ دے دوں گی۔“ منزہ نے شہود سے سر ہلا کر دوبارہ کہا۔

”ہونہہ! صبح کو کوئی چھت پھاڑ کر نہیں دے جائے گا۔“ وہ جاتے جاتے طنزیہ انداز میں بڑبڑائیں تو سوینی کے دل پر کوئی گہرا سا بوجھ آن پڑا۔ اسے ان کا زہریلا انداز سمجھ نہیں آیا، بوجھل دل کے ساتھ وہ کمرے میں لوٹی تو وہ تینوں بھی کھلے دروازے سے آنے والی آواز سے ساری صورت حال کا اندازہ بخوبی کر چکی تھیں۔

”آنٹی ستارہ کے اندر انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔“ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی افسردہ لہجے میں بولی تو پنگی بڑے طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

”ان منحوس عورتوں میں انسانیت تو دور کی بات، کوئی بھی اخلاقی خوبی موجود نہیں۔ بس دولت کی ہوس نے ان کو اندھا کر رکھا ہے۔ اوپر سے شادیاں نہ ہونے کی وجہ سے طرح طرح کے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو کے وہ دوسروں کی زندگیاں خراب کر رہی ہیں۔“ پنگی کے ریشے ریشے میں انکارے سلگ رہے تھے۔

”پنگی! باجی آپ تو دو سال سے یہاں ہیں؟ کیا ستارہ آنٹی لوگ شروع سے ہی ایسی تھیں؟“ کرن نے حیرانی سے پوچھا۔

”مائی ڈیز ان کو یہ ہاسٹل بنائے دو اڑھائی سال کا ہی عرصہ ہوا ہے۔ یہ ستارہ لوگ تین بنائیں اور دو بھائی تھے۔ ایک بھائی شادی شدہ تھا، جس کی بیوی کوندوں نے کھنکھنے نہیں دیا اور

تھی۔ سارا سارا دن روتی رہتی تھی اور پورے چار مہینے ایڈجسٹ نہیں ہو پائی تھی تو یہ ہنسی باجی ہی تھیں جو مجھے ہمت دلاتی تھیں۔ رات کو ساتھ سلاتی تھیں اور ناز و آبی زبردستی کھانا کھلاتی تھیں ورنہ آج کل کے دور میں کون کسی کا اتنا خیال رکھتا ہے اور سچی بات ہے کہ میری امی اب بہت مطمئن ہو گئی ہیں۔“ سوینی نے سادگی سے کہا تو نازو نے شرارتی لہجے میں کہا۔

”تمہیں معلوم ہے سوینی یہ ہنسی صاحبہ تمہارا خیال کیوں رکھتی تھیں؟“

”کیوں؟“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پورا کھول کے حیرت سے پوچھا تو ہنسی کو بے اختیار اپنے سے سات آٹھ سال چھوٹی سوینی پر پیار آ گیا۔

”وہ اس لئے کہ.....“ نازو شرارت سے ہنسی اور پھر گلا کھنکار کر بولی۔ ”یہ شروع سے بہت حسن پرست اور عاشق مزاج واقع ہوئی ہے۔ تمہاری من موہنی صورت اور دلکش نین نقش تمہاری سب سے بڑی سفارش بن گئے ورنہ یہ بڑی چیز ہے ہر ایک کو کہاں منہ لگاتی ہے۔“

”ایسے ہی یہ تو خود اتنی پیاری ہیں۔ پانچ فٹ پانچ انچ قد اب کہاں لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ اوپر سے فینر رنگت لائٹ گرین آنکھیں کرلی بال اور تھیکے نین نقش راہ چلتے لوگ رک رک کے ہنسی باجی کو دیکھتے ہیں۔“ سوینی نے معصومانہ لہجے میں کہا وہ ایسی ہی تھی۔ سادہ، معصوم اور کچھ کچھ بے وقوف۔

”دیکھیں ہنسی باجی یہ بھلا کہیں سے لگتی ہے کہ لاڈلی پارٹنٹ کی اسٹوڈنٹ ہوگی۔“ کرن نے ہنستے ہوئے اس پر طنز کیا تو وہ فوراً برامان گئی۔ بھی اپنی چھوٹی سی ٹیکسی ناک چڑھا کر بولی۔

”ہاں جیسے تم تو بڑی اماں لگتی ہونا۔“

”لو اس میں کیا شک ہے اچھی خاصی رعب دار میری پرسنالٹی ہے۔“

”جاؤ جاؤ منہ دھوؤ۔“

”تو بہ تو بہ میں تو اتنی سردی میں یہ غلطی نہیں کر سکتی۔“ کرن نے صاف انکار کر دیا۔

”دیکھیں ہنسی باجی اسے.....؟“ سوینی نے دھاگہ ہاتھ میں پکڑے شیشے کے سامنے

بیٹھی ہنسی کو مخاطب کیا جو اپنی آئی برد بڑی مہارت سے بتا رہی تھی جبکہ نازو اگلے دن آفس پہن کر جانے والے کپڑے استری کر رہی تھی۔

”کیا ہوا بھی؟“ ہنسی نے پلٹ کر دیکھا اور پھر ایک دم چونک گئی۔ ادھر آد سوینی میں

تمہاری آئی برد بناؤں۔“ وہ ایک دم پُر جوش ہوئی تو سوینی گھبرا گئی۔

طلاق دلو کر ہی سکون کا سانس لیا، پھر سنا کہ ان کے بڑے بھائی کی ڈیجھ ہو گئی۔ اس کے بعد پتا چلا کہ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ ان کے ماں باپ کا انتقال تو کافی عرصے پہلے ہو گیا تھا۔ ذات پات کے چکر میں بیٹیوں کو بوڑھا کر لیا، مگر خاندان سے باہر شادی کرنے کی جرأت نہ کی اور تین بہنوں سے چھوٹا ایک بھائی ہے۔ بہنوں نے ضد میں اس کی شادی بھی نہیں کی۔ وہ بھی ٹیسٹ میں بیٹھ کر آتی جاتی لڑکیوں کو تازا تھا۔ چاروں کے چاروں بھائی بہن نفسیاتی کیس ہیں اور سب سے چھوٹا بھائی بیالیس سال کا ہے تو باقی بہنوں کی عمر کا اندازہ خود کر لو۔“ ہنسی کے منہ سے اتنی تلخ حقیقت سن کر ان دونوں کا سر چکرا گیا جبکہ نازو تو خود ساری باتوں سے واقف تھی۔

”ان کے بڑے بھائی نے خودکشی کیوں کی؟“

سوینی نے معصومیت سے پوچھا تو ہنسی نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

”مائی ڈیئر سویٹ ہارٹ! یہ تو میں نہیں جانتی مجھ سے پہلے میری ایک روم میٹ نے بتایا تھا کہ اس نے لومیرج کر لی تھی۔ بہنوں کے کھڑے کیے گئے مسائل سے تنگ آ کر جب اس نے بیوی کو طلاق دی تو بعد میں بہت ڈسٹرب رہنے لگا تھا۔ ایک دن چپ چاپ ٹرین کے آگے لیٹ گیا اور بس۔“

”اوہ مائی گاڈ!“ ان دونوں نے خوفزدہ ہو کر جھرجھری لی تو ہنسی نے زوردار قہقہہ لگایا اور مذاق اڑانے کے انداز میں بولی۔

”اونٹنی منی فاختاؤ ابھی تم نے دنیا میں دیکھا کیا ہے۔ قدم قدم پر نئے ڈرامے اور دھوکے ہیں اور شکر کرو کہ تمہیں ہم جیسی باجیاں مل گئیں اور یہ ہماری اعلیٰ ظرفی اور صبر و تحمل ہے کہ تم لوگوں کو باجی اور آپنی کہنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔ ورنہ کسی مائی کے لال میں جرأت نہیں ہے جو عمارہ خان عرف ہنسی کو باجی کہہ جائے۔“ ہنسی کے منہ کے خیر لہجے پر سوینی نے بے اختیار اٹھ کر اس کے گلے میں بازو ڈالے اور اس کے منہ پر پیار کر کے فخریہ لہجے میں کہا۔

”آپ کو کیا پتا کہ ہماری باقی ہاسٹل فیلوز ہم سے کتنا جلیس ہوتی ہیں۔“

”تو تم بھی تو ہر وقت ہنسی باجی، ہنسی باجی اور نازو آپنی کرتی رہتی ہو۔“ کرن نے چڑایا

اور وہ چڑ بھی گئی۔

”تو اور..... نہ کیا کروں مجھے یاد ہے جب میں ہاسٹل آئی تو انتہائی ڈرپوک اور خوفزدہ

ہوئے کہا۔

”تم تو پچھلے تین چار سالوں سے مجھے یہی کہتی آ رہی ہو پتا نہیں تمہاری باقی زندگی کب آئے گی اور یہ کچے ذہن کی معصوم لڑکیاں ہیں، انہیں یہ فضول اور بے ہودہ فلمیں دکھانے کی ضرورت نہیں تم انہیں بگاڑ کر رہو گی۔“

”کیوں کیا یہ دودھ پیتی بچیاں ہیں؟“ پنکی نے شاید نہیں یقیناً برا مانا تھا۔ تبھی تلخ لہجے میں کہا تو سوئی اور کرن نے چونک کر دونوں کی شکلیں دیکھیں۔ کرن فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے نازو آئی! آپ خواجوا ناراض ہو رہی ہیں۔ ہم لوگ بس وضو کرنے جا رہے ہیں؟ اور پھر سوئی کی طرف مڑ کر کہا۔ ”کیوں سوئی؟“

”جج..... جی نازو آئی۔“ اس نے بھی ہڑا کر تائید کی، جبکہ پنکی نے غصے میں دانستہ کمپیوٹر کی آواز تیز کر دی۔ نازو جانماز اٹھا کر باہرٹی وی لاونج کی طرف نکل گئی۔ ان دونوں نے بے چارگی سے نازو اور پنکی کی طرف دیکھا۔ اس قسم کی پھوٹن سے ان دونوں کا اکثر واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ پنکی باجی ہلے گلے کی شوقین زندگی کو انجوائے کرنے والی اور اپنی ذاتی خوشی کے لئے ہر ناجائز کو جائز بنانے کے اصول پر کار فرما تھیں، جبکہ نازو آئی اپنی حدود میں رہ کر اپنی روایات کے مطابق چلنے کی قائل تھیں۔ اس لیے ان دونوں کے اکثر و بیشتر اختلافات سامنے آتے رہتے تھے، لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ طبیعتوں کے اس قدر تضاد کے باوجود بھی وہ دونوں اکٹھی تھیں اور ہر جھگڑے کے دس پندرہ منٹ بعد سب کچھ بھول بھال چکی ہوتیں اور دونوں کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ اس جھگڑے کو دوبارہ دہراتی بھی نہیں تھیں۔

مریم عرف سوئی کے آج کل ایگزام ہونے والے تھے۔ اس لئے وہ کمپس کم کم ہی جا رہی تھی۔ اس دن بھی وہ کمر صاف کر کے اپنی کتابیں اٹھائے دھوپ سینکنے کے لئے لان میں بیٹھ گئی۔ ابھی اسے پڑھتے ہوئے بہ مشکل ایک یا ڈیڑھ گھنٹا ہوا تھا، جب کیونو کی ٹوکری اٹھائے بیزار سی فرحانہ اس کے پاس پڑی خالی لان چیر پر آ کر بیٹھ گئی۔ سوئی نے خوشدلی سے اسے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ فرحانہ کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا اور وہ یہاں بینک میں جاب کے سلسلے میں مقیم تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟ آج بینک نہیں گئیں؟“ اس نے اخلافا کہا۔

”ہائے پنکی باجی میں نے تو کبھی نہیں بنوائی۔“

”تو کوئی بات نہیں اب بنواؤ دیکھنا چہرہ کتنا میٹ لگے گا۔“ ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگاتے ہوئے اپنی مسکراہٹ دہائی اور اس کے ناں ناں کرنے کے باوجود نہ صرف آئی برو بلکہ اپر لپس بھی بنا ڈالے اس نے لاکھ دہائی دی، مگر پنکی بھلا کہاں سننے والی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اسے فخریہ انداز میں دیکھ کر مسکرائی۔

”دیکھو ذرا کتنی آفت لگ رہی ہو۔“

سوئی نے ڈرتے ڈرتے شیشہ دیکھا۔ اپنا آپ اسے دیکھ کر واقعی حیرت آمیز خوش ہوئی، لیکن واڈروب میں کپڑے لٹکاتے ہوئے نازو نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”پنکی! تم نے خواجوا اپنا ہنر اس پر آزمایا اچھی خاصی اس کی شکل پر مصومیت تھی۔ اب کی دم بڑی بڑی کٹنے لگی ہے۔“

”لو خواجوا! پنکی نے برا منایا اب ساری زندگی کیا یہ بچی بنی رہے۔ ابھی تم دیکھنا میں اپنی سوئی میں کتنے انقلاب لے کر آؤں گی۔“

”کیا.....؟“ نازو چونکی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد گہرے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، لیکن یاد رکھنا اس نے واپس اپنے شہر خان پور بھی جانا ہے۔“

”ارے بھئی لاہور جیسے زندہ دل شہر میں آنے کے بعد کون کافر اسے چھوڑ کر جاتا ہے؟ دیکھ لینا اپنی سوئی کو بھی لاہور کا ایک ہینڈ سم اور چارمنگ سا شہزادہ لے اڑے گا۔ بھئی اتنا حسن اور دلکش چہرہ واپس کون ظالم جانے دے گا۔“ پنکی کے بے باک لہجے اور قہقہے پر نازو نے تمللا کر اسے دیکھا اور وضو کرنے کے لئے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ واپسی پر کرن اور سوئی کو پنکی کے ساتھ کمپیوٹر پر لگی ایک فضول سی انگلش مووی دیکھتے ہوئے دیکھ کر اس کا موڈ خاصا خراب ہو گیا۔ تبھی اس نے تینہی لہجے میں سوئی اور کرن کو مخاطب کیا۔

”چلو اٹھو بھی نماز پڑھو یہ فضول کام بعد میں کر لیتا۔“

”اوہو! نازو کیا ہو گیا ہے یا راستے مڑے کی مووی ہے۔ نماز بھی پڑھ لیں گے۔ باقی ساری زندگی بھی تو نمازیں ہی پڑھنی ہیں۔ بچوں کو انجوائے کرنے دو۔“ پنکی نے کمپیوٹر پر نظریں جمائے جھجھلاہٹ سے جواب دیا تو نازو نے تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھا اور چند لمحے خاموش رہی۔ اسے پنکی پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا، لیکن اس نے ضبط سے کام لینے

ہے۔ وہ بھی ایسی لڑکی ہے نہ گھر والوں کی فکر نہ کوئی پریشانی، بس کھالیا، پی لیا، انجوائے کر لیا، اس جیسا بننے کے لئے بس ضمیر کو سلانا پڑتا ہے پھر عیش ہی عیش ہیں۔“

فرحانہ نے اپنے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا تو سوینی کو اس کا انداز خاصا ناگوار گزرا، بھی وہ خاصے تلخ لہجے میں بولی۔

”آپ پنکی باجی کے بارے میں غلط بات مت کریں۔ ان کا تعلق کسی عام فیملی سے نہیں ہے وہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ فرحانہ طنزیہ انداز میں مسکرائی اس کے لہجے میں ایک نامعلوم سی کاٹ تھی۔ اس نے ناک چڑھا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تمہاری پنکی باجی کا تعلق لودھراں کے کسی پسماندہ سے چک میں رہنے والی ایک کمزور معاشی حالت والی فیملی سے ہے۔ اس کے والد صاحب واپڑا میں میٹر ریڈر اور ایک بھائی کی چھوٹی سی پرچون کی دکان ہے جبکہ دوسرا بھائی کپڑے کی دکان میں سیلزمین اور ماں محلے والوں کے کپڑے سلائی کر کے گزارا کر رہی ہے۔ پانچ بہنوں میں سے کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی، جن میں دو اور اتاراج ہو چکی ہیں اور پنکی کا نمبر چوتھا ہے جو جیسے تیسے کر کے یونیورسٹی پہنچ گئی اور اب لاہور کی چمک دک نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور پھر جو آزادی اور بے باکی اس کی ذات کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ اسے اپنے پنڈ میں میسر نہیں، یہاں سے جانے والے بھاری بھر کم منی آرڈر نے گھر والوں کے منہ بند کر رکھے ہیں۔ اس لئے راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔“

”کیا.....؟“ وہ الجھن آمیز انداز میں سامنے بیٹھی فرحانہ کو دیکھتی رہ گئی، جو آنکھیں بند کیے بے پروائی سے لان چیمز پر نیم دراز تھی اور بچی بات تھی کہ سوینی کو اس کی کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اسی لمحے فرحانہ نے آنکھیں کھولیں اور بیزاری سے گویا ہوئی۔

”تمہیں لگ رہا ہوگا کہ میں بکواس کر رہی ہوں۔“ سوینی نے اس کے درست انداز سے پر بے اختیار نظریں چرائیں، حقیقتاً اسے فرحانہ زہر لگ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں جانے کے لئے اس نے فوراً کتابیں سینٹا شروع کر دیں، ابھی وہ خاموش تھی کہ فرحانہ ایک دفعہ پھر بول اٹھی درست لہجے میں۔

”کبھی اپنی پنکی باجی سے پوچھنا کہ ایمن انصاری کون تھی؟ اور کہاں گئی؟“

”ہاں بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ فرحانہ نے ست لہجے میں جواب دیا تو اس نے نرمی سے مشورہ دیا۔

”آپ گھر سے ہوا آئیں؟“

”ارے یار ہماری ایسی قسمت کہاں؟ گھر والوں نے تو مجھے پیسہ کمانے والی مشین سمجھ رکھا ہے اور جب گھر میں معاشی مسائل سرکھولے کھڑے ہوں تو والدین بھی کبھی کبھار ایک آدھ بچے کے معاملے میں سیلفش ہو کر باقی بچوں کا مستقبل محفوظ کر لیتے ہیں، مجھ جیسی پتا نہیں کتنی لڑکیاں اپنے گھر والوں سے دوری کا عذاب سہتے ہوئے ان مسائل سے نبرد آزما ہیں۔“ فرحانہ نے کیونچھیلے ہوئے بیزاری سے کہا۔ وہ آج خاصی افسردہ اور اکتائی ہوئی تھی۔ تبھی اپنا آپ اس کے سامنے عیاں کر بیٹھی۔ سوینی کی آنکھوں کے سامنے ناز و آبی کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ بھی کم و بیش ایسے مسائل کا شکار تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ انہیں کیسے حوصلہ دے اس لئے خاموشی سے ان کا جھیل کر دیا کیونچھیلے گئی۔

”بھئی یہ تم لوگوں کی عمارہ عرف پنکی صاحبہ آج کل بڑی اونچی ہواؤں میں ہیں۔“ فرحانہ کے کھوجتے لہجے پر وہ بے اختیار چوٹ گئی اور نا سمجھی کے عالم میں فرحانہ کو دیکھا جو بظاہر بے پروائی سے کیونچھیل رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب تو کچھ نہیں یار! مائنڈ مت کرنا اس لڑکی نے بہت کم عرصے میں بہت ترقی کی ہے۔ میرے ساتھ ہی یونیورسٹی میں تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا لائف اسٹائل بدل گیا۔ ہر روز نئے نئے ماڈل کی گاڑیوں میں گھومتی ہے۔ پیس اور ریکا اور لبرٹی سے شاپنگ کرتی ہر مہینے ایک نئے بندے کے ساتھ ہوتی ہے۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں، پنکی باجی بس تھوڑی سی سوشل ہیں اور ان کے حلقہ احباب میں کافی لڑکے بھی شامل ہیں، لیکن وہ غلط لڑکی نہیں ہیں۔“ سوینی نے فوراً سنجیدگی سے وضاحت کی اسے حقیقتاً فرحانہ کے کمٹس اچھے نہیں لگے تھے۔

”یار میں نے کب کہا ہے کہ وہ غلط لڑکی ہے۔“ فرحانہ نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے مزید کہا۔ ”بس دور اندیش اور زمانہ شناس لڑکی ہے۔ اپنی زندگی کو بھرپور انجوائے کرتی ہے اور جو بندہ اپنے معاملے میں خود غرض ہو جائے وہ زندگی کی ساری آسائشات کو انجوائے کرتا

لے واں روم میں جا چکی تھیں۔ ٹرے میں سلیقے سے کپ رکھے وہ کچن سے باہر نکلی تو ٹی وی لاؤنج میں عصر کی نماز پڑھتے فرحانہ کو دیکھ کر اسے صبح والی ملاقات یاد آگئی۔ ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔

”حقیک یو مریم! مجھے اس وقت چائے کی طلب شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔“ نازو آہی نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے انتہائی خلوص اور اپنائیت سے کہا۔

”آج بڑے دنوں کے بعد آپ نے مجھے مریم کہا۔“ سوئی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”مجھے تو تمہارا نام مریم ہی پسند ہے جو تم پر بہت سوٹ کرتا ہے، لیکن جب سے بچکی نے تمہیں سوئی کہنا شروع کیا ہے بس یہی نام زبان پر چڑھ گیا ہے اور میرا تو خیال ہے ہاسٹل میں بہت ساری لڑکیوں کو تو تمہارا اصل نام پتا بھی نہیں ہوگا۔“

”ہاں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ اب تو مجھے بھی لگتا ہے میرا نام مریم نہیں سوئی ہے۔“
 ”حالانکہ تم پر مریم نام زیادہ اچھا لگتا ہے۔“ نازو نے کہا۔
 ”لیکن میرا خیال ہے کہ مجھ پر دونوں نام ہی اچھے لگتے ہیں۔“ وہ اترا کر بولی تو اس کے انداز پر نازو کو ہنسی آگئی۔

”اب ہنسنا بند کریں اور قافٹ انھیں فریزر میں قیمہ رکھا ہوا ہے۔ آج مٹر ڈال کر پکاتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں ابھی پچھلے ہفتے ہی تو بتایا تھا۔ آج دال کی باری ہے۔“ نازو نے چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے قطعیت بھرے انداز میں کہا تو وہ بھی مان گئی۔ وہ دونوں کچن میں مصروف تھیں۔ بچکی اور کرن ابھی بھی واپس نہیں لوٹی تھیں۔ کسی کام سے فرحانہ کچن میں آئی تو سوئی نے ناگواری سے اسے دیکھا یہ کچن ہاسٹل کی تمام لڑکیوں کا مشترکہ کچن تھا۔ جہاں چلوں کی تعداد خاصی تھی اور اس وقت وہ ایک خالی چولہے پر دودھ کی دیکھی رکھ کر بڑی اپنائیت سے نازیہ کا حال احوال پوچھ رہی تھی جبکہ سوئی نے سائیڈ پر بڑی صافی اٹھا کر چولہا صاف کرنا شروع کر دیا۔ وہ مکمل طور پر فرحانہ کو نظر انداز کیے ہوئے تھی۔

”یار تمہاری بہن کی شادی کا سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس کی قسمت بہت اچھی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی جو لوگ دوسروں کے ساتھ جیتے ہیں۔ اللہ ان کے ساتھ کبھی نوازی نہیں کرتا۔“ فرحانہ بڑے پر خلوص انداز میں نازیہ سے مخاطب تھی۔

”کیا مطلب؟“ سوئی نے تھوک نفلتے ہوئے اسے دیکھا جس کے چہرے پر معنی خیز سی مسکراہٹ تھی۔

”بھئی مطلب تو اس سے ہی پوچھنا لیکن خدا کے واسطے میرا نام مت لینا، وہ کسی بلا کی طرح میرے پیچھے پڑ جائے گی۔ اس کے ہاتھ بھی تو خاصے لمبے ہیں اور میرا بھی اس ہاسٹل کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

سوئی کو حیرت کا جھٹکا لگا اس نے سر اٹھا کر متحیر لگا ہوں سے فرحانہ کو دیکھا جس کا لہجہ مضبوط اور ہر اعتماد تھا۔ اسے سخت غصہ آیا لیکن نہ جانے کیوں وہ خاموش رہی اور کتابیں اٹھا کر تیزی سے اندر کی طرف بڑھی تھی کہ پیچھے سے فرحانہ کی بلند آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”ایمن انصاری بھی تمہاری طرح بہت کیوٹ، معصوم اور پیاری لڑکی تھی جسے دوست اور دشمن کی پہچان نہیں تھی۔“

سوئی نے پلٹ کر اسے غصے سے دیکھا جو اسے خواہ مخواہ الجھن میں مبتلا کر گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے کتابیں ایک سائیڈ پر رکھیں اور گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں کچھ دیر یوں ہی پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھی اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے اس نے کچن میں جا کر ڈیپ فریزر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی بوتل میں پانی برف بن چکا تھا لیکن پھر بھی جیسے تیسے کر کے اس نے ایک دو گھونٹ پانی اس میں سے دریافت کیا اور غٹا غٹ پئی گئی۔ کمرے میں واپس آ کر اس نے لائٹ جلائی سامنے دیوار پر بچکی کی ہوٹلر با حسن والی پوسٹر ساز تصویر کو غور سے دیکھا اور سر جھٹک کر اس نے سوچا۔ ”مجھے اس بے ہودہ لڑکی کی بات ایک سیکنڈ کے لئے بھی سننا نہیں چاہیے تھی جو مجھے اتنی اچھی بچکی باجی سے بدگمان کر رہی تھی۔“ پھر کندھے جھٹک کر وہ میٹرس پر لیٹ گئی اور کچھ ہی منٹوں کے بعد وہ گہری نیند کی دادیوں میں کھوپچکی تھی۔

* * *

شام کو وہ سو کر ابھی تو ذہن خاصا فریش ہو چکا تھا اور فرحانہ سے ہونے والی ملاقات بھی ذہن سے نکل چکی تھی۔ شام کو اٹھ کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے لیے ایک کپ چائے بنا لی تو نازو آہی کو آتادیکھ کر وہ فوراً چائے کا دوسرا کپ بھی بنانے لگی جب تک وہ فریش ہونے کے

”بس یار دعا کرو اللہ مجھے ہمت دے۔“ چادل بھگوتے ہوئے نازیہ نے سادگی سے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں سارے کام تو اللہ کے ہوتے ہیں، لیکن کچھ کاموں کے لئے وہ اپنے خاص لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔“ فرحانہ دودھ کی دہکنی کے نیچے آنچ کم کرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

”ہاں اللہ ان کی والدہ صاحبہ کو بھی توفیق دے کہ وہ اپنی بڑی بیٹی کے بارے میں سوچیں۔“ سوئی نے تلخ لہجے میں کہا تو فرحانہ نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر بڑے گہرے لہجے میں گویا ہوئی۔

”مریم! مائیں کبھی اپنی اولاد کے بارے میں غلط نہیں سوچتیں، بے شک نازو کے سر پر ان کا سارا گھر چل رہا ہے، لیکن وہ اپنی ساری اولاد کی نسبت نازو کے لئے زیادہ پریشان ہوتی ہوں گی اور سب سے زیادہ دعائیں بھی اسے ہی دیتی ہوں گی۔ اس معاشرے میں عورتوں کے لئے کافی مسائل ہیں اور اس صورت میں جب وہ بیوہ بھی ہوں تو مسائل میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ بس ذمے داریوں کو بوجھ نہیں بنانا چاہیے۔ ورنہ زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔“ فرحانہ کا انداز ناصحانہ تھا، جبکہ سوئی نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ بے پروائی سے اٹھتے ہوئے چادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ رات چکی خاصی لیٹ آئی تھی اور آتے ہی اس کی آنٹی ستارہ کے ساتھ جھڑپ ہو گئی، جس کی وجہ سے اس کا موڈ خاصا خراب تھا۔ چنانچہ کھانا خاموشی سے ہی کھایا گیا۔ اس کے بعد چکی ان کو اپنی آج کی شاپنگ دکھانے لگی، جس کی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی۔ چار سوٹ، دو شالیں، بونینزا کا سویٹر، بند شوز اور کاسٹیکس کا کافی سارا سامان۔ سوئی اور کرن بہت شوق اور دلچسپی سے ایک ایک چیز پکڑ کر دیکھ رہی تھیں، جبکہ نازو چائے بنانے کے لئے چلی گئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ چکی باجی آپ کو آج تنخواہ مل گئی ہے، جو سب کی سب اڑا آئی ہیں۔“ کرن نے شرارت سے کہا تو وہ بے پروائی سے بولی۔

”ارے نہیں یار! ابھی کہاں ابھی تو پورے پندرہ دن پڑے ہیں، وہ تو سکندر صاحب اپنی مسز کے لئے شاپنگ کرنے گئے تھے۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے ہیلپ کے لئے اور نہ نہ کرنے ہوئے انہوں نے مجھے بھی یہ چیزیں دلا دیں۔“

”کیا.....؟“ حیرت سے ان دونوں کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

”بھئی اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟“ وہ بڑے عجیب انداز میں بولی تو سوئی نے فوراً ہڑبڑا کر وضاحت دی۔

”ہمارا مطلب تھا کہ یہ تو بہت قیمتی چیزیں ہیں۔“ سوئی نے چائے کا گم اٹھاتے ہوئے کہا۔

تو سکندر صاحب کو کون سا کس چیز کی کمی ہے۔ جدی پشتی رئیس بندے ہیں۔ شہر میں چار فیکٹریاں اور کروڑوں کی جائیداد ہے ان کی اور اپنی مسز کو ڈائمنڈ کی شاپنگ ایسے کرواتے ہیں جیسے ہم کسی ریڑھی سے دس دس روپے کی کئی چیزیں لے لیں۔“

”اچھا.....؟“ دونوں کے چہرے پر کچھ حیرانی اور کچھ بے یقینی مترشح تھی۔

”پھر تو بڑی موجیں ہوں گی، ان کی مسز کی۔“ کرن نے ستائشی لہجے میں کہا۔

”یہ تو مجھے پتا نہیں، البتہ تین شادیاں کر چکے ہیں موصوف اور ان کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں جس پوسٹ پر میں کام کر رہی ہوں، اس پر پہلے ایک لڑکی منال خان تھی۔ سنا ہے سکندر صاحب نے اسے تو خوب عیاشی کروائی تھی۔ اسلام آباد میں ایک خوبصورت فرنشڈ فلیٹ خرید کر اسے گفٹ کیا۔ اس کے ایک بھائی کو انگلینڈ میں سیٹل کروایا۔ بہت زبردست زیرو میٹر گاڑی اسے لے کر دے رکھی تھی۔“

”پھر کہاں گئی منال خان؟“ سوئی نے بے تابی سے پوچھا۔

”جانا کہاں تھا، خاصی اونچی شے تھی، دہلی میں سکندر صاحب کے ساتھ گئی۔ وہاں کسی شیخ کی نظر کرم اس پر پڑی اور شیخ صاحب اس کے پیچھے پاکستان..... منال نے دیکھا کہ ٹکڑی پارٹی ہے، فوراً اس شیخ سے شادی کی اور آج کل متحدہ عرب امارات میں عیش کر رہی ہے۔“

چکی کے لہجے میں اس کے لئے ستائش کے ساتھ ساتھ ایک محسوس کیا جانے والا حسد بھی جھلک رہا تھا۔

”پھر سکندر صاحب تو بہت اپ سیٹ ہوئے ہوں گے۔“ سوئی کے معصومانہ انداز پر چکی کے حلق سے بے ساختہ قہقہہ برآمد ہوا۔

”اومیری بھولی چڑیا! کس زمانے میں جیتی ہو تم، تمہیں تو لوگ بچ کر کھا جائیں اور تمہیں ہٹانے چلے۔“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ سوینی نے جھینپ کر کہا تو چکی کے لیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”مائی ڈارلنگ! سکندر کو لڑکیوں کی کمی ہے بھلا..... اور پھر ایسے لوگ تو چار چھ ماہ سے زیادہ کسی لڑکی سے دوستی رکھتے بھی نہیں۔ ان کا دل بھر جاتا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش انہیں متحرک رکھتی ہے۔“

”پھر لعنت ہو ایسی دوستی پر۔“ کرن نے جل کر کہا۔

”لیکن یار لڑکی اگر غلط انداز میں ہو تو چار چھ ماہ میں اگلے بندے سے اتنا کچھ نکلا سکتی ہے کہ کئی سال بغیر جاب کے آرام سے گزر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔“ چکی نے اپنا موقف بیان کیا تو سوینی اس سے اختلاف کے باوجود خاموش ہو گئی۔

”بہر حال یہ ایک غلط طریقہ ہے۔ وقتی خوشیوں کے لیے ناجائز حربے استعمال کرنے سے وہ چیزیں جائز نہیں ہو جاتیں اور یہ تو عورت کی توہین ہے کہ وہ اپنا آپ بچ کر اس طرح دولت سمیٹے دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر اس کے لئے ذلالت ہی ذلالت ہے۔“ نازو نے سادہ سے لہجے میں اپنا موقف بیان کیا تو چکی نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

”یار تم کون سے زمانے میں جیتی ہو۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد کی اصغری کا دور نہیں ہے اور نہ ہی زندگی اتنی طویل ہے کہ بندہ لمبے لمبے منصوبے بنا کر ان کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگتا شروع کر دے۔ آج کا دور بہت تیز ہے اور بہت زیادہ کمپیشن ہے۔ آج کے دور میں وہی بندہ کامیاب ہے جو ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔“

”یہ کون سی جنگ ہے جس میں ہر چیز جائز ہے؟“ نازو نے طنزاً پوچھا۔

”مائی ڈیزر! یہ انسانی بقا کی جنگ ہے۔ آج اگر آپ کے تن پر قیمتی لباس ہاتھ میں بیش قیمت موبائل، قدموں کے نیچے گاڑی اور پرس میں ڈیروں روپیہ نہیں ہے تو کوئی آپ کی عزت نہیں کرے گا۔ آج کل بس پیسے کو سلام ہے۔ پیسہ بڑے بڑے لوگوں کے منہ بند کر دیتا ہے۔ پیسے کے زور پر آپ ہر خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ کوئی محبوبہ اپنے محبوب سے کہے کہ میں آپ کے ساتھ دال روٹی کھا کر گزارہ کر لوں گی۔ پیٹ میں رزق نہ ہو تو ساری محبت بھک کر کے اڑ جاتی ہے۔ ہم مڈل کلاس فیملیز کا سب سے بڑا مسئلہ ہی پیسہ ہے، معاشی ضروریات کی بنا پر گھروں میں جھگڑے ہوتے ہیں اور نوبت مار کٹائی تک پہنچ جاتی

ہے۔“ چکی نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

”تو تمہارا خیال ہے کہ یہ اپر کلاس جہاں پیسے کی فراوانی ہے وہاں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔“ نازو نے سگتے لہجے میں پوچھا تو وہ نسبتاً سخت اور تیز لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے کہ وہاں بھی مسائل ہوں گے لیکن ان کی نوعیت اتنی شدید نہیں اور میرے خیال میں زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہی معاش کا ہے۔ پیٹ بھر کر پسندیدہ کھانا ہو اور ضرورت کی ہر چیز میسر ہو تو انسان باقی مسائل کا حل بھی نکال ہی لیتا ہے۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری۔“ نازو نے تنک کر کہا۔

”غلط فہمی کیوں ہونے لگی۔ اب تم اپنی ہی مثال لے لو تمہارے گھر کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے کہ باپ وفات پا چکا ہے اور بھائی سب سے چھوٹا اور تم ان سب کی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے گھر والوں سے دوری کا عذاب کاٹ رہی ہو مجھ سے لکھو لو کہ ہر ماہ تمہارے گھر والوں کو تمہاری آمد سے زیادہ تمہارے بھیجے گئے منی آرڈر کا انتظار ہوتا ہو گا۔ دو چار دن لیٹ ہو جائے تو فون آنے شروع ہو جاتے ہیں اور سب کو تم سے زیادہ ان پیسوں کی خیریت کی تمنا ہوتی ہے۔ آج اگر تمہارا تعلق کسی اچھے اور کھاتے پیتے گھرانے سے ہوتا بے تحاشا جائیداد ہوتی تو کس چیز کی فکر تھی؟ اب صرف اور صرف تمہاری پینڈم سیکری کے چکر میں ہی تمہاری والدہ تمہاری شادی کرنے کے بجائے تم سے چھوٹی تین بہنوں کی شادی کر چکی ہیں۔ اب یہی گھر میں کوئی اور ذریعہ معاش ہوتا تو تمہاری والدہ سب سے پہلے تمہیں ہی رخصت کرتیں۔ اس لیے تم مان جاؤ کہ یہ سب پیسے کی دوڑ ہے اور اسی کی کشش ہے۔“ چکی کی نگاہیں خشکی اور انتہائی گہرا طنز یہ انداز تھا۔ نازو لب بھینچ کر رہ گئی۔ اس کا چہرہ سرخ اور تیوری چڑھی ہوئی تھی۔

”چکی تم بعض اوقات بہت زیادتی کر جاتی ہو۔“ وہ سرد لہجے میں کہہ کر رکی نہیں، گولی کی طرح اڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ بہت زور ہے اس نے دروازہ بند کیا تھا۔ وہ دونوں بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہ گئیں جبکہ چکی ناراض لہجے میں بولی۔

”سخت بے وقوف لڑکی ہے یہ ایک دن بہت پچھتائے گی اور تب اسے میری باتیں یاد آئیں گی۔ اسے نہیں معلوم لڑکی کی جوانی کتنی جلدی ڈھلتی ہے۔ اگر وقت پر فیصلہ نہ کیا جائے تو پھر آگنی ستارہ جیسے کیس ہی سامنے آتے ہیں اور پھر کوئی نہیں پوچھتا اور جن بہن بھائیوں کی

محبت میں پاگل ہو کر یہ اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہی ہے، کل کو ان میں سے کسی نے بھی اس کی قربانی کو یاد نہیں رکھنا، پھر سر پر ہاتھ رکھ کر روئے گی۔“

”اللہ نہ کرے، چکی باجی۔“ سوئی نے کہا، ویسے بھی اسے ناز و آباہت اچھی لگتی تھیں۔

”میں کون سا اس کی دشمن ہوں۔“ چکی دھیمے انداز میں بڑبڑاتی اور ساکت وصامت

بیٹھی سوئی کو دیکھ کر بولی۔

”آج کے دور میں کوئی اپنا نہیں ہوتا، بہن بھائی بھی تب تک ہوتے ہیں، جب تک ان کی شادیاں نہیں ہو جاتیں۔ اس کے بعد ان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں اور زندگی میں وہی بندہ کامیاب ہے، جو اپنی ذات کے بارے میں سوچنے، باقی سب بعد میں بس.....“ چکی کا موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا۔ وہ اب غصے سے اپنی شاپنگ سیٹیں لگی، جبکہ کرن اور سوئی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنے آگے کھلی کتابوں پر سر جھکا دیے، لیکن سوئی کی تمام توجہ اور دھیان ناز و آپی کی طرف تھا، جو اتنی سردی میں پتا نہیں کہاں گئی تھیں، جبکہ چکی باجی تمام سامان سمیت کرا ب اپنے کمرے میں گھسی سیل فون پر کسی سے خوش گلیاں لگانے میں مگن تھیں۔

”ویسے بندے کو ایسا ہی بے پروا ہونا چاہیے۔“ سوئی نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں سوچا اور پھر کرن کو مکمل توجہ سے نوٹس کی طرف متوجہ دیکھ کر خود بھی نظریں کتاب پر جھکا لیں، حالانکہ ذہن اب بھی پڑھائی کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد ناز و آپی کو کمرے میں آتا دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اپنے دل کے بوجھ اور گھبراہٹ کے سبب کو جان گئی تھی۔

* * *

”ایسی نحوست چھائی ہوئی ہے اس گھر میں کہ اندر داخل ہوتے ہی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔ کہاں ہیں ساری منخوس عورتیں، سارے گھر کے دروازے کھول کر چوروں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ اور آکر میرے گھر کو لوٹ لو۔“ وہ حسب عادت اور حسب معمول گھر میں داخل ہوتے ہی انتہائی غیر مہذبانہ لہجے میں چلنا شروع ہو گئے تھے۔ کچن میں مصروف شائیم کا دل زور سے دھڑکا اور ہاتھ میں پکڑی سنیل کی پلیٹ چھوٹ کر فرش پر جاگری جس کی آواز باہر کھڑے مرزا صاحب کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔

”تم ایسی ست، پھوہڑ اور منخوس عورت ہو، جسے ذرا بھی احساس نہیں کہ گھر کا واحد مرد

سارا دن کھپ کے گھر آیا ہے۔ اسے بجائے چائے پانی کا پوچھنے کے باورچی خانے میں برتن اٹھا اٹھا کر پھینکے جا رہے ہیں۔ ماں باپ نے کوئی تمیز سکھائی ہوتی تو روز میرے گھر میں بے عزتی نہ کروا رہی ہوتیں۔ کہاں ہیں تمہاری آوارہ بیٹیاں، کہیں بھاگ تو نہیں گئیں؟“ وہ صحن میں کھڑے بری طرح برس رہے تھے۔ ان کے لہجے میں حاکیت اور درشتی تھی۔ کمرے کے اندر کھڑی ضوبیہ اور چھت پر کپڑے پھیلاتی ثوبیہ کا دل تنگی سے بھر گیا۔

”اس قسم کے گھٹیا ماحول میں رہنے سے اچھا ہے کہ بندہ گھر ہی سے بھاگ جائے۔ کم از کم روز روز کی گندی گالیوں سے تو نجات ملے۔ کوئی بندہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسے ظالم باپ بھی ہو سکتے ہیں۔“ فوزیہ نے بھنا کر کہا۔ وہ تینوں بہنوں میں کچھ دلیر اور منہ پھٹ تھی۔

”فضول باتیں مت کرو فوزی۔“ ثوبیہ نے خالی بالٹی اٹھائی اور نیچے کی طرف قدم بڑھائے مرزا صاحب کو ان کے چھت پر جانے پر بھی سخت اعتراض تھا اور وہی ہوا انہیں بیڑھیاں اترتے دیکھ کر وہ صحن میں ہی گر جتنے لگے۔

”کتنی دفعہ اس منخوس عورت کو سمجھایا ہے کہ جوان جہان بیٹیوں کو چھت پر مت بھیجا کرؤ زمانہ خراب ہے، مگر یہ عورت اتنی بے وقوف، عاقبت نااندیش اور بے پروا ہے کہ اسے ذرا بھی پروا نہیں، جیسی خود آوارہ تھی، بیٹیاں بھی ویسی ہیں۔ جن کا گھر کی چار دیواری میں دل نہیں لگتا، کیا کرنے گئی تھیں، تم لوگ اوپر؟“ ان کے لہجے سے چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔ ثوبیہ کا رنگ اک دم فق ہو گیا، جبکہ فوزی نے بہ مشکل غصہ ضبط کر کے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

”ابا کپڑے پھیلانے گئے تھے۔“

”ہاں یہ کپڑوں کا بہانہ خوب ہے۔ جب کبھی عیاشی کرنے کا دل چاہا کپڑے اٹھائے اور پھیلانے کے بہانے چھت پر نک گئے۔ آنکھیں بھی سینک لیں اور بہانہ بھی مل گیا۔ یہ بے وقوف کسی اور کو بنانا، خبردار! مجھے تم تینوں میں سے کوئی بھی بیڑھیوں کے پاس نظر آئی، ناخنیں توڑ دوں گا۔“ مرزا صاحب کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں بہنیں پوچھل قدموں سے کمرے میں چلی گئیں، جہاں ضوبیہ ناخن چباتی آنسو روکنے کی سعی کر رہی تھی۔

”گڑیا کیا ہوا؟“ ثوبیہ نے ہمدردانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

کی طلب ہوئی، مگر بے بسی سے اپنے پاؤں پر نظریں جمائے بیٹھی رہی جبکہ بیا فوراً ماں کی مدد کے لئے کچن کی طرف بڑھ گئی جبکہ فوزی کو اپنے دل میں کوئی پن سی چبھتی محسوس ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سامنے پڑے پیٹنگ پر بیٹھ کر بازوؤں میں منہ چمپا کر بیٹھ گئی۔

”ضوبی! فوزی بیٹا کھانا کھالو۔“ ثنائیکم مرزا صاحب سے فراغت پا کر اندر آئیں تو ان کا لہجہ اندر کی شگفتگی کا پتا دے رہا تھا۔

”امی بھوک نہیں ہے۔“ ضوبی نے کمزوری آواز میں کہا اور ویسے بھی باپ کے گھر آنے پر اس کی بھوک پیاس سب اڑ جاتی تھی۔ ثنائیکم کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آ پڑا انہوں نے بے اختیار ضوبی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”بیٹا رزق سے ناراضی تو اچھی نہیں۔ اٹھو شاباش تم نے دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ ابھی میں نے اپنی بیٹی کی پسندیدہ کڑھی چاول بنائے ہیں۔“ ان کے لہجے میں بیٹیوں کے لئے پیار ہی پیار تھا۔

”امی یہ ابا ہر بات پر ہمیں منحوس اور بدکردار ہونے کا طعنہ کیوں دیتے ہیں؟ اپنے اس اڑھائی مرلے کے گھر کے علاوہ ہم نے کبھی باہر کی دنیا کی شکل نہیں دیکھی، سکول اور کالج وہ خود چھوڑنے جاتے ہیں اور خود لے کر آتے ہیں۔ ہم نے کبھی ان کو تنگ نہیں کیا، پھر بھی وہ ہر وقت ہمیں کوستے ہیں۔“ ضوبی کی آواز بھرا گئی۔ ثنائیکم نے گہری سانس لے کر اپنا دوپٹہ درست کیا اور جب بولیں تو ان کے لہجے میں گہرے ڈھک کی کاٹ تھی۔

”بس بیٹا تمہاری ماں کی غلطی کا خمیازہ تم لوگوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ میں نے اپنے والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی، ان کا دل دکھایا جس کی سزا شاید خدا نے مرزا صاحب کی شکل میں دے دی ہے۔ بس دعا کرو اللہ تمہاری ماں کی آزمائش ختم کر دے۔“

”اکیس سالوں سے تو آپ یہ سزا بھگت رہی ہیں اور کب تک برداشت کریں گی؟ اللہ کو بھی ہم پر ترس نہیں آتا۔“ وہ ماں سے اُلجھ پڑی۔

”بڑی بات بیٹا! ایسا نہیں کہتے خدا تو اپنے بندوں کے ساتھ برا نہیں کرتا، یہ تو ہمارے اپنے اعمال ہوتے ہیں، ہمارے غلط فیصلے ہوتے ہیں جو قدم قدم پر ہمارے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں اور ہمیں ہماری بے قوفی کا احساس دلاتے ہیں۔ بس دعا کرو اللہ ہمارے حال پر رحم کرے اب تو میں بھی تھکے لگی ہوں۔“ ثنائیکم کی بے بسی دیدنی تھی۔ فوزی نے بے اختیار اٹھ

”بیا! ابا ایسے کیوں ہیں؟“ وہ ایسی ہی تھی۔ بہت حساس اور جذباتی بیا نے بے اختیار اس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔

”چندا! پتا نہیں ایسے کیوں ہیں میں نے تو شروع سے ان کو ایسے ہی دیکھا ہے۔ انہجائی غصیلے اور شکی مزاج۔“

”امی نے دماغ ٹھیک نہیں کیا ان کا۔ شروع دن سے سر پر چڑھا لیا۔ تبھی انہوں نے ہم چاروں ماں بیٹیوں کی زندگی عذاب کر رکھی ہے، حالانکہ پسند کی شادی جرم نہیں اور اگر جرم بھی ہے تو جتنا قصور امی کا ہے اتنا ہی ابا کا بھی، پھر وہ ہر وقت امی کو ہی قصور وار کیوں گردانے ہیں۔“ فوزی تلخ لہجے میں صاف گوئی سے بولی۔ ان تینوں بہنوں میں بس سال، سال کا ہی فرق تھا۔ اس لیے خاصی بے تکلفی تھی۔

”بس چندا! جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں۔ وہ مرد کی لغزش کو تو بھلا دیتا ہے، لیکن عورت کو ساری زندگی سنگسار کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ امی اپنی غلطی کا خمیازہ پچھلے اکیس سالوں سے بھگت رہی ہیں اور اباجی کی زبان کی دھار ان کو ہر روز زخمی کرتی ہے، لیکن وہ اپنے لب سینے بس زندگی گزار رہی ہیں، کیونکہ واپسی کے سارے دروازے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیے تھے اور ابا کو ان کی اس کمزوری کا بخوبی احساس ہے۔“ بیا کا لہجہ تاسف اور افسردگی سے ڈوبا ہوا تھا۔ اسے اپنی ماں کا ڈھکھا صاحب محسوس ہوتا تھا، جو زندگی کی ساری خوشیاں اپنے اوپر حرام کر چکی تھیں، بس ہونٹ بھیجنے خاموشی سے گھر کے کام کیے جاتیں۔ محلے میں کسی کے گھر بھی آنے جانے کی ان کو اجازت نہ تھی اور اگر کوئی خاتون بھولے سے آ بھی جاتی تو ابا اپنے کمرے میں اونچی آواز میں بڑبڑانا شروع کر دیتے۔ آنے والی کو بھی صورت حال کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا اور یوں آہستہ آہستہ ان کے گھر آنے والوں کی آمد و رفت بھی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔

”میں کہتا ہوں کہ آج گھر میں کھانے کو بھی ملے گا یا پھر بازار سے جا کر زہر لے آؤں تاکہ یہ جو چار عذاب میری جان پر مسلط ہیں ان سے چھٹکارہ ملے۔ ساری زندگی مجھے اس عورت سے کبھی سکون نہ ملا اور اللہ نے اولاد بھی دی تو اٹھا کر اس بدکردار عورت جیسی تین لڑکیاں بھیج دیں اور میری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا۔ کچاں مر گئے ہیں سارے لوگ؟“ مرزا صاحب کی گرج دار آواز سے ضوبیہ کی تو ناٹکیں کا پنے لگیں۔ حلق خشک ہو گیا۔ شدت سے پانی

کر ماں کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیا ان کے خاموش آنسو بہنے لگے۔ اندر بچن میں کھڑی ٹوبہ جسے ہمیشہ پیار سے بیا کہتی تھیں اور بہنوں میں وہ سب سے بڑی تھی دودھ گرم کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”کیا ہے یہ زندگی جس کا ہر سانس اذیت بھرا اور درد ناک ہے ہر طرف شک کے پہرے اور سوچوں پر پابندی ہے۔ لفظوں کے درد ناک گھاؤں سے بعض اوقات اپنے وجود سے شرمندگی ہونے لگے۔“ وہ رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو انگلیوں کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ”لڑکیاں کتنی بے قوف ہوتی ہیں مردوں کے بچائے ہوئے خوشنما جال میں پھنس کر اپنے خونی رشتوں سے بغاوت پر اتر آتی ہیں۔ وہ جن کے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے وہی رشتے انہیں اپنے دشمن محسوس ہونے لگتے ہیں اور محبت کی وادی میں اترنے کے بعد تو ایک شخص کے علاوہ ہر رشتہ زہر لگنے لگتا ہے۔ زندگی صرف ایک شخص کے سنگ شہنائیوں اور شادیوں کا دوسرا نام محسوس ہونے لگتی ہے اور جب زندگی کی تلخ حقیقتیں اس محبت کی وادی میں داخل ہوتی ہیں تو انسان دم بخود سا رہ جاتا ہے اور ایسی صورت میں جب لڑکی اپنی واپسی کے سارے دروازے بند کر آئی ہو تو زندگی خوف و اندیشوں کی دھول میں اٹ جاتی ہے اور تب لڑکیوں کے حصے میں صرف خسارہ ہی آتا ہے۔“ گہری سانس لے کر اس نے دودھ گلاس میں ڈالا اور گلاس ٹرے میں رکھ کر ابا کے کمرے کی طرف چلی آئی جہاں وہ اپنے بستر پر لیٹے سگریٹ سلگا رہے تھے اسے دیکھتے ہی جلتا سگریٹ فرش پر پھینکا اور غصے سے چلائے۔

”کہاں مر گئی ہے تمہاری ماں۔ ہزار دفعہ اس جاہل عورت کو کہا ہے کہ میرے کمرے میں صرف وہ چیزیں لے کر آیا کرے مگر اسے بستر توڑنے سے فرصت ہی نہیں۔“

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لئے وہ نماز پڑھ کر سونے چلی گئی تھیں۔“ بیانے بڑے ضبط سے اٹک پئے۔

”ہونہ! ڈرامے ہیں اس عورت کے۔ ورنہ اچھی خاصی ہٹی کٹی تو ہے۔ میری ساری زندگی اس نے خراب کر دی پتا نہیں کیا دماغ خراب ہو گیا تھا میرا! جو اس ناگن کے ہتھے چڑھ بیٹھا۔ ماں باپ نے علیحدہ جائیداد سے عاق کر دیا اوپر سے یہ بھی خالی ہاتھ لڑکھاتی چلی آئی۔ کہنے کو میرے سسرال والے جاگیردار ہیں اگھوٹی بیٹی کو ایسے گھر سے نکالا کہ دوبارہ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اپنے چار مستندے بیٹوں کے نام ساری جاگیر کر دی اور یہ عذاب میرے اوپر مسلط کر

دیا۔ ساری زندگی پیسے کو ترسا ہوں اوپر سے ہر سال بیٹیوں کی لائن لگا دی۔ اب کہاں سے بیاہوں گا انہیں یا پھر یہ بھی ماں کی طرح اپنے کسی یار سے چھپ کر شادی کر لیں گی اور کریں گی بھی کیا.....؟“ وہ دودھ کا کپ پیتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہے تھے۔ بیا سکتی کھڑی کچھ لمحے تو انہیں دیکھتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو وہ بات کرتے کرتے خصوصی طور پر اسے متوجہ کر کے بولے۔ بیانے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اس سے پہلے کہ میرا بی بی شوٹ کر جائے یا دماغ کی نسیں پھٹ جائیں دفع ہو جاؤ یہاں سے موت کے فرشتے کی طرح سر پر کھڑی ہو گئی ہو۔“

”جی.....!“ بیا ہکا بکا سی ان کی شکل دیکھنے لگی اور پھر ہڑبڑا کر کمرے سے نکل گئی۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ کو ہمیشہ ایسے ہی گرجتے برستے اور بدلجاتی سے بات کرتے دیکھا تھا۔ باہر نکل کر اس نے برآمدے میں پڑے کولر سے گلاس میں پانی ڈالا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو۔

”تمہارے ابا کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ ان میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟“ ثمر نے کالج کینٹین کی طرف جاتے ہوئے ناراضی سے بیا سے پوچھا۔

”بس یار! وہ شروع سے ہی ایسے ہیں۔“ بیانے صفائی دی لیکن ثمر کے ماتھے کے بل اب بھی کم نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے وہ چڑ کر بولی۔

”یہ کیا جواب ہے کہ وہ شروع سے ہی ایسے ہیں اگر وہ شروع سے اتنے بدلجنا اور خرد ماغ ہوتے تو تمہاری امی کبھی ان سے شادی نہ کرتیں۔ آنکھوں دیکھی کبھی بھلا کون نکلتا ہے۔“

”دیکھو ثمر.....“ وہ جاتے جاتے رکی اور انتہائی سنجیدگی سے انگلی اٹھا کر اسے مخاطب کیا

”تم مجھے پچھلے تین سالوں سے جانتی ہو کہ میرے گھر کا ماحول کیسا ہے اور ہم تینوں بہنوں کو امی نے کس طرح پڑھنے کی اجازت دلوائی ہے۔ ہماری ایک معمولی سی غلطی ہم تینوں بہنوں کے مستقبل کو خراب کر سکتی ہے۔ ہم تینوں کو ابا خود سنور جانے سے پہلے چھوڑ کر جاتے ہیں اور واپسی پر کالج سے لینے بھی آتے ہیں اس سلسلے میں انہیں رکشے والے پر بھی اعتبار نہیں۔ حالانکہ پچھلے کئی سالوں سے ہم ایک ہی رکشے پر آ جا رہے ہیں۔ شروع شروع میں تو رکشے

گی اور ہارون بھیا میرا مذاق اڑا رہے تھے کہ وہ کبھی نہیں آئے گی۔ وہ آکر اپنا نہ آنے والا پرانا ریکارڈ خراب نہیں کرے گی اور تو اور بابا بھی ہنس رہے تھے۔ اب میرا کتنا مذاق اڑے گا۔“ شمر وہاں ہی ہو کر بولی اسی وقت فوزی نے وہاں انٹری دی جو اسی کالج میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی اور کافی دیر سے بیا اور شمر کو لڑتے دیکھ رہی تھی۔

”ارے شمر باجی آپ کن سے متھاڑا رہی ہیں۔ ان کا بس چلے تو سانس بھی ابا جی سے پوچھ کر لیں۔“ فوزیہ کی بات پر شمر نے شکایتی نظروں سے بیا کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ”یہ بھی تمہاری بہن ہے۔ بہادر اور کچھ کچھ صاف بات کرنے والی۔“

”تم درمیان میں مت بولو۔“ بیا نے اپنے سے دو سال چھوٹی بہن کو ڈانٹا تو وہ برے برے منہ بنانے لگی جبکہ شمر کا موڈ خاصا خراب تھا۔ وہ بھی رُخ موڑے کھڑی تھی۔

”شمر باجی! اگر آپ مجھے کالج کینٹین سے ایک زبردست ٹریٹ دیں تو آپ کے مسئلے کا حل میں نکال سکتی ہوں۔“ فوزیہ کی بات پر شمر نے اشتیاق بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بے تاب سے کہا۔

”آپ.....“ اس نے کن آنکھوں سے بہن کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بات مکمل کی۔ ”آپ یوں کریں کہ بارہ بجے کے بجائے دوپہر ادھ سو ری صبح گیارہ بجے کا ٹائم رکھ لیں اور پھر دس بجے بیا کو ساتھ لے کر کالج سے چلی جائیں اور بارہ بجے چھوڑ جائیں گے۔ ابا تو ڈیڑھ بجے ہی لینے آئیں گے تب تک آپ کالج میں ہوں گی۔“ فوزی نے آرام سے حل پیش کیا تو بیا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔“ بیا نے خفا خفا لہجے میں کہا۔

”لیں کیا حرج ہے ابا کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اب کیا ہم سانس لینا بھی چھوڑ دیں؟“ فوزی نے کن آنکھوں سے اپنی بہن کو دیکھا اور دلکش انداز میں مسکرا دی تو بیا نے ایک تیز نگاہ ال پر ڈالی۔

”میں ایسی کوئی فضول حرکت نہیں کر سکتی۔“ بیا نے صاف انکار کر دیا۔

”اس میں فضول بات کیا ہے؟ بالکل آسان سی تجویز ہے اور تم کون سا خدا نخواستہ کسی سے ملاقات کے لیے جارہی ہو اور پھر جب والدین اپنی اولاد کی جائز خواہشات بھی ماننے سے انکار کر دیں تو کسی چور دروازے خود ہی سامنے آ جاتے ہیں اب اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں

والے کو بھی عجیب لگتا تھا کہ وہ راستے میں آتے ہوئے پہلے سنور پر رک کر ابا کو لیتا تھا اور پھر ہمیں کالج سے لینے آتا تھا، لیکن تین سال ہو گئے ہیں ہمیں ایک ساتھ اس کالج میں پڑھتے ہوئے اور تم جانتی ہو کہ ہم نے کبھی کالج کے کسی فنکشن میں حصہ نہیں لیا اور پھر بھی تم ضد کیے جا رہی ہو۔“

”یاریہ کالج کا کوئی فنکشن نہیں ہے۔ میرے والدین کی ویڈنگ اینورسری ہے اور تمہیں معلوم ہے ناں کہ مجھے اپنے بابا اور ماما سے کتنی محبت ہے اور پھر ہمارے گھر کی یہ ایک چھوٹی سی گھریلو تقریب ہے۔ جس میں ماما، بابا، ہارون بھیا، میں اور تم ہوں گے اور صرف تمہاری وجہ سے میں نے شام کے بجائے دوپہر کا ٹائم رکھا ہے اور تم ہو کہ مسلسل انکار کیے جا رہی ہو۔“ شمر جھنجھلا کر بولی۔

”اچھا تم بتاؤ کہ پچھلے اڑھائی تین سالوں میں میں کتنی دفعہ تمہارے گھر گئی ہوں؟“ بیا بھی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”ایک دفعہ بھی نہیں۔“ شمر نے گلہ آمیز لہجے میں جواب دیا۔

”پھر.....؟“ بیا نے ترکی بہ ترکی کہا تو شمر نے سلگتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

”پھر سے کیا مراد ہے بتاؤ؟ اس کا مطلب ہے کہ تم کبھی میرے گھر نہیں آؤ گی؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑا کا انداز میں بولی۔

”پلیز شمر! میرے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ کالج ہم تینوں بہنوں کے لئے زنداں میں کھلنے والی کھڑکی ہے۔ اسے بند مت کرواؤ۔ بابا کبھی بھی تمہارے گھر جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔“ بیا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں! ہم لوگ اشتہاری ہیں ڈاکے ڈالتے ہیں، قتل کرتے ہیں؟“ وہ بیا کو گھورتے ہوئے بولی تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آ گئی اس کے انداز پر جس پر شمر مزید تپ گئی۔

”اللہ کرے تو یہ مرزا کبھی تمہیں بھی ویسی محبت ہو کسی سے جیسی مجھے تم سے ہے پھر تمہیں پتا چلے کہ دل پر چھریاں کیسے چلتی ہیں ٹھیک کہتے تھے۔ ہارون بھیا تمہاری دوست کبھی نہیں آئے گی۔“

”کیا مطلب؟“ بیا کے کان کھڑے ہوئے۔

”میں نے پچھلے ایک ہفتے سے ڈھنڈورا پیٹا ہوا تھا کہ اس دفعہ بیا ضرور ہمارے گھر آئے

”تمہیں معلوم ہے کہ امی نے کتنی مشکلوں سے ابا سے ہمیں کالج کے لئے پرمیشن لے کر دی تھی اور اپنی زندگی میں واحد اس چیز پر احتجاج کیا جس کے نتیجے میں آج ہم کالج میں ہیں۔“ ضوبی بے زار سے لہجے میں گویا ہوئی۔ ان تینوں بہنوں کی دنیا حقیقت میں گھریک محمد و تھی، ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے یہی گھر دیکھا تھا۔ نہ کوئی رشتے دار نہ دوست نہ کہیں آتا جانا۔ ایک ماں تھی، سنجیدہ اور خاموش خاموش سی۔

اگلے دن بیا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ قدرے تذبذب کا شکار تھی جبکہ اس کے برعکس شمر خاصی پُر جوش اور خوش تھی اور فوزی ان دونوں کو مزید جوش دلا رہی تھی جبکہ ضوبی خاموش تھی۔ شمر کا گھر کالج سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ اس کا ڈرائیور بالکل ٹھیک ٹائم پر لینے آ گیا تھا۔ عظیم الشان کھلے بلیک گیٹ کے اندر کھستی ہوئی گاڑی، طویل روش، دائیں بائیں وسیع و عریض لان اور سامنے سفید ٹائلوں کی خوبصورت بلڈنگ وہ کافی دیر تک ہکا بکا انداز میں کبھی شمر اور کبھی اس کے گھر کو دیکھتی رہ گئی۔ اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ شمر کا تعلق کسی کھاتی پتی فیملی سے ہے، لیکن اس چیز کا قطعاً علم نہیں تھا کہ وہ اس عظیم الشان خوبصورت بنگلے میں رہتی ہوگی۔

ان کی گاڑی کے پیچھے بلیک کرولا آ کر ابھی ابھی رکی تھی۔ بلیک ٹوپیس میں گاڑی سے لکھا ہارون بری طرح ٹھٹکا تھا۔ حجاب سے جماعتی دو سیلی بمنور اسی آنکھیں دراز قد سانچے میں ڈھلاؤ کشش سراپا اور کھنک دار سربیلی آواز جو کہ شمر سے مخاطب تھی۔

”بیا!“ ہارون کے منہ سے بے اختیار نکلا وہ بے اختیار مڑی اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔

”ارے بھائی آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ بیا ہے؟“ شمر بڑی بیاشت سے مسکرائی جبکہ بیا نے آنکھیں جھکا لیں۔ ہارون نے ایک نظر گم صم سی بیا پر ڈالی اور خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

”ارے ان کو تو ہم ہزار لوگوں میں پہچان لیں، تم نے سارا حلیہ تو حفظ کر دیا ہوا تھا، بلکہ تم دس لڑکیوں کو ساتھ لے کر بابا اور ماما کے پاس جاؤ تو وہ بھی آسانی سے بیا کو پہچان لیں گے۔“ بیا کو ایک ہل کے لئے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس منظر میں اسے اپنی پوزیشن کچھ آ کر ڈی گ لی رہی تھی۔ اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا اور شاید ہارون اس کی بے چینی کا سبب جان گیا تھا۔ تبھی اس نے آگے کو قدم بڑھائے بلیک ٹوپیس میں ہاتھ میں پکڑے

تو بے شک مت جاؤ۔“ شمر منہ پھلا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تو بیا کے لئے اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پھر گھر واپسی پر اس نے خوب فوزی کو ڈانٹا جو قدرے بے باک لڑکی تھی۔ حالانکہ بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اسی کالج میں بیا تھرڈ ایئر میں، ضوبی سیکنڈ ایئر میں اور فوزی فرسٹ ایئر میں تھی۔ جب ضوبی کو معلوم ہوا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔

”بیا اگر ابا کو پتا چل گیا تو.....؟“

”تم فضول مت بولو، بیا پہلے ہی بڑی ڈرپوک ہیں اور پر سے تم ابا کی بندوق ان کے کندھے پر رکھ رہی ہو۔ وہاں جا کر بھی یہ ایسے بیٹھیں گی، جیسے کوئی ان کو گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لایا ہو۔“ فوزی نے سر اسر دونوں بہنوں کا مذاق اڑایا تو ضوبی نے خوفزدہ کر دائیں بائیں دیکھا۔ ابا ابھی سٹور سے نہیں آئے تھے اور امی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔

”مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ اوپر سے میں خالی ہاتھ لٹکاتی ان کے گھر کیسے جاؤں گی؟ سخت برا لگ رہا ہے مجھے۔“ بیا کو ایک نئی فکر نے آن گھیرا۔

”اس کا بھی حل میرے پاس ہے۔“ فوزی نے چٹکی بجائی اور فوراً کمرے میں موجود لوہے کی الماری کی طرف دوڑ لگائی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ واصف علی واصف کی کتاب اور ایک آف وائٹ کلر کی شال نکال کے لے آئی۔“

”یہ تو تمہاری دوست ماہانے تمہاری برتھ ڈے پر تمہیں گفٹ کیے تھے۔“ بیا کو یاد آیا۔

”تو کوئی بات نہیں اس کے اوپر کون سا ماہا کی تصویر لگی ہے کتاب پر اس نے کچھ لکھا ہی نہیں تھا اور بالکل نئی تھی اس لیے میں نے سنبھال کر رکھ لی۔ یہ تم اکل کو دے دو اور یہ شال تو ویسے بھی خواتین کے لئے ہے۔ لائٹ سا کھر ہے، قیمتی اور نفیس ہے۔ یہ آرام سے آنٹی کو دے دینا۔ یہ دونوں چیزیں لے جائیں کالج کے ہاسٹل میں موجود شاپ سے پیک کر والیں گے اور وہیں سے کارڈ لے لیں گے اور اللہ اللہ تے خیر صلا۔“ فوزی کے پاس ہر مسئلے کا حل تھا۔

”لیکن اگر ابا کو پتا چل گیا تو؟“ ضوبی سب سے زیادہ ڈرپوک تھی۔

”کیوں! ابا کو رات کو الہام ہو گا یا بیا پورے شہر میں اعلان کروا کے جائیں گی۔“ فوزی بری طرح چڑی۔ اسے کبھی کبھی اپنی دونوں بہنوں اور ماں پر بہت غصہ آتا تھا کہ وہاں احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔

سیل فون پر بات کرتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا شاندار سراپا کسی طور بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں تھا۔ پھر اندر شمر کے بابا اور ماما نے جس محبت و ادائیت کے ساتھ اس کا استقبال کیا وہ کافی دیر تو شرمندہ ہوتی رہی اور پہلی دفعہ اسے وہاں آنے کا فیصلہ درست محسوس ہوا تھا۔

”شمر بیٹا! آپ اپنا کوئی سوٹ بیا کو دو وہ کالج یونیفارم سے تو نجات حاصل کرے تاکہ ہمیں پتا چلے کہ کوئی ہماری گھریلو تقریب میں شرکت کرنے کے لئے آیا ہے۔“ آنٹی نے خلوص بھرے لہجے میں کہا تو وہ انکار نہیں کر سکی۔

شمر کے کمرے میں وہ ڈرینگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے قدرے ملمضم سی کھڑی تھی۔ واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ جیسے چونک کر خود میں واپس آئی لیوں پر خوبصورت مسکراہٹ سجائے فریش فریش سی شمر باہر نکلی۔

”قسم سے بیا، میرا یہ سوٹ تم پر آفت لگ رہا ہے۔“ لائٹ فیروز لباس میں وہ بے حد سادگی کے عالم میں بھی بجلیاں گرا رہی تھی اور کھلے سیاہ سلکی بالوں نے اسے مزید جاذب نظر بنا دیا تھا۔

”بیا یہ فیروز ی چھوٹے چھوٹے سے ٹاپس بھی پہن لو۔“ شمر نے جیولری باکس کے اندر سے اس کے سوٹ کے ہم رنگ ٹاپس دریافت کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا تو اس نے خاموشی سے پکڑ کر پہن لیے۔

”ہاں! اب یہ پنک ہلکی سی لپ اسٹک بھی لگا لو حالانکہ تمہیں ضرورت نہیں ہے۔“ شمر کے شرارت بھرے فخرے پردہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

”بکواس مت کرو مجھ سے یہ فضولیات نہیں ہوتیں۔ تم آہستہ آہستہ زیادہ ہی فری ہو رہی ہو۔ میں اگر خاموشی سے تمہاری ساری باتیں مان رہی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مزید پھیلنا شروع کر دو۔“

”اس میں پھیلنے والی کیا بات ہے؟ ساری دنیا کی لڑکیاں میک اپ کرتی ہیں۔ اگر تم ذرا سی لپ اسٹک لگا لو گی تو کون سا طوفان آ جائے گا۔“ شمر بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

”میں نے یار کبھی نہیں لگائی اور پھر انکل آنٹی کے سامنے ایسے تیار ہو کر جاتے ہوئے مجھے شرم آرہی ہے۔“

”لو کر لو گل! اس سے زیادہ میک اپ کر کے روزانہ ان کی یہ جوان جہان بیٹی ان کے سامنے کالج جاتی ہے۔ ان کے لئے یہ کوئی انوکھی چیز نہیں اس لئے تم یہ فضول ایکسکیموز مت دو دیے ایک لحاظ سے کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو تم تینوں بہنوں کو میک اپ کی قطعاً ضرورت نہیں مجھے لگتا ہے کہ تمہاری ماما خاصی خوبصورت ہوں گی تم تینوں بہنوں کے نین نقش رنگت آنکھیں اور قد ہر چیز زبردست ہے۔“ شمر نے تو صلی لہجے میں کہا۔ پھر باقی کے ناں ناں کرنے کے باوجود پہلے اس کے لپ اسٹک اور پھر آنکھوں پر مسکارا بھی لگا دیا۔ ذرا سے میک اپ سے وہ دمک اٹھی تھی اب شمر سٹائی نظروں سے اسے گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی جبکہ یہ چیز اسے نزدں کر رہی تھی۔

ڈائننگ روم میں ہارون کو نہ پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ شمر کی ماما گھر کے نوکروں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ وہ خاصی گرلیں فل اور پُر اعتماد خاتون تھیں۔ گرے کمر کی ساڑھی میں وہ بڑی پُر وقار اور گرے ٹوپس میں اس کے قادر خاصے ٹاکس لگ رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان خاصی اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ شمر کے بابا مسلسل ان کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ جبکہ شمر بھی ان کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجائے آنٹی ان کے فحروں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ بھرپور جوابات سے بھی نواز رہی تھیں۔

بیا کو ان کے گھر کا ماحول بہت انوکھا اور دل فریب لگ رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی باپ اتنا فرینڈلی اور مہربان بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے تو ہمیشہ اپنے باپ کو دھاڑتے ہی سنا تھا جبکہ یہاں شمر مسلسل اپنے بابا کی گردن میں بانہیں ڈالے انہیں آتے جاتے پیار کر رہی تھی۔ بیا نے بے اختیار اس منظر کا حصہ بننے کی خواہش کو دل میں اٹھتے دیکھا۔ شیفون کا دوپٹہ دھیرے سے ماتھے پر کھینچ کر وہ جیسے ہی مزی لہجہ بھر کے لئے سہم ہی گئی۔ ہارون اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے قدرے تعجب ہو کر اسے دیکھا وہ اپنی جگہ قسم سی گئی۔ اس کی پیشانی چمک اٹھی۔

”پریتم تم کو چاند کہوں یا پورے چاند کی رات“ وہ گنگناٹا اور ٹیبل پر پڑی چکن بال والی ٹرے میں سے اس نے ایک بال نکالا اور کھانے لگا۔

”یہ گول گول گیندیں کس نے بنائی ہیں؟“ وہ بے شاشت سے مسکرایا۔

”ہارون بھائی! مبر کریں یہ گیندیں نہیں چکن بال ہے ایک نئی ڈش۔“ شمر نے تصحیح کی۔

”بہر حال جو بھی ہے، خواتین و حضرات آپ جلدی جلدی کیک کاٹیں، میرے پاس وقت کی شدید قلت ہے اور میں صرف ایک گھنٹے کے لئے آپ کو ٹائم دے سکتا ہوں۔ مزید وقت درکار ہو تو میری سیکرٹری سے بات کر لیں۔ شاید کوئی چندہ منٹ مزید کھل آئیں، اس سے زیادہ کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ آج میری ایک زبردست بزنس ڈیل ہے۔“ وہ اپنی اما کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیے شرارت بھرے لہجے میں بولا تو ماما نے مصنوعی غصے سے اس کے کان پکڑ لیے اور وہ دہائی دینے لگا۔ بابا اور ثمر نے اس کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ بیانے اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اسے ہنسی آ رہی تھی، لیکن وہ قابو پا گئی۔

کیک کٹتے ہی مختلف لوازمات کو چمکنے کے بعد اس نے جانے کی جلدی مچا دی۔ جوں ٹائم گزر رہا تھا۔ بیا کی رنگت پھمکی پڑتی جا رہی تھی، آخر کار شرکی ماما کو ہی اس کا خیال آیا اور انہوں نے فوراً ہارون کو گاڑی نکالنے کا حکم دیا۔ جاتے سے اسے ایک لفافہ اور سوٹ زبردستی تھما دیا۔ کالج یونیفارم پہن کر اور جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر اس نے ہونٹوں پر لگی لب اسٹیک کو بڑی بے دردی سے صاف کیا۔ اپنے پرانے حلیے میں آتے ہی اسے کچھ سکون محسوس ہوا، لیکن نکلنے نکلنے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ بار بار ثمر کے کانوں میں سرگوشی کر کے گاڑی کی اسپید بڑھانے کا کہہ رہی تھی جسے ہارون سنی ان سنی کر کے آرام سے اپنی سابقہ اسپید میں چلا رہا تھا۔ گاڑی میں بجنے والا میوزک اسے اس وقت زہر لگ رہا تھا۔

”ڈونٹ وری یار۔“ ثمر نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھپایا ہارون نے بیک مرر سے اسے دیکھا تو اسے کچھ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔

کالج کے مین گیٹ پر کھڑے دور ہی سے پیلے زرد رنگ کے چنگ جی رکشے میں بیٹھے ابا کو دیکھتے ہی اسے شاک لگا اس نے فوراً گھنٹوں میں منہ چھپا لیا وہ ایک دم سے ٹڈ حال سی ہو گئی تھی۔ اسے لگا کہ جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ اسے اس اذیت ناک سفر کا اختتام اب کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اب اسی تھے جو آج وقت سے پہلے ہی کالج گیٹ پر موجود تھے۔ بیا کے ہاتھ پیروں سے جان نکلنے لگی۔

ہارون نے ایک دم ہی گاڑی کو بریک لگایا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا بیا گھنٹوں میں منہ

دیئے خاصی بلند آواز میں رو رہی تھی، جبکہ ثمر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ یونہی بے بس سی بیٹھی اسے روتا دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے ثمر؟“ اس نے فکر مندی سے پوچھا جبکہ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”ثمر، میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا ہوا ہے؟ اور یہ تمہاری فرینڈ کیوں رو رہی ہے؟“ ہارون نے اس دفعہ قدرے غصے سے پوچھا۔ اسے حقیقتاً سمجھ نہیں آئی تھی، تبھی ثمر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”بھائی سامنے ہی سفید وین کے پاس رکشے میں بیا کے قادر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو وہ بیا کو قتل کر دیں گے۔ میں تو کالج سے چوری چوری اسے لے کر آئی تھی۔“ ثمر نے سر جھکا کر گویا شرمندگی سے اعتراف کیا۔

”اوٹ!“ اس نے غصے سے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا ”ایسی بھی کیا آفت آئی تھی جو یوں چوروں کی طرح آنا ضروری تھا۔“ وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ بیا کو دو چھکا سا لگا وہ سر جھکائے ہاتھ پیر چھوڑے اب پتھر کے بت کے مانند بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے گاڑی دوبارہ اشارت کی تو خاموشی کا تکلیف دہ لمبا وقفہ ٹوٹا، ثمر نے گھبرا کر اپنے سے پانچ سال بڑے بھائی کو دیکھا تو اس نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

”ثمر، تم تو کم از کم اپنے حواسوں میں رہو۔ اس وقت یہاں گاڑیوں کا اتارش ہے کہ کسی بندے کو کسی کی خبر نہیں، تم دونوں آرام اور سکون سے بیٹھی رہو، میں گاڑی ریورس کر رہا ہوں اور چکر کاٹ کے کالج کے دوسرے گیٹ کی طرف لے جا رہا ہوں تم دونوں وہاں سے اندر چلی جانا اور پھر اس گیٹ سے باہر آ جانا، انشاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ ہارون کے پُر اعتماد انداز پر ثمر کے چہرے پر کچھ پُر سکون تاثرات نمودار ہوئے جبکہ بیا ابھی تک اپنی کنپٹیوں پر ہاتھ رکھے سخت پریشان بیٹھی تھی۔ اب تو اسے رونا بھی نہیں آ رہا تھا۔

کالج کے دوسرے گیٹ پر پہنچ کر ثمر نے گم صم بیٹھی بیا کو زور سے ہلایا تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگی۔ ثمر نے اسے بازو سے پکڑ کر گاڑی سے نکالا تو مارے خوف کے وہ باقاعدہ ہلکا ہلکا کانپ رہی تھی۔ ہارون نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا، جس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ بے جان قدموں سے کیسے سائنس بلاک تک پہنچی، ثمر نے ابھی

تک اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور پھر کالج کے مین گیٹ کے پاس بنے ویننگ روم کے پاس گھبرائی گھبرائی فق چہروں کے ساتھ فوزی اور ضوبی کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

”تھینکس گاڈ بیا آپ آگئیں۔“ ضوبی نے کہتے ہوئے اس کے زرد چہرے کو دیکھا تو وہ آنسو پیٹے ہوئے رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ فوزی بھی اب مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ورنہ پچھلے ایک گھنٹے سے دونوں بہنیں سولی پر لٹکی ہوئی تھیں۔

”سوری بیا، میری وجہ سے تمہیں اتنی ٹینشن ہوئی۔“ ٹمرٹاسف بھرے لہجے میں بولی تو بیا قدرے بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”لیکن آج ابا اتنی جلدی کیسے آ گئے؟“ اسے ایک نئی فکر نے آن گھیرا۔ ابھی آخری کلاس ختم ہونے میں پورے دس منٹ پڑے تھے اور وہ پتا نہیں کب سے آ کر کھڑے تھے۔ اس نے فوزی اور ضوبی کو نہیں بتایا تھا۔ ورنہ ان کی تو جان نکل جاتی یہ سن کر کہ ابا سے اس کا گیٹ پر ٹا کر اہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

گھر پہنچنے اور ابا کی طرف سے کوئی تفتیش نہ ہونے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ورنہ اسے یہ سوچ کر ہی جھر جھری سی آ جاتی تھی کہ اگر اس کا ابا سے سامنا ہو جاتا۔ اس کے بعد کا احساس اتنا جان لیوا اور رگ و پے کو کاٹتا ہوا محسوس ہوا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک یہ سوچ نہیں پائی۔ اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔

ان کے دو کمروں کے گھر میں ایک کمرہ ان تینوں بہنوں اور ان کی ماں کے لئے تھا، جبکہ دوسرا کمرہ مرزا صاحب کا تھا اور بوقت ضرورت ڈرائنگ روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ ان کے سادہ سے کمرے میں دو پلنگوں کو جوڑ کر ایک بیڈ بنایا گیا تھا اور وہ تینوں بہنیں سونے کے لئے اسے ہی استعمال کرتی تھیں، جبکہ کمرے کے دائیں کونے میں پڑی چار پائی پر ان کی ماں کا بستر تھا۔ گھر میں گئی چنی چیزیں تھیں، جبکہ ڈی، ٹیپ، ریکارڈ یا ریڈیو کا تصور ہی محال تھا۔ ان تینوں کے لئے واحد عیاشی گھر میں آنے والا اخبار تھا، جس کی وہ تینوں ایک ایک سطر پڑھتی تھیں۔

”بیا، کیسا ٹائم گزرا ٹمر آپ کی گھر میں؟“ فوزیہ کو خاصی بے چینی تھی۔ تبھی اپنی ماں کو برآمدے میں نماز پڑھتے دیکھ کر وہ فوراً ان کے کمرے میں گھس آئی اور سرگوشی میں پوچھا۔ وہ

مسکرا دی اس کے کانوں میں کوئی دھیرے سے گونگنا یا۔

”پریم تم کو چاند کہوں یا پورے چاند کی رات۔“

دو گھری آنکھیں اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہوئی تھیں۔ اس کا دل ابا، مختلف لے پر دھڑکا اس نے چور نظروں سے فوزی کو دیکھا جو دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

”بیا، آپ ٹھیک ہیں ناں؟“ وہ اس کی صورت دیکھ کر شرارت سے مسکرائی۔

”ہوں!“ وہ چونکی ”لیس آف کورس۔“ اس نے اپنی حیران نظریں اٹھائیں اور گھبرا کر بولی۔ ”تمہیں کیا ہوا چھوٹی؟“

”کچھ نہیں! میں سوچ رہی ہوں کہ آپ آج کتنی پیاری اور دلکش لگ رہی ہیں۔“ فوزی کے انداز میں شرارت بڑھ رہی تھی جسے محسوس کر کے وہ دھیرے سے مسکرائی اور اس کی ناک کو چٹکی سے پکڑ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

”مجھے زیادہ باتیں کرنا نہیں آتیں، لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ میری اب تک کی زندگی کے سب سے خوبصورت لمحات تھے۔“

”بیا، ان کا گھر کیسا تھا؟“ ضوبی کہنی کے بل تھوڑا سا اٹھ کر بولی۔

”بہت خوبصورت، بالکل خوابوں جیسا۔“

”اور ٹمر آپ کی امی ابو کیسے تھے؟“ فوزی نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا تو وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔

”اگر کسی نے محبت کو محسوس صورت میں دیکھا ہو تو اس کے والدین سے مل لے۔“

”جی!!!“ فوزی نے بے یقین سے کہا۔

”بالکل جی جی۔“ باہر کسی برتن کے ٹوٹنے کی آواز پر وہ دونوں چونکیں، ضوبی ہلکی ہلکی نیند میں تھی۔ اس نے بھی جھٹکے سے آنکھیں کھولیں، باہر ابا شاید نہیں یقیناً امی پر برس رہے تھے۔

”تم جیسی بد ذات عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ جسے اپنے خاوند کا خیال نہیں۔ پتا نہیں کون کون سے چلے کاٹنے کے لئے جانماز پر کھڑی منہ اوپر اٹھا کر بڑبڑاتی رہتی ہے۔

کیڑے پڑیں گے، تمہاری قبر میں۔ خاوند کے حقوق کا پتا نہیں اور سارا سارا دن بیچ گھاٹھا کر جادو ٹوٹنے کرتی رہتی ہے۔“ ان کے لہجے میں گہرا تنفر تھا۔ وہ تینوں ایک دم ساکت ہو گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد غمناک سی ٹائیکم کو اندر آتے دیکھ کر ان تینوں نے خوفزدہ سوالیہ نظروں

سے انہیں دیکھا، جن کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور شگرتی ہونٹ مر جھائے ہوئے پھولوں کی پتیاں لگ رہے تھے۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہاری امی بہت خوبصورت خاتون ہوں گی۔“ شمر کی سرکشی بیا کے کانوں میں ٹکرائی اس نے بے اختیار سوچا کہ گزرتے سالوں نے ان کی ماں کے حسن کی لو کچھ مدھم کر دی تھی۔ چمکتی دمکتی سرخ و سپید رنگت، شگرتی ہونٹ، گھنی پلکیں اور خوبصورت آنکھیں اب سب چیزوں کی کشش ماند پڑتی جا رہی تھی۔

”امی کیا ہوا تھا؟“ فوزی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”کچھ نہیں“ میں دودھ میں چینی ڈالنا بھول گئی تھی۔“ انہوں نے آہستگی سے جواب دیا۔
”کوئی فائدہ نہیں جب ان کے اندر اتنی تلخی ہے تو ذرا سی چینی ان کا کیا بگاڑ لے گی۔“ فوزی نے ابرو چڑھائے تو بیانے غور سے ماں کو دیکھا، جو تھکی تھکی اور آزرده سی دکھائی دے رہی تھیں، اپنے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے وہ ایک ہل کو ٹھکیں اور بیا کو غور سے دیکھا۔

”بیا تم نے اپنی پلکوں پر کیا لگایا ہے؟“ بیا کا دل چند لمحوں کے لئے جیسے ٹھہر سا گیا۔ وہ گہرا کر اٹھی اور بے اختیار اپنی پلکوں کو اٹھکیوں سے جھوا، اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔
”سک کچھ نہیں امی، بس آج شمر مسکارا لائی تھی۔ وہ چپک کرنے کے لئے اس نے لگایا تھا، لیکن گھر آنے سے پہلے میں نے منہ دھو لیا تھا۔“ اس نے شرمندگی سے وضاحت دی۔ وہ اپنی جگہ پر کچھ قہم سی گئیں۔ بیانے کچھ پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد نارمل انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”اور تمہارے بیک میں جو ایک بن سلاشینوں کا سوٹ ہے وہ؟“ بیا کا دل زور زور

سے دھڑکنے لگا۔

”ارے امی وہ تو شمر باجی نے میرے سامنے ہی بیا کو عید کا گفٹ دیا تھا۔ بیانے تو کافی منع کیا، لیکن وہ کسی صورت مان ہی نہیں رہی تھیں۔“ فوزی نے فوراً بات بیانی تو بیانے تشکراۓ نظروں سے اسے دیکھا۔ ساتھ ہی اسے اپنی کتاب میں پڑے سفید لفافے کا خیال آیا اس کی سانسیں رک گئیں۔ وہ لفافہ ابھی تک اس نے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ بھی امی نے دیکھ لیا تو اس سے آگے اس کا دل دھڑکنا بھول سا گیا، لیکن خیریت رہی۔

”دیکھو بیا! آئندہ اس بچی کو طریقے سے منع کر دینا اور کوئی گفٹ گھر مت لانا“

تمہارے ابا کو پتا چل گیا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیں گے، کیونکہ تمہیں معلوم ہے ناں کہ وہ کسی بھی قسم کی دوستیوں کے سخت خلاف ہیں، حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ میری بچیاں بہت سمجھدار اور صبر والی ہیں، لیکن بیٹا ہماری زندگی میں پہلے ہی کہاں سکھ ہیں، جو مزید پریشانیاں اکٹھی کر لیں اور میں چاہتی ہوں کہ تم تینوں کم از کم گریجویشن بغیر کسی ہنگامے کے کر لو ورنہ تمہارے ابا تو تم تینوں کے کالج جانے کے ویسے ہی خلاف ہیں۔“ وہ بڑے متانت بھرے لہجے میں بولی تھیں۔
”امی! آپ کو ہم اعتبار نہیں ہے کیا؟“ بیا نے جھجکتے ہوئے پوچھا تو ایک پھکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی، وہ بے ساختہ ہی ان کے بستر پر بیٹھ گئیں اور سر جھکائے افسردہ لہجے میں بولیں۔

”مجھے اپنی تینوں بیٹیوں پر بھرپور اعتماد ہے، لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم تینوں کی بہترین دوست صرف تمہاری ماں ہو جس سے بلا جھجک تم ہر بات کر سکو، کیونکہ مائیں لڑکیوں کی سب سے اچھی ہمدرد اور مہربان دوست ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بیٹیوں کو کبھی غلط گائیڈ نہیں کرتیں..... میرا دل کرتا ہے کہ میں ساری دنیا کی ماؤں کو چیخ چیخ کر مشورہ دوں کہ اپنی بیٹیوں کو بھرپور اعتماد دو لیکن ان پر چیک اینڈ بیلنس رکھو، کیونکہ بیٹیاں بہت معصوم نازک اور قیمتی شے ہوتی ہیں، انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ بظاہر خوشنما دکھائی دینے والا رستہ گہری کھائی کی طرف جا رہا ہے۔“ وہ گہرے ڈکھ کے زیر اثر بول رہی تھیں۔

”لیکن امی اچھی اور سمجھدار بیٹیاں کبھی غلط قدم نہیں اٹھاتیں۔“ فوزی نے ان کے گلے میں بازو ڈال کر لاڈ بھرے لہجے میں کہا تو وہ ایسے مسکرائیں جیسی اس نے کوئی بچکانا سی بات کی ہو۔

”بیٹا بات سمجھداری یا عقل کی نہیں ہوتی، بس ایک لمحے کی ہوتی ہے۔ جب انسان کے سوچنے سمجھنے کی ساری حدیں ختم ہو جاتی ہیں، وہ لمحہ غالب آ جائے تو بندہ جذباتی ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھا لیتا ہے جو اس کے لئے تباہی اور بربادی کا ہوتا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ اس برے لمحے سے ساری بچیوں کو بچائے کیونکہ ہمارا معاشرہ لڑکیوں کی لغزش کو کبھی معاف نہیں کرتا۔“ اپنے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے ایک اداس سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بچی ہوئی تھی، ان تینوں نے ایک نظر اپنی ماں کو دیکھا اور چپ چاپ کبل اوڑھ کر زبردستی آنکھیں بند کر لیں۔

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ چاروں اپنی اپنی جگہوں پر شل اعصاب کے ساتھ جاگ

”اچھا شاباش یہ بتاؤ کہ تم کیا بہن کر جاؤ گی؟ ذرا ڈریسز کا انتخاب کر لیں اور میرا موڈ بن رہا ہے کہ ایک پارلر کا بھی چکر لگا لوں۔“ پنکی باجی نے اس کا دھیان بنایا تو وہ بھی ہنستے ہوئے بولی۔

”ارے چھوڑیں پنکی باجی! آپ کو پارلر کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ویسے ہی لشکارے مارتی ہیں۔“

”ڈارلنگ تمہاری بات درست لیکن تمہارے آٹھ میرا چراغ ذرا ماند پڑ جاتا ہے۔“ اپنے چہرے پر مہارت سے انگلیاں چلا کر مساج کرتی پنکی باجی نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ سوینی کو حقیقتاً سمجھ نہیں آئی۔

”مطلب یہ کہ ڈارلنگ تم ٹھہری اٹھارہ انیس سال کی الہر دوشیزہ یہ کشمیری سیب جیسے رخسار بادامی آنکھیں خوبصورت اشادری جیسے ہونٹ اور گھنی سیاہ پلکیں سب سے بڑی بات تمہاری آفت فکر زبردست قد اور خوبصورت بے داغ چمکدار رنگت اس دن سکندر صاحب مجھے چھوڑنے آئے تو تمہیں لان میں بیٹھا دیکھ کر بولے۔

”یہ سینڈریلا کہاں سے راستہ بھول آئی ہے؟“

”میں نے کہا اللہ نہ کرے اس کے حالات سینڈریلا جیسے ہوں۔ یہ تو اپنے والدین کی بہت لاڈلی اور بھائیوں کی عزیز از جان اکلوتی بہن ہے۔“ پنکی باجی نے ہنستے ہوئے کہا تو سکندر صاحب کی تعریف پر وہ بلیش کر گئی اور بظاہر انجان بن کر بولی۔

”انہوں نے مجھے کیسے دیکھ لیا حالانکہ میں نے تو بہت دور سے انہیں دیکھا تھا۔“

”ارے یار یہ مرد کم بخت کی نظر بہت تیز ہوتی ہے اور اپنے مطلب کی چیز تو اسے دو میل دور سے بھی نظر آ جاتی ہے۔“ وہ اب اپنا منی کیور کا سامان اکٹھا کر رہی تھیں۔

”دیکھیں پنکی باجی یہ سوٹ ٹیک ہے؟“ سوینی نے بلیک ویلوٹ کی شارٹ شرٹ اور ٹراؤزران کو دکھا کر رائے مانگی۔

”ہرگز نہیں!“ انہوں نے ایک نظر دیکھ کر ہی ریجیکٹ کر دیا۔

”پھر؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”بھئی نو پرابلم!“ وہ تیزی سے انہیں اور اپنی پچھلے ہفتے کی گئی شاپنگ والے شاہرز بے پردائی سے دیکھ دیکھ کر کارپٹ پر بیٹھنے لگیں ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی اسی رفتار چل رہی تھی۔

رہی تھیں اور رات گزرتی جا رہی تھی۔

* * *

”بہت زبردست میوزیکل ٹائٹ ہے۔ میں نے تم تینوں کے لئے بھی خصوصی وی آئی پی پاس لے لیے ہیں پورے لاہور کی کریم وہاں اکٹھی ہوگی۔ ہلہ گلہ ہوگا۔ بہت مزہ آئے گا۔“ پنکی اپنے موبائل سے کھیلتے ہوئے بہت پُر جوش انداز میں بتا رہی تھی۔

”لیکن یار میرا تو اس ویک اینڈ پر اڈاکاڑہ جانے کا پروگرام ہے۔ چھوٹی بہن کی امی نے دعوت کر رکھی ہے۔ پھر اس کا کیا اور وہ دونوں مسقط چلے جائیں گے اور ویسے بھی آنٹی ستارہ اتنی رات گئے کی اجازت نہیں دیں گی۔“ نازو نے ہاتھوں پر کولڈ کریم لگاتے ہوئے سادگی سے جواب دیا۔

”ارے دفع کرو ان بوڑھی آئیٹیوں کو ان کا علاج بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ سنڈے کے روز ہم ان کو بتا کر جائیں گے کہ ہمارا اسلام آباد جانے کا مشترکہ پروگرام ہے اور آرام سے میوزیکل ٹائٹ اینڈ کر کے میری کولیک نٹاشا کے گھر چلے جائیں گے اور اگلے روز شام کو لوٹ آئیں گے۔“ پنکی نے چٹکیوں میں پروگرام بنایا۔

”لیکن یار میری طرف سے پیشگی معذرت قبول کر لو میں اس گھریلو دعوت کو مس نہیں کر سکتی کیونکہ نئی نئی رشتے داری کا معاملہ ہے۔“ نازو نے فوراً صفائی دی۔

”اٹس اوکے ہم چھوٹی دنیاؤں کے ساتھ انجوائے کریں گے۔“ پنکی نے سوینی اور کرن کی طرف دیکھتے ہوئے شاہانہ انداز میں کہا۔ وہ دونوں بھی خاصی پُر جوش دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے فوراً تائید میں سر ہلایا اور پھر اگلے تین دن تک وہ بے تابی سے اس فنکشن کے لئے تیاریاں کرتی رہیں، لیکن فنکشن سے صرف دو دن پہلے کرن کے گھر سے اس کی دادی کی وفات کی اطلاع آئی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے شہر چکوال چلی گئی۔ جس کی وجہ سے سوینی کا جوش و خروش بھی خاصا دم ہو گیا تھا پھر ویک اینڈ پر نازو آپی بھی گھر چلی گئیں تو وہ خاصی افسردہ ہو گئی۔

”ارے جان من! میں ہوں ناں تمہیں ٹینس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھنا ہم دونوں کتنا انجوائے کرتے ہیں اور جب ان دونوں کو پتا چلے گا تو دیکھنا کتنا افسوس ہوگا انہیں۔“ پنکی باجی نے اسے تسلی دی تو وہ زبردستی مسکرا دی۔

گال تپ گئے اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

”پلیز یار ایک تو تم ویسے بھی قیامت لگ رہی ہو۔ اوپر سے تمہاری قاتل ادائیں مجھے لگتا ہے کہ آج کئی بندے فوت ہوں گے تمہارے اوپر.....“

”چنگی باجی پلیز!“ وہ ایک دفعہ بھر بلش ہو گئی۔

”اٹس اوکے ڈارلنگ..... کیا کروں میرا لڑکی ہو کر یہ حال ہے تو پھر.....؟“ انہوں نے شرارتی لہجے میں بات ادھوری چھوڑ کر بال ڈرائیو سے خشک کرنے شروع کر دیے تو سوئی نے بھی سکون کا سانس لیا۔ چنگی باجی کی تیاریاں خدا خدا کر کے تو ختم ہوئی تھیں۔ جانے سے پہلے انہوں نے سوئی کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس کے گلے میں چھوٹا سا پنک اسکارف دیکھ کر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے، بھویں تن گئیں اور سوئی نے بھی شاید ان کی ناگواری کو بھانپ لیا تھا۔ تبھی ڈرتے ڈرتے قدرے بے بسی سے کہا۔

”پلیز! چنگی باجی! مجھے شرم آتی ہے۔“ وہ ایک دم عکسی ایک لمحے کی سوچ بچار کے بعد کندھے اچکائے۔

”اٹس اوکے لیکن نیکسٹ ٹائم نہیں۔“ انہوں نے وارننگ دی تو اس نے بے اختیار سر ہلا دیا، کیونکہ اسے ڈر تھا کہ چنگی باجی کا موڈ بدل ہی نہ جائے اور ویسے بھی ان کے سامنے انکار کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کمرے کو لاک کر کے وہ باہر نکلیں تو سامنے ہی ستارہ آنٹی سے ٹاکرا ہو گیا۔ انہوں نے بطور خاص جس طرح طنزیہ انداز میں سوئی کا جائزہ لیا تھا۔ وہ شرم کے مارے گردن تک نہ اٹھا سکی۔

”مریم آپ بھی آج واپس نہیں آئیں گی۔“ نہ جانے کیوں اسے لگا تھا کہ انہوں نے سر اسر طرز کیا ہے۔ اس فقرے کی کاٹ نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔ وہ خفت کے مارے بس سر ہلا کر رہ گئی۔ آنٹی ستارہ نے چنگی سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا اور سیدھی سامنے بنے روم کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ یہ ایک وسیع بنگلا تھا جس کے درمیان میں دیوار کھڑی کر کے اسے دو پورشنوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ باہر سے دیکھنے میں وہ ایک ہی بلڈنگ نظر آتی تھی اور لان بھی مشترک تھا۔

”اللہ ہی خیر کرے کالی ملی نے راستہ کاٹ دیا ہے۔ جانے کیوں یہ منحوس عورت مجھے ہر موڑ پر ٹکراتی ہے۔“ چنگی باجی کا موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا۔ وہ گیٹ تک مسلسل بوڑھائی گئی

”یار یہ خان پور میں ہونے والی کوئی تقریب نہیں ہے۔ جس میں تم یہ وقیانوسی سا ڈریس پہن کر چلی جاؤ۔ وہاں ایک سے ایک ماڈل لڑکی ہوگی اور میں اپنے ساتھ کسی پینڈو کو نہیں لے جاسکتی۔ آخر کو میری بھی عزت کا معاملہ ہے۔“ وہ تیزی سے ایک ایک کپڑا ریجیکٹ کرتی جا رہی تھیں۔ سوئی نے حیرانی سے انہیں دیکھا، جواب پنک جری کی اسکن ٹائٹ شرٹ نکالے تو صلی نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھیں۔

”بس یہ ٹھیک ہے۔ تم اس پنک شرٹ کے ساتھ بلیو جینز پہن لو میری ابھی پچھلے ہفتے ایک جینز ذرا چھوٹے سائز کی آگئی تھی۔ واپس کرنے کا ٹائم نہیں ملا ادھر آؤ ذرا تمہارے ساتھ لگا کر دیکھوں۔“

”چنگی باجی یہ.....؟“ اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا جواب خاصی مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے حیرت زدہ لہجے پر وہ تیوری چڑھا کے مڑیں۔

”ہاں بھئی دیکھنا تمہارا فکر کتنا زبردست لگے گا۔ اس میں پوری قیامت لگو گی۔ یہ اپنے لیے سلکی بال بھی کھول دینا۔“ انہوں نے مزید مشورہ دیا تو وہ تھوڑا سا جھجک کر بولی۔

”لل..... لیکن چنگی باجی میں نے جینز کبھی نہیں پہنی۔“

”تو کیا ہوا؟ میں نے بھی لاہور آنے سے پہلے کبھی نہیں پہنی تھی۔“ انہوں نے آرام سے جواب دیا۔

”کم ان سوئی، پلیز! یہ اپنا پینڈو پن اس دفعہ خان پور میں ہی چھوڑ آنا، یار کیا ہو گیا ہے۔ دنیا اتنی فاسٹ جا رہی ہے اور تم ابھی تک دوپٹے کے چکروں میں الجھی ہوئی ہو اسٹو پڈ گرل۔“ انہوں نے اچھا خاصا اسے جھاڑ دیا تھا، تبھی وہ خاموشی سے مان گئی۔

اگلے دن چنگی باجی کا سلیکٹ کردہ ڈریس پہن کر جب وہ دیوار گیر آئینے کے سامنے آئی تو کئی لمحے تک اپنی پلکیں جھپک ہی نہ سکی۔ اس کا مناسب وجود جینز اور شرٹ میں خاصا اٹریکٹو لگ رہا تھا۔ اپنے سیاہ سلکی بالوں میں برش کر کے اس نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ میں اس کے چہرے کے خدوخال خاصے اٹریکٹو اور دلکش لگ رہے تھے۔

”زبردست۔“ چنگی باجی ابھی ابھی واش روم سے نہا کر نکلی تھی، سیلو لیس بلیک شرٹ اور ٹائٹ ٹراؤزر میں خود بھی وہ کسی آفت سے کم نہیں لگ رہی تھیں، لیکن اس وقت ان کی ستائشی نظریں سوئی کے وجود سے ہی نہیں ہٹ رہی تھیں جسے محسوس کر کے وہ خاصی جینپ گئی تھی۔

تھیں۔ باہر سڑک پر سکندر شاہ کی بلیک لینڈ کروزر دیکھ کر ان کے تاثرات میں خاصی تبدیلی آئی تھی۔

”ڈارلنگ! آج تو بہت غضب ڈھا رہی ہو۔“ سکندر شاہ کے مخمور لہجے نے پنگی کا موڈ خاصا فریٹ کر دیا تھا۔ تبھی وہ تہتہ لگا کر ہنسی تھی۔ سکندر شاہ کی نظر ابھی تک پنگی پیچھے کٹھنی سٹائی سوئی پر نہیں پڑی تھی اور جب پڑی تو نظر پلٹتا ہی بھول گئی۔

”واہ! یہ خوش رنگ! نازک حسین تلی کہاں سے پکڑ لائیں؟“

سوئی کا دل دھڑکنا بھول گیا، ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اسے ہلش ہوتے دیکھ کر سکندر شاہ نے بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھا۔ ان کی محویت ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ پنگی نے بطور خاص ان کی بے ہوشی کو نوٹ کیا تھا۔

”بھئی ایسی بھی کیا بے خودی کہ بندہ ساتھ بیٹھے لوگوں کو بھول جائے؟“ پنگی کے طنزیہ فقرے کے پیچھے ایک محسوس کیا جانے والا حسد جھلک رہا تھا جسے محسوس کر کے سکندر شاہ نے ایک خوشگوار تہتہ لگا لیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی سوئی ان کی ذومعنی گفتگو سے خاصی زروس ہو گئی تھی۔ اسے لگا کہ اس کا پنگی باجی کے ساتھ آنے کا فیصلہ کچھ ٹھیک نہیں ہے، لیکن اس کے بعد خیریت رہی سکندر شاہ اب شاید دانستہ پنگی باجی کی طرف متوجہ تھے، لیکن گا ہے بہ بگا ہے بیک مرمر سے اس پر ایک بھرپور نظر ڈالنا نہیں بھولتے تھے۔

اسٹینڈیم میں پہنچنے سے پہلے انہوں نے ڈیش بورڈ کھول کر ویلوٹ کی نازک سی ڈبہ نکالی پنگی کی طرف بڑھائی اور سرسری لہجے میں بولے۔

”یہ ڈائمنڈ رنگ میں نے دہائی سے بطور خاص تمہارے لیے لی تھی۔“

”جی!“ پنگی کے لہجے میں اشتیاق اور خوشی صاف جھلک رہی تھی اس نے بے مبری سے رنگ باکس کھول کر نازک سی رنگ نکالی اور مخروم لگی گلیوں میں پہن پہن کر چیک کرنے لگی۔

”دیکھو سوئی کیسی لگ رہی ہے؟“ انہوں نے اپنا سفید مرمریں سا ہاتھ اس کے آگے لہرایا تو سوئی نے کھلے دل سے اسے سراہا اور توصیفی لہجے میں کہا۔

”ہائس!“

”میرا خیال ہے کہ تمہارے ہاتھ میں آنے کے بعد اس کی قیمت میں خود بخود اضافہ ہو گیا ہے۔“ سکندر شاہ خالص عاشقانہ لہجے میں بولے تو پنگی کے چہرے پر خوشی اور سرشاری

کے رنگ پھیلتے گئے۔ اس کے بعد وہ دونوں اسے نظر انداز کیے اپنی باتوں میں مگن رہے۔

اسٹینڈیم میں روشنیوں کا ہجوم تھا۔ بے شمار ہنستے مسکراتے بے فکر چہرے گاڑیوں کی طویل قطاریں اور ہر طرف سرسری نظر آرہے تھے۔ سکندر شاہ دی آئی پی گیٹ کی طرف اپنی لینڈ کروزر بڑھائے لیے جا رہے تھے پھر دی آئی پی سیٹوں تک پہنچتے پہنچتے بے شمار لوگ پنگی اور سکندر شاہ سے ملنے کے لئے آئے تھے جس سے سوئی کو اندازہ ہوا کہ وہ دونوں ہی خاصے سوشل ہیں۔ اسٹیج پر آرکسٹرا کا شور تھا۔ سکندر شاہ مسلسل اپنے سیل فون پر مصروف تھے۔ پنگی اکتا کر ٹوپس میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ ہیلو ہائے میں مگن تھی جبکہ سوئی اپنی سیٹ پر گھبرائی گھبرائی اسٹیج کی طرف متوجہ تھی۔ دی آئی پی سیٹس کی طرف کچھ سکون تھا۔ ورنہ پنڈال میں ہونے والی ہلڑ بازی دور ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ پنگی کو اپنا کوئی اور جاننے والا مل گیا تھا۔ وہ اب خاصی خوش تھی اور جوش و خروش سے گفتگو میں مگن تھی۔

سوئی کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب بلیک گریڈ شلوار میں کندھوں پر قیمتی چادر رکھے سکندر شاہ اس کے ساتھ والی خالی سیٹ پر بیٹھے۔ ان کے ملبوس سے پھونکنے والی تیز خوشبو نے اسے متوجہ کیا تھا۔ انہیں اپنے اتنے پاس دیکھ کر وہ گھبرائی گئی جسے محسوس کر کے انہوں نے فوراً اس کے نازک ہاتھ پر تھمکی دی۔

”ڈونٹ ڈری سوئی! بی بولڈ یار۔“ اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیچھے کیا اسے کرنٹ سا لگا تھا۔ سکندر شاہ کی نگاہوں کی حدت اسے کنفیوڈ کر رہی تھی۔

”کیا نام ہے آپ کا؟ اور کس دیس سے راستہ بھول کر یہاں نکل آئی ہیں؟“ انہوں نے اسے خود سے بے تکلف کرنے کے لئے عام سے سوالات شروع کر دیے۔

”جی..... جی، مریم۔ اور میرا تعلق خان پور سے ہے۔“

”گڈ! پنگی بتا رہی تھی کہ آپ کا نام سوئی اس نے رکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ بالکل ٹھیک رکھا ہے، لیکن میں آپ کو موٹی کہوں گا“ آپ ہیں بھی تو بالکل موٹی گڑیا جیسی۔“

”جی.....!“ سوئی نے بوکھلا کر انہیں دیکھا جو اسٹیج پر جواد احمد کے گانے کی طرف متوجہ تھے۔ اسے کچھ تسلی ہوئی ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے اس نے ماتھے پر آنے والا نادیہ

پسینہ صاف کیا۔

”پنگی بتا رہی تھی کہ آپ لاء کی اسٹوڈنٹ ہیں۔ اگر آپ اسی طرح گھبرائی گھبرائی

گناہ کا نظر کو جواب آتا ہے“

سوئی کا دل ایک انوکھی لے پر دھڑکا۔ اس کے لئے ہر چیز نئی اور انوکھی تھی۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اسے اتنی بے باکی سے نہیں سراہا تھا۔ گاؤں میں ماں جی کہا تو کرتی تھیں کہ میری مریم جیسی سوہنی کڑی پورے پنڈ میں نہیں، لیکن وہ اسے ماں کی محبت سمجھتی تھی اور اب پہلی دفعہ کھلے عام اس کی خوبصورتی کو سراہا جا رہا تھا۔ یہ بات اسے مغرور کر رہی تھی اور اس کے اندر اعتماد خود بخود بڑھتا جا رہا تھا۔ حالانکہ خان پور میں ان کی حویلی کا ماحول خاصا کنزرویٹو تھا۔ اس نے پہلی دفعہ لاہور میں ایک نئی دنیا دیکھی تھی۔ ہر چیز اسے دلفریب لگ رہی تھی۔ اس رات سکندر شاہ نے ان دونوں کو دل کھول کر شاپنگ کروائی، ہنگی باجی کچھ خاموش تھیں، لیکن شاپنگ کے معاملے میں ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ صرف بیس سے آٹھ سوٹ اور اسٹائلو سے چھ جوتے لیے تھے اور پھر واپس ہاسٹل آ کر سوئی نے اپنی شاپنگ دیکھی جو کہ سکندر شاہ نے ناں ناں کرنے کے باوجود اسے زبردستی کروادی تھی اور اکیلے بیٹھ کر اس نے اپنی شاپنگ کا تخمینہ لگایا تو پچیس ہزار کا سوچ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے دل تو دھڑکنا ہی بھول گیا۔ اسے آج کی شام بہت اچھی لگی تھی۔

* * *

ناز و اور کرن ہاسٹل واپس آ چکی تھیں۔ پچھلے ایک ہفتے سے سوئی، ہنگی باجی کے ساتھ خاصی مصروف تھی۔ سکندر شاہ ہر تیسرے روز انہیں پی۔سی میں کبھی لنگ اور کبھی ڈنر پر انوائٹ کر رہے تھے، جس کی وجہ سے اس کی اسٹڈی خاصی ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ اس دن وہ ہاسٹل میں تھی جب منیر لالہ اس سے ملنے آئے، اسے ایک دم گھروالوں کا خیال آیا تو یہ سوچ کر اسے بری طرح شرمندگی ہوئی کہ پچھلے پندرہ روز سے اس نے گھر میں اپنی خیریت کا ایک بھی فون نہیں کیا تھا۔ اماں نے گھبرا کر منیر لالہ کو ہاسٹل بھیج دیا تھا۔

”تمہارے لالہ لان میں بیٹھے دھوپ سینک رہے ہیں۔ میں چائے بنا رہی ہوں۔ تم کپڑے تبدیل کر کے ان سے مل آؤ.....“ ناز و آہی! کی سنجیدہ سی آواز پر بے اختیار اس نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی اور بے اختیار شرمندہ ہو گئی..... دل میں لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وہ بے پردائی میں باہر نہیں نکل گئی، ورنہ منیر لالہ کے غضب سے کون اسے بچاتا۔ اس وقت وہ بلیک جنوز پریڈ شرٹ پہنے خامے ماڈل حلیے میں کبل میں کھسی ہوئی تھی، اتوار کا دن تھا۔ کرن اور ہنگی

اور شرمائی سی رہیں تو آپ اپنی فیلڈ میں ایک ناکام ایڈووکیٹ ثابت ہوں گی، اس فیلڈ میں تو بہت بولڈ اور کنفیڈنٹ لڑکیاں ہی چل سکتی ہیں۔ میرا مشورہ مانیں تو آپ لاء کو چھوڑیں اور سادہ سا کوئی ایم۔اے کر کے گھر میں ہانڈی چولہا سنبھالیں۔“

سوئی نے چونک کر انہیں دیکھا اسے سمجھ نہیں آئی کہ ان کے سادہ سے لہجے میں کوئی طنز ہے یا حقیقتاً وہ ایک مخلصانہ مشورہ دے رہے ہیں، لیکن اسے ان کی یہ تجویز بالکل پسند نہیں آئی تھی، تبھی وہ ناگواری سے بولی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں، میں اچھی خاصی کنفیڈنٹ ہوں اور لاء ڈیپارٹمنٹ میں اپنے ذاتی شوق اور دلچسپی کی وجہ سے آئی ہوں ورنہ میرے بابا تو مجھے ایم۔اے انگلش کروانا چاہ رہے تھے اور آپ دیکھیں گے کہ میں ایک بہت زبردست اور کامیاب وکیل ثابت ہوں گی۔“

”اوہ گڈ!“ وہ تو صوفی لہجے میں بولے، دلچسپی سے اس کے ناراض ناراض چہرے کو دیکھا اور ذومعنی لہجے میں کہا۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ بہت کامیاب رہیں گی۔ ذہانت اور خوبصورتی کا احتراز بہت کم لوگوں کو اپنے آگے نکلنے دیتا ہے اور آپ کا مخالف وکیل ایک دفعہ آپ کے چہرے پر نظر ڈالے گا تو سارے دلائل بھول جائے گا، فیصلہ خود بخود آپ کے حق میں ہو جائے گا۔“ سکندر شاہ کے شرارتی لہجے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو وہ بری طرح ٹھنک کے محویت سے اسے دیکھنے لگے۔

”آپ کو شاید ایک بات کا علم نہیں؟“

”جی؟“ اس نے نا سنجی کے عالم میں دیکھا۔

”آپ کی طرف دیکھ کر تو قافلے راہ بھول جاتے ہیں۔“ سکندر شاہ جذبات سے لبریز گہرے لہجے میں گویا ہوئے۔

”جی.....!“ وہ حقیقتاً نہیں سمجھتی تھی۔ خیرانی سے بھرپور آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی تو وہ اپنے حواس کھونے لگے۔ جس وقت ہنگی وہاں پہنچی، سکندر شاہ بے خود آنکھوں سے سوئی کی طرف متوجہ تھے۔ ہنگی نے گلا کھنکھار کر انہیں متوجہ کرنا چاہا، مگر آ کر کسٹرا کے تیز شور میں اس کی کھنکھار دب گئی وہ بڑے غمور لہجے میں بولے تھے۔

”ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے“

”اچھا لگ تو ایسے رہا تھا جیسے ڈائریکٹ امریکہ سے آئی ہو۔“ منیر بھائی کے لہجے میں چھپی ناگواری بھانپ کر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”کیوں لالہ کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ سامنے کوٹار کی سیاہ سڑک پر نظریں جمائے سنجیدگی سے گاڑی چلاتے ہوئے بولے۔ ”اس قسم کی باجیوں شاہجیوں سے دور ہی رہا کرو ہم لوگ اس ٹائپ کی لڑکیوں کی دوستی افورڈ نہیں کر سکتے۔“ منیر لالہ کے لہجے میں تسخر تھا جسے محسوس کر کے اس نے فوراً وضاحت دی۔

”لالہ پنگی باجی اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہیں بس ذرا ماڈ اسکوڈ ہیں ورنہ بہت کیئرنگ اور لوگ ہیں اور میرا تو بہت خیال رکھتی ہیں۔“

”کیوں اس کا تعلق کسی بہت براڈ اور لینڈ لارڈ فیملی سے ہے؟“ ان کا انداز ہنوز تھا۔
”نن..... نہیں وہ تو لودھراں کے کسی چک میں رہتی ہیں۔“ سوینی نے بے پروائی سے کہا۔

”اس کے فادر کیا کرتے ہیں؟“

”میئر ریڈر ہیں! اپڈا میں۔“ اسے نہ جانے کیوں لالہ کی تعقیب سے اب کوفت ہونے لگی تھی، تبھی اکتا کر جواب دیا تو انہوں نے غور سے اسے دیکھا۔

”کسی مڈل کلاس شریف فیملی کی لڑکی کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے، بہر حال! تم محتاط رہنا۔“ منیر لالہ کے بے نیاز لہجے پر اسے غصہ تو بہت آیا، لیکن دل پر جبر کر کے وہ خاموش رہ گئی۔ بہر طور منیر لالہ سے اس کی کوئی بے تکلفی نہیں تھی، جو بحث کرتی، وہ چار بھائیوں اور والدین کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی۔ ضد کر کے اس نے لاہور میں داخلہ لیا تھا۔ ورنہ منیر لالہ اور شبیر لالہ تو اس کے شہر سے باہر جانے پر سخت خلاف تھے، لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح وہ زمینداری سے ٹائم نکال کر ہر ماہ اس کے پاس لاہور ایک آدھ چکر لگا ہی لیتے تھے۔ وہ سیل فون لینا چاہ رہی تھی، لیکن دونوں بڑے بھائیوں کا کہنا تھا کہ جب ہاسٹل میں فون موجود ہے تو پھر سیل فون کا فائدہ؟ حالانکہ سکندر شاہ نے کتنا اصرار کیا تھا کہ وہ اسے خود سیل فون لے دیتے ہیں، لیکن بھائیوں کے خوف نے اسے اس اقدام سے دور ہی رکھا۔

وہ لوگ جب خان پور پہنچے تو عشاء کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ اماں نماز کے بعد تسبیح پڑھنے

باجی ابھی تک سو رہی تھیں۔ منیر لالہ سے معلوم ہوا کہ اماں کچھ بیمار ہیں تو وہ فوراً ان کے ساتھ خان پور چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ بلیو شلوار قمیض پر بلیک بڑی سی چادر لے کر وہ واش روم سے باہر نکلی تو اس کا حلیہ دیکھ کر پنگی باجی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کیا ہوا پنگی باجی! کیا بہت بری لگ رہی ہوں؟“ دیوار میں لگے شیشے میں اپنا آپ دیکھتے ہوئے وہ خاصے شرمندہ لہجے میں بولی تو نازو آپی نے فوراً تنبیہی لہجے میں کہا۔
”اچھی خاصی ڈینٹ اور سویر لگ رہی ہو، تم پنگی کی باتوں میں مت آیا کرو۔“

”ارے نازو جان من! تمہارے اندر تو صدیوں پرانی روح گھسی ہوئی ہے۔ بچوں کو عیش کرنے دو اور ویسے بھی زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے۔“ پنگی نے سستی سے جمائی لیتے ہوئے نازو کا مذاق اڑایا، جبکہ نازو آپی انہیں نظر انداز کیے سوئی کے بیگ میں اس کے کپڑوں کی ترتیب درست کر رہی تھیں۔

نازو آپی نے اسے سستی سے نفرت زدہ چہرہ کے ساتھ آئینے کے سامنے قدم جمائے دیکھ کر فوراً ڈانٹ پلائی ”مریم جلدی کرو تمہارے بھائی باہر لان میں اکیلے بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”نازو آپی جلدی تو کر رہی ہوں۔“ اس نے ہاتھوں پر لوشن ملتے ہوئے کہا۔
”ارے ہم بھی دیکھ کر آئیں سوینی کے بھائی کیسے ہیں؟ خود تو یہ بہت کیوٹ ہے، یقیناً بھائی بھی پیئڈسم ہوں گے۔“ پنگی اٹھتے ہوئے بولی تو نازو نے فوراً طنز کیا۔

”کوئی فائدہ نہیں، مریم کے بھائی نہ صرف شادی شدہ بلکہ اچھے خاصے شریف انسان واقع ہوئے ہیں۔“

”اوئے دھت تیری کی۔“ وہ دھپ کر کے میٹرس پر دوبارہ گر گئی اور اس کے مایوس انداز پر سوینی اور نازو کے ساتھ ساتھ کرن کو بھی ہنسی آ گئی۔

گاڑی میں بیٹھے ہی منیر بھائی نے مکمل سنجیدگی سے پوچھا۔ ”یہ جواوٹ پٹانگ سے حلے میں دوپٹے، شال سے بے نیاز تمہیں گیٹ پر چھوڑنے آئی تھی؟ یہ کون تھی؟“

”وہ.....“ سوینی نے مسکراتے ہوئے کہا ”پنگی باجی تھیں۔ ان کا تعلق لودھراں سے تھا۔“

”لے“ کملی نہ ہو تو“ سارا سارا دن زینب کے ساتھ بہانے بہانے سے تیرا ہی ذکر کرتی ہوں اور وہ بھی کہتی ہے کہ اماں اپنی دمی کو یاد کرنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔“ اماں نے منیر لالہ کی بیوی کا ذکر کر کے اپنے دل کا حال سنایا اور ابھی وہ ڈھنگ سے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی جب ایک اور اطلاع پر اس کے ذہن میں دھماکا ہوا۔ اماں بڑی سادگی سے بتا رہی تھیں۔

”تمہارا چاچا اکثر پوچھتا ہے کہ مریم کی پڑھائی کب ختم ہوگئی اس کے بعد ایک جج اس کی حویلی میں اور دوسری ہماری حویلی میں آئے گی۔“

”کیا مطلب اماں؟“ اس نے قدرے خائف ہو کر تجسس انداز میں پوچھا۔

”لے تیری اور شفیق کی جج اور کس کی.....؟“ اماں نے کہا تو اس کی دل کی دھڑکن رک سی گئی۔

”کس کی اماں؟“ اسے لگا کہ شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے جبکہ اماں ناگواری سے بولیں۔

”بھئی تیری اور تیرے چاچے کے پتر شفیق کی اور شفیق کی بہن کلثوم کی تیرے بھائی سجاد کے ساتھ۔“

اس کے ذہن میں چھٹ لے چوڑے ایف اے پاس پینڈو شفیق کی شکل نمودار ہوئی۔ ساتھ ہی پورے وجود میں غمی کی لہر دوڑ گئی شفیق اس حوالے سے اسے سخت ناپسند تھا جسے بات کرنے کی اور نہ پہننے اوڑھنے کی تمیز تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ مناسب موقع پر انکار کر دے گی اور یہ سوچ کر مطمئن ہوگئی پھر ایک ہفتہ حویلی میں گزارنا اسے انتہائی دشوار اور تکٹھن لگا تھا۔ دن ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ ٹی وی پر بھی ایک دو مخصوص چینل آتے تھے۔ حویلی سے باہر خواتین کا بغیر کسی مقصد کے جانا یہاں معیوب سمجھا جاتا تھا حالانکہ یہی حویلی تھی جہاں اس کا خوب دل لگتا تھا۔ مگر اب یہی حویلی اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ سارا سارا دن وہ یہاں بوکھلائی پھرتی۔ حویلی سے اس نے چکی باجی کے سیل فون پر کال کی تو اسے معلوم ہوا کہ سٹیڈیم میں صنعتی نمائش لگی ہوئی ہے اور اس کے ڈیپارٹمنٹ کی گیٹ نو گیدر بھی تھی اس کا دل چاہا کہ وہ اڑ کر لاہور پہنچ جائے۔

جس دن اس نے ہاسٹل قدم رکھا اس دن اسے سکون آیا۔ اڑھائی میٹر کی کالی سیاہ چادر اس نے یہاں پہنچتے ہی اتار بھیجی تھی اور بار بار شکر ادا کر رہی تھی جبکہ چکی باجی اسے دیکھ دیکھ کر

میں مصروف تھیں انہیں آتا دیکھ کر جانماز پلٹ کر بے تابی سے انھیں اور آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوی۔

”میں صدقے“ میں داری“ میری سوہنی دمی آئی اے۔“ اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے وہ اسے رنگین پائیوں والی چارپائی پر آگئیں۔

”اماں دمی کو دیکھتے ہی پتر بھول گیا کیا؟“ منیر لالہ نے اماں کو چھیڑا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ چمکنے لگی۔

”ناں پتر“ میں اپنے شیر پتر کو کیسے بھول سکتی ہوں اللہ تعالیٰ بد سے بچائے لیکن تجھے معلوم ہے ناناں! کہ مریم تو میری جند جان اے دمی تو ویسے بھی ماں کی سہیلی ہوتی ہے میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں کہ اس کا شہر سے دل اچاٹ ہو اور یہ واپس مڑ آئے خواخواہ تیرے بابا نے اس کی ضد مان لی۔“

”ہاہا..... ہاہا.....“ منیر لالہ کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔

”ارے منیر اے ایسے منہ کھل کے نہیں ہنسنے نظر لگ جائی اے۔“ اماں نے ٹوکا، لیکن وہ بے اختیار ہنسنے رہے۔

”اے مریم یہ تیرے بالوں کو کیا ہوا؟ اچھے خاصے کالے شالبالوں میں یہ سنہرا رنگ کہاں سے آگیا؟“ اماں نے اسے غور سے دیکھتے ہی تعجب سے پوچھا تو مریم نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ شکر ادا کیا کہ منیر لالہ اندر چلے گئے تھے ورنہ اس کی بالوں میں کی گئی اسٹریکیٹنگ ان کی تیز نظروں سے کیسے چھپ سکتی تھی۔ اس نے فوراً چادر کا کونہ آگے تک کیا ابھی تو اماں کی نظر اس کے اسٹیپ کٹنگ بالوں پر نہیں پڑی تھی جو اس نے چکی باجی کے بے تحاشا اصرار پر کٹوائے تھے۔

”کچھ نہیں اماں! بس سورج کی دھوپ پڑتی ہے ناناں اس سے سنہری ہو گئے۔“ اس نے بے پردا لہجے میں کہہ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”یہ بھر جانی نظر نہیں آ رہی؟“

”اپنے ماں پیو کے پنڈ گئی ہے ملنے۔“ اماں نے پیار سے اس کے گال کو چھوا تو وہ ان کا ہاتھ تمام کر بولی۔

”اماں مجھے یاد کرتی تھی؟“

روپے تھے۔ یقین کرو میرا تو اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا کہ میں اسے کہاں خرچ کروں گی۔ ہمیں تو جیب خرچ کے نام پر ای چند روپے خود ہی پکڑا دیتی ہیں، ورنہ ہم تینوں بہنوں نے کبھی نہیں مانگتے۔ اب اتنی ساری رقم کو چھپانے کے لئے ہمیں کوئی جگہ ہی نہیں مل رہی۔“ بیانے اپنی پریشانی بتائی تو شکر کلکلا کر ہنس پڑی۔

”تم تینوں کی تینوں بہنیں بدھو ورنہ آج کل کے دور میں دو ہزار کی کیا اوقات ہے اتنے پیسے تو بھائی ہر ہفتے جیب خرچ کے نام پر مجھے دے دیتا ہے اور وہ چکیوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی دن کالج لے آنا یہاں سے شاپنگ کے لئے چلیں گے۔“ ثمر کے مفت مشورے پر بیانے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور تپ کر جواب دیا۔

”اپنے فضول اور بے ہودہ مشورے اپنے پاس رکھو مجھے تو ابھی تک امی کو بغیر بتائے تمہارے گھر جانے پر شرمندگی ہے اور تم مجھے مزید درغلا رہی ہو۔“

”کیا، کیا میں درغلا رہی ہوں؟“ ثمر نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔

”آف کورس..... اس میں کیا شک ہے اور تمہیں پتا ہے کہ ہم تینوں بہنوں نے کبھی امی سے جھوٹ نہیں بولا۔ وہ بہت ممبر والی اور نیک خاتون ہیں۔ میرے ابا نے انہیں کبھی کوئی خوشی نہیں دی، لیکن انہوں نے کبھی اس چیز کا گلہ نہیں کیا۔“ بیا کے لہجے میں لفظوں میں اپنی ماں کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

”یار میرا بہت دل کرتا ہے ان سے ملنے کو اور تم اتنی بے مروت ہو کہ کبھی اپنے گھر آنے کی جھوٹے منہ بھی دعوت نہیں دی، حالانکہ پچھلے ہفتے ہم تمہارے گھر کے بہت قریب سے گزرے تھے۔ مجھے ہارون بھیانے پھیڑا بھی کہ آؤ تمہاری دوست کے گھر چلتے ہیں۔“

”کیا.....؟“ بیا کا سانس حلق میں اٹک گیا۔

”مرومت۔“ ثمر نے غصے سے ایک جھانپڑا سے رسید کیا۔ وہ بلبلا اٹھی تو اس نے گھبرا کر وضاحت دی۔ ”میں نے بھائی کو صاف انکار کر دیا کہ میرا ابھی بیا کے ابا سے اپنی ٹانگیں تروانے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”بہت اچھا کیا اور آئندہ ایسا سوچنا بھی نہیں اور اگر سوچو تو اپنی ٹانگوں کا بیمہ کروا لیتا۔“ بیانے شرارتی لہجے میں اسے ڈرایا تو وہ ڈر بھی گئی۔

”بابا اور ماما تمہارا بہت پوچھتے ہیں۔ ماما کہہ رہی تھیں کہ بیا بہت پیاری لڑکی ہے جبکہ

ہنس رہی تھیں۔

”ارے مائی ڈیئر! اب خان پور کی جنگ اور گھٹن زدہ فضاؤں میں تمہارا دل کہاں لگے گا۔ میری مانو کوئی اونچا ہاتھ مار کے ٹھڈی آسامی پھنسا لو اور آرام سے شادی کر کے لاہور یا اسلام آباد میں رہو ورنہ تمہاری حویلی کی اونچی دیواریں تمہارے لیے قبر ثابت ہوں گی اور تم انارکلی کی طرح کسی دیوار میں چنوا دی جاؤ گی۔ ڈارلنگ زندگی بار بار نہیں ملتی، اس لئے اسے اپنی مرضی سے گزارو۔“ پٹکی باجی نے اسے بلند آواز میں مشورہ دیا چونکہ وہاں ناز و نہیں تھی۔ اس لئے خیریت رہی، البتہ کرن ان کی باتوں پر خاموشی سے مسکراتی رہی۔

”سوئی آج سکندر شاہ کو فون کر لو ورنہ وہ تمہارے فراق میں پاگل ہو جائے گا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ مجھوں بنا پھر رہا ہے مجھے فون کر کر کے اس نے زچ کر دیا تھا اور تمہارے لیے یہ سیل فون بھی بھجوا رہا ہے اور کہا ہے کہ بے شک گھر والوں کو مت بتانا اور میری خاطر رکھ لو ورنہ میں مر جاؤں گا۔“ پٹکی باجی اس کی طرف تھوڑا سا جھک کر قدرے راز دارانہ انداز میں بولیں۔

”کیا.....؟“ حیرت اور تعجب سے سوئی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

* * *

موسم خاصا بدل گیا تھا۔ فضا میں سردی اور خشکی کا عنصر خاصا کم ہو گیا تھا۔ اس دن صبح خاصی اُجلی اُجلی اور نکھری نکھری تھی، لیکن سارا دن ایک عجیب سی اداسی اور پریشانی نے شائیکم کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اگلے دن صبح سٹور پر جاتے ہوئے مرزا صاحب خلافِ عادت خاموش خاموش سے تھے نہ ہی بچیوں کو گھر سے نکلتے ہوئے ڈانٹا تھا۔

وہ تینوں کالج پینچنیں تو سامنے ہی ٹر بیا کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ اس کی شروع سے ہی روٹیں تھی، جس دن جلدی آ جاتی کالج گیٹ کے سامنے ٹھہل ٹھہل کر بے تابی سے اس کا انتظار کرنا شروع کر دیتی پھر اسے سامنے دیکھتے ہی جو بولنا شروع ہوتی، کلاس روم میں پہنچ کر ہی کسی لیکچرار کی آمد پر اس کی بولتی بند ہوتی۔ اس دن وہ دونوں کلاسز لے کر بریک میں اپنے پسندیدہ درخت کے خالی بیچ پر بیٹھی تھیں، ہاتھ میں پکڑی سموں کی پلیٹ سے وہ دونوں بھرپور انصاف کر رہی تھیں۔

”یار آنٹی نے اس دن مجھے جو لفظ دیا تھا۔ میں نے گھر جا کر دیکھا تو اس میں دو ہزار

بابا کہہ رہے تھے کہ وہ بہت سنجھی ہوئی اور سمجھدار بچی ہے اور ہارون بھیا بولے وہ بہت منفرد شریف اور کیوٹ ہے۔“ ثمر کے آخری فقرے پر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کوئی بہت آہستگی سے اس کے کانوں میں گنگنایا۔

پریم تم کو چاند کہوں یا پورے چاند کی رات
”ویسے بھیا تم سے بہت امپریس ہیں۔“ ثمر کے شرارتی انداز پر اس نے زور سے اسے چٹکی کاٹی۔

”جیسی تم فضول ہو ویسے تمہارے بھیا فضول ہیں۔“

”خبردار لڑکی! میرے بھائی کو کچھ مت کہنا ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“ بیانے لڑکا انداز میں کہا۔

”ورنہ کچھ بھی نہیں۔“ وہ ڈھیلی پڑ گئی تو بیا کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی کچھ دیر چپ رہ

کے وہ آہستگی سے بولی۔

”ثمر! ہم تینوں بہنوں نے بہت محدود دنیا دیکھی ہے۔ امی! ابا کی پسند کی شادی کی وجہ سے دونوں خاندان نے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس لئے ہم نے والدین کے علاوہ کئی اور رشتہ نہیں دیکھا۔ پہلے سکول سے گھر اور اب کالج سے گھر تک ہماری دنیا محدود ہے اور ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہم نے کبھی باپ کی شفقت کو بھی محسوس نہیں کیا۔ ابا نے ساری زندگی ہم بہنوں کو اور امی کو بد دعائیں اور کوسنے کے علاوہ کچھ نہیں دیا، لیکن یہ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری بنیادی ضروریات بے شک گالیاں دے کر ہی سہی لیکن پوری کر دیتے ہیں۔ ایسے میں تمہارے گھر کی محبت، چاہت اور احترام سے لبریز ماحول میرے لیے بہت اٹوکھا، متاثر کن اور دل فریب تھا، اللہ تم لوگوں کی محبت کو بہت زیادہ پروان چڑھائے اور نظر بد سے بچائے آمین!“ بیانے خلوص دل سے اسے دعا دی تو ثمر مسکرا دی۔

* * *

اس دن گھر واپسی پر وہ رکشے میں ابا کو نہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں ان کی زندگی میں پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ ابا ان کو لینے نہیں آئے تھے۔ رکشے والا چاچا خاصا پرانا تھا۔ ان کی سوالیہ نظروں سے گھبرا کر خود ہی کہنے لگا۔

”مرزا صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ آج خود ہی بچپوں

کو گھر چھوڑ آؤ۔“ ان تینوں نے خاموشی سے سر تو ہلا دیا تھا، لیکن دل میں طرح طرح کے اندیشے جاگ اٹھے تھے۔ ابا گری سر دی، بخار، کھانسی ہر طرح کے حالات میں خود چھوڑ کر آتے اور خود لینے آتے اس سلسلے میں انہیں اپنے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں تھا اور اب تو ان کو بھی عادت ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ تو شدید بخار میں بھی ان کو چھوڑنے آئے تھے۔

گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر تینوں کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ سامنے سیاہ برقع میں پریشان پریشان سی حواس باختہ ٹائیٹیم کو دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا۔

”تمہارے ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میڈیکل سنٹر سے جمال بتانے آیا تھا۔ ان کو میو ہسپتال لے گئے ہیں۔ صوبی تم میرے ساتھ چلو اور بیا اور فوزی بیٹا دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھنا میں نے ساتھ والوں کی بوا کو کہہ دیا ہے، وہ تمہارا خیال رکھیں گی۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ صوبی کا بازو پکڑ کر رکشے میں بیٹھ گئیں۔ صوبی کی توانگوں سے جان نکل گئی تھی۔ وہ سب بہنوں میں سب سے زیادہ کم ہمت بزدل اور کمزور دل کی تھی۔ اس وقت بھی آنسو ایک لڑی کی صورت میں اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

رات کو ایک بجے امی، عذرا، عذرا، عذرا سی واپس آئیں تو معلوم ہوا کہ ابا کی دونوں ٹانگیں بری طرح چٹکی گئی ہیں اور خون بھی خاصا بہہ گیا تھا۔ میڈیکل سنٹر میں کام کرنے والے خصوصی ملازم جمال نے امی کے ساتھ خاصی بھاگ دوڑ کی تھی اور اب ابا کو پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا اور اس وقت بھی جمال ابا کے پاس تھا اور امی، بیا اور فوزی کے اکیلے ہونے کی وجہ سے گھر لوٹ آئی تھیں۔ صوبی خاصی سہمی سہمی اور خوفزدہ تھی۔ اس کی آنکھیں شدت گرہ سے خاصی سوج چکی تھیں اس نے پہلی دفعہ کسی ہسپتال کی شکل دیکھی تھی اس لئے اس کی طبیعت خاصی بوجھل تھی۔

یہ رات ان تینوں بہنوں اور ٹائیٹیم کے لئے خاصی اذیت ناک تھی۔ فوزی جو کبھی کبھی غصے میں کہا کرتی تھی کہ جس دن ابا کچھ دنوں کے لئے کہیں جائیں گے تو وہ جشن منائے گی، اس وقت سب سے زیادہ رنجیدہ تھی۔ اسے پہلی دفعہ اپنے ہی گھر سے ڈر لگ رہا تھا۔ ابا کی موجودگی میں وہ رات کم از کم بے فکری کی نیند تو سوتی تھیں اور یہ رات تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

چاند کی تیز روشنی اور ستاروں کا گھٹتا ہوا باہمی فاصلہ ظاہر کر رہا تھا کہ رات کا اختتام

”ضوبی!“ ثانیئم نے تنبیہی انداز میں اسے پکارا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔
 ”ذرا دیکھیں! یہ دونوں بھی تو آپ کی بہنیں ہیں کتنے حوصلے اور ہمت سے کھڑی ہیں۔“
 ڈاکٹر نے دوبارہ ضوبی کو ہمت دلائی تو وہ چڑ گئی اور انتہائی بچکانا انداز میں بولی۔

”آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ آپ کے فادر اس طرح بیمار ہوں تو آپ کو پتا چلے کہ کتنی تکلیف ہوتی ہے اور پھر آپ کا کوئی بھائی بھی نہ ہو تو۔“ اسے پھر رونا آ گیا تھا۔
 ”اوہ۔“ ڈاکٹر ریان نے کمرے میں موجود چاروں خواتین کو غور سے دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ موجود واحد مرد اپنے حلیے اور انداز سے کوئی ملازم لگ رہا تھا۔ وہ چاروں مکمل پردے میں ہونے کے باوجود ڈری ڈری سی تھیں، تبھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی والدہ سے مخاطب ہوا۔

”آئی! آپ پلیز پریشان مت ہوں۔ میرا نام ڈاکٹر ریان ہے اور میں ایمر جنسی وارڈ میں ہوتا ہوں۔ کوئی بھی مسئلہ ہو آپ ریسپشن پر مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں! یہ میرا کارڈ ہے اور اس پر سیل فون بھی لکھا ہوا ہے۔ انشاء اللہ میرے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ اس کے پُر خلوص انداز پر ثانیئم کے چہرے پر اطمینان کے رنگ پھیل گئے۔ وہ چلتے چلتے رکا اور ضوبی کے پاس جا کر آہستگی سے بولا۔

”زندگی میں بے شمار حادثے ہو جاتے ہیں اور ان کا حوصلے اور ہمت سے مقابلہ کرنا ہی زندگی ہے! بے فکر رہیے کہ اگر آپ کا کوئی بھائی بھی ہوتا تو اس وقت وہ بھی یہی کام کر رہا ہوتا جو آپ کر رہی ہیں کیونکہ کم ہمت کے بھائی بھی کم ہمت ہوتے ہیں۔“ اس کے شرارتی اور خوشگوار لہجے پر نہ چاہتے ہوئے بھی ثانیئم بیا اور فوزی کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ کمرے سے نکل گیا، جبکہ ضوبی کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اگلے دن ابانے ہوش میں آنے کے بعد ان چاروں کو اپنے دائیں بائیں دیکھا اور زندگی میں پہلی دفعہ خاموش رہے۔ ان کے چہرے پر زردیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اپنی کمزور اور نقاب زده آواز میں انہوں نے جمال کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ صرف ہسپتال میں رہے اور ثانیئم کی طرف دیکھ کر آہستگی سے کہا۔

”بچیوں کو گمر لے جاؤ، ہسپتال کا ماحول ان کے لئے مناسب نہیں ہے۔“ وہ چاروں بری طرح چوکی تھیں! آج زندگی میں پہلی دفعہ انہوں نے اتنے آرام اور سکون سے ثانیئم کو

ہونے کو ہے نیند کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ تینوں اپنی ماں کے بستر میں گھسی ہوئی تھیں جبکہ امی جانماز پر بیٹھی نہ جانے کون کون سے نوافل پڑھنے میں مگن تھیں۔ سلام پھیر کر انہوں نے تینوں کو غور سے دیکھا اور آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”بیٹا سورۃ یسین یا قرآن پاک پڑھ کر خدا سے اپنے باپ کی صحت یابی کے لئے دعا کرو۔ وہ زبان کا تیز سہی! لیکن تمہارے لیے ایک گھنا سا بنان ہے۔ جس کے سائے نے تم تینوں کو زمانے کے گرم سرد سے محفوظ کر رکھا ہے! اور نہ بیٹا! باہر لوگ بہت برے ہیں! بھیڑیے کی طرح گھات لگائے بیٹھے ہیں اور کم از کم تمہارے باپ کی موجودگی میں میں نے خود کو بے سہارا محسوس نہیں کیا۔ اپنے لیے نہ سہی میرے لیے دعا کرو کہ اللہ اسے صحت اور زندگی دے۔“ ان کے آبدیدہ لہجے پر تینوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور تینوں وضو کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اگلے دن ہسپتال سے فون کر کے بیانے شمر کو بتایا تو اگلے ایک گھنٹے میں وہ اپنے بھائی کے ساتھ وہاں تھی۔ ہارون بھائی کے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ ان کا کوئی دوست سرجن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہسپتال کے ڈاکٹرز اور نرسوں کا رویہ بدل گیا۔ ابابھی ہوش میں نہیں تھے اور ثانیئم کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ان کا ملازم جمال کہاں سے چپہ لگا رہا ہے۔ بیانے دو ہزار روپے بھی خاموشی سے جمال بھائی کو پکڑا دیئے تھے۔ ہمیشہ گرجتے برستے ابابھائی کے ہسپتال کے بستر پر بیٹوں میں جکڑا دیکھنا خاصا مشکل ہی نہیں ان چاروں کے لئے بہت اذیت ناک تھا۔

”محترمہ! جس رفتار سے آپ پچھلے دو دن سے رو رہی ہیں مجھے لگتا ہے کہ آپ کو آنکھوں کے وارڈ میں بھجوانا پڑے گا۔“ ابابھائی کو چیک کرنے کے لئے آنے والے ایک ڈاکٹر نے بڑے خوشگوار انداز میں ضوبی کو ڈانٹا تھا۔ بلیک چادر کو اچھی طرح لپیٹے، نقاب میں سے اس کی جھیل جیسی خوبصورت آنکھیں رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں۔ ضوبی نے بیدردی سے آنکھوں کو مسلا! لیکن آنسو تھے کہ اٹھ چلے آ رہے تھے۔

”آئی! آپ پلیز اپنی اس بیٹی کو گھر بھجوا دیں کیونکہ اب ہسپتال میں مزید مریضوں کے لئے گنجائش نہیں۔“ وہ ابابھائی کی دوائیوں کا چارٹ پڑھتے ہوئے امی کو مفت مشورہ دے رہا تھا۔ مسلسل دعاؤں کا ورد کرتی امی نے چونک کر اسے دیکھا جو خاصے اپنائیت بھرے لہجے میں ان سے مخاطب تھا۔ وہ شاید اس ہسپتال میں ہاؤس جاب کر رہا تھا اور اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔

مخاطب کیا تھا یا پھر کمرے میں موجود ڈاکٹر اور ملازم کا لحاظ کیا تھا وہ کچھ سمجھ نہیں پائیں۔

اس دن سوئی کی کلاسز جلدی ختم ہو گئیں۔ یونیورسٹی میں کوئی ہڑتال تھی۔ کرن اس کے ڈیپارٹمنٹ میں آگئی ویسے بھی ہیلے کالج اور لاء ڈیپارٹمنٹ کے درمیان فاصلہ خاصا کم تھا۔ کرن کو کچھ شاپنگ کرنا تھی اور آج ٹیوشن والے بچوں کی بھی چھٹی تھی۔ اس لیے خاصا ٹائم تھا۔ وہ دونوں پہلے تسلی سے لبرٹی گئیں۔ وہاں کرن کا پروگرام انارکلی کا بن گیا تسلی سے شاپنگ کر کے وہ دونوں مال روڈ پر موجود اس زبردست سے پڑا ہٹ میں موجود تھیں۔ کرن واش روم میں گئی تو وہ اکیلے بیٹھ کر سیل فون پر کوئی ٹیم کھیلنے لگی اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب کون اس کی ٹیبل پر سامنے والی خالی چیئر پر بیٹھا خاصے ناراض انداز میں اس کی طرف متوجہ تھا۔ سوئی نے چونک کر اسے دیکھا بلیک پیٹ پر رائل بلیو شرٹ پہنے اور بازوؤں کے کف لپیٹے بڑے بے پروا انداز میں وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھتی وہ بڑے غر بھرے انداز میں گویا ہوا۔

”مجھے افسوس ہوتا ہے آپ جیسی لڑکیوں پر جو ماڈرن ازم کے چکر میں اپنے گھر والوں کی عزت ان کی روایات اور اپنا انسانی وقار تک داؤ پر لگا دیتی ہیں اور یہ بھول جاتی ہیں کہ جن کو اپنی مٹی پر چلنے کا سلیقہ نہیں آتا ان کے پاؤں سنگ مرمر پر بھی پھسل جاتے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس کی بھویں تن گئی۔

”مطلب اس کا آپ اپنے آپ سے پوچھیں خان پور کی معزز ترین فیملیوں میں آپ کی فیملی کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے بابا جہاں سے گزر جائیں لوگ عزت اور احترام سے سر نہیں اٹھاتے اور آپ ان کی عزت کو اس بے ہودہ ڈرینک میں کبھی میوزیکل فنکشنز میں کبھی سارے جہاں کے عیاش مردوں کے ساتھ ہونٹنگ میں اور کبھی کریکٹر لیس لڑکیوں کے ساتھ گھوم کر رول رہی ہیں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے آپ پر۔“ وہ انتہائی غصے کے عالم میں تھا۔ کرن جو ابھی ابھی واش روم سے لوٹی تھی۔ اس کی گفتگو سن کر شک میں آگئی جبکہ سوئی کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”کون ہے یہ منیر لالہ یا شبیر لالہ کا کوئی دوست؟ یا ہمارے گاؤں کا کوئی بندہ۔“ یہ سوچتے ہی اس کا دل مٹی میں آگیا اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سا جائے۔

”یہ..... یہ“ اس نے کرن کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بھی تو آپ کی دوست اور ہاسٹل فیلو ہیں۔ ان کو تو کبھی میں نے آپ سے باہر ہوتے نہیں دیکھا۔ اب بھی سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے یہ کتنی ڈینٹ لگ رہی ہیں اور آپ.....؟“ مارے اشتعال کے وہ خاموش ہو گیا جبکہ کرن نے ہی سنبھل کر اس سے پوچھا۔

”بھائی آپ کون ہیں؟ مریم کے کوئی کزن یا؟“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی جو کہ بہت ناگوار تھا۔ مریم کو دیکھ رہا تھا۔ کوارٹر سیلو شرٹ میں اس کے دودھیا بازو چاندنی کی طرح چمک رہے تھے فٹنگ والی شرٹ میں اس کا وجود بہت اچھا لگ رہا تھا مگر یہ حلیہ باہر جانے کے لئے قطعاً نامناسب تھا اور اوپر سے نیٹ کا دوپٹہ بے پروائی سے گلے میں ڈالا ہوا تھا جسے وہ اب لاشعوری طور پر پھیلا رہی تھی۔

”مجھے ڈاکٹر عادل کہتے ہیں کنگ ایڈورڈ کالج میں ایم بی بی ایس پارٹ تھری کا اسٹوڈنٹ ہوں اور میرا تعلق خان پور شہر سے ہے ان محترمہ کو میں نے پنجاب یونیورسٹی کے نعت کمپیشن میں بہت خوبصورت آواز میں نعت پڑھتے اور پھر پہلا انعام لیتے دیکھا تھا تب ان کے چہرے پر جو پاکیزگی اور نور تھا اس نے مجھے بہت متاثر کیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق بھی خان پور سے ہے تو میری دلچسپی کا عنصر بڑھ گیا اور ویسے بھی یہ یہاں کی لڑکیوں کی نسبت معصوم اور کچھ منفرد سی لگی تھیں اور جب مجھے معلوم ہوا کہ ان کا تعلق خان پور کی ایک انتہائی معزز اور شریف فیملی سے ہے تو ان کے لئے میرے دل میں احترام مزید وسیع ہو گیا..... لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور جب بولا تو اس کے لہجے میں دکھ اور تاسف کے رنگ نمایاں تھے۔

”اور جب میں نے ان کو میوزیکل ٹائٹ میں جنم اور ٹائٹ شرٹ میں دیکھا تو مجھے شاک لگا اور مجھے احساس ہوا کہ محترمہ خاصے کمزور کردار کی حامل چمک دمک سے متاثر ہونے والی ہیں جو کم لباس کو ترقی اور ماڈرن ازم کی علامت سمجھتی ہیں اور اس کے بعد اکثر ان کو مختلف ہوٹلز میں لُنج، ڈنر کرتے اور لیڈی کلر سکندر شاہ کے ساتھ گھومتے دیکھ کر میں سوائے جلنے اور کڑھنے کے کچھ نہیں کر سکا۔ آج اتفاق سے ان کو اکیلا دیکھا تو اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکا اگر انہیں برا لگا تو میں معذرت خواہ ہوں۔“ سوئی کے دھواں چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے سرد لہجے میں کہا تو کرن نے بڑی متانت سے کہا۔

”دیکھیں ڈاکٹر عادل! آپ کی سب باتیں درست سی، لیکن پھر بھی یہ لباس یا گھومنا پھرنا، کہیں بھی جانا انسان کے ذاتی افعال ہوتے ہیں۔ ہمیں ان پر انگریسو ہونا زیب نہیں دیتا۔ ہر انسان اپنا اچھا برا جانتا ہے۔ اس لیے ہم کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ ہم کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے، لیکن بعض لوگوں کو آپ تباہی کے گڑھے میں گرتا بھی تو نہیں دیکھ سکتے، آئی ایم سوری میں مس مریم کے معاملے میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس نے قدرے بے بسی سے کہا تو کرن نے دلچسپی سے پوچھا۔

”کیوں اس لیے کہ ان کا تعلق آپ کے شہر سے ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہاں بے شمار لڑکیوں کا تعلق آپ کے شہر سے ہوگا۔“ وہ کچھ جھینپ سا گیا، جبکہ مریم نروس انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو بری طرح مسلتے ہوئے خاموش تھی۔

”مجھے نہیں معلوم اس معاملے میں، میں اپنے دل کے ہاتھوں بے بس ہوں۔“ اس کی آنکھوں کی چمک ایک دم ہی بڑھ گئی تھی۔

”جی.....“ ان دونوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ دھیمی مسکراہٹ، لہجے کی حلاوت، آنکھوں اور چہرے پر نرمی کا تاثر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ ان کی پہلی ملاقات ہے، اس کا موڈ خاصا بدل چکا تھا اور اگلے پندرہ منٹ بعد وہ ان کے ساتھ بے تکلفی سے پرائیویٹ کر رہا تھا، ان دونوں کو ہاسٹل کے گیٹ پر چھوڑ کر وہ جانے کے لئے مڑا، رکا اور مریم کے پاس آ کر بولا۔

”آپ کو پتا ہے مریم نام لیتے ہی ذہن میں پاکیزگی کا تصور آتا ہے اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ لڑکیاں اپنے نسوانی وقار کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہیں۔ کسی لڑکی کے لیے اس سے بڑھ کر ذلت کی بات کیا ہوگی کہ کوئی مرد محض اپنے وقت کو رنگین بنانے کے لئے اسے استعمال کر رہا ہو اور مرد جس لڑکی کو اپنے گھر میں اپنی عزت بنا کر لے جانا چاہتا ہو اسے لے کر کبھی ہوٹلوں اور پارکوں میں نہیں گھومتا اس کے لئے باعزت راستے اختیار کرتا ہے۔“

مریم نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تو وہ اسے دیکھ کر مزید گویا ہوا۔

”آپ بنیادی طور پر ایک اچھی لڑکی ہیں، لیکن تھوڑی تھوڑی بے وقوف ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میرا ساتھ آپ کو بھدرا بنا دے گا۔“ اس کی آخری بات پر اس نے چونک کر دیکھا اور پھر فوراً نظریں جھکا لیں جانے کیوں مریم کا دل آج پہلی دفعہ بغاوت پر اتر آیا تھا، آج

دل کے انداز ہی مختلف تھے۔

”آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“ وہ بڑے پُر اعتماد انداز میں بولا تھا۔ کرن اندر جا چکی تھی، جبکہ وہ اس کے ساتھ گیٹ پر تھبتھی۔ اس کی اس بات پر مریم کے ذہن و دل میں دھماکہ ہوا اس نے اُلجھن بھرے انداز میں اسے دیکھا تو وہ بڑے دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

”میرا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے ہے، مجھے بچپن میں ہی میرے ماموں نے ایذا پہنچ کر لیا تھا، ان کی صرف بیٹیاں تھیں، مجھ سے انہیں خصوصی لگاؤ ہے اور اس لگاؤ کا اندازہ اس بات سے کر لیں کہ وہ میری میڈیکل کی تعلیم کا مہنگا خرچ ہنسی خوشی برداشت کر رہے ہیں۔ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ میرا انتظار کریں، لیکن جب تک آپ یہاں سے فارغ ہوں گی، میرا میڈیکل کا آخری سال ہوگا۔ آپ جب چاہیں گی میں اپنے ماموں، ممانی کو باعزت طریقے سے آپ کو مانگنے کے لئے آپ کے گھر پہنچ دوں گا۔ میں آپ کو زیادہ تو نہیں، لیکن ایک بہتر معیار زندگی دینے کی پوری کوشش کروں گا۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی ہی تھی کہ بلیک لینڈ کروزر اچانک ان کے پاس آ کر رکی شارٹ ٹراؤزر جس میں پنکی کی پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور بلیو ٹائٹ شرٹ میں مکمل میک اپ کے ہتھیاروں سے لیس پنکی نے اترتے ہی دونوں کو تیکسی نظروں سے دیکھا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سکندر شاہ کے ماتھے کے بل بھی صاف گئے جا رہے تھے۔

”پنکی باجی یہ میرے کزن ہیں ڈاکٹر عادل۔“ مریم نے گھبرا کر ان کا تعارف کروایا۔

”سو بیٹی اس سے پہلے تو تم نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔“ پنکی کے طنزیہ لہجے پر عادل نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”ہائے۔“ وہ رسماً مسکرائیں۔

”ہیلو۔“ ڈاکٹر عادل نے بھی سرسری کہا اور اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو گیا، جبکہ سکندر شاہ اسے ڈراپ کر کے نہیں زن سے گاڑی بڑھا کے لے گئے۔

”کہاں پر ٹیکس کر رہے ہیں آپ؟“ پنکی باجی کا لہجہ اب کچھ نرم ہو گیا تھا۔

”ابھی پر ٹیکس شارٹ نہیں کی ایم بی بی ایس پارٹ تھری کے ایگزیم دیے ہیں اور فوراً ایئر شارٹ ہونے والا ہے۔“ ڈاکٹر عادل نے بے پروائی سے جواب دیا اور ایک کارڈ پر اپنا سیل فون لکھ کر مریم کی طرف بڑھایا جسے اس نے فوراً پکڑ کر ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا۔

الجمن بھری نظروں سے چند لمحے انہیں دیکھتی رہی اور پھر چپ چاپ باہر نکل گئی اور کمرے کا دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ اس کی کلاسز تو دو پہر کی تھیں، لیکن وہ آج لائبریری میں بیٹھ کر سنجیدگی سے پڑھنا چاہ رہی تھی اور واپس شام کو ہاسٹل آئی تو معلوم ہوا چنگی باجی کسی بزنس میٹنگ کے سلسلے میں بھور بن جا چکی ہیں تو اس نے سکون کا سانس لیا، اسے نہ جانے کیوں اب چنگی باجی سے نامعلوم سی الجمن ہونے لگی تھی۔

وہ رات کو کھانے کے برتن دھو کر ہاتھ صاف کر رہی تھی جب فرحانہ چائے کے خالی گگ لے کر کچن میں داخل ہوئی اور اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرائی تو اس نے بھی جوابی مسکراہٹ سے اسے نوازا۔ واش بیسن پر گگ کھٹکالتے ہوئے وہ سرسری لہجے میں بولیں۔
”سوئی تمہاری مسکراہٹ ایمن انصاری سے بہت ملتی ہے۔“

”یہ ایمن انصاری ہے کون جس کا آپ بار بار ذکر کرتی ہیں؟“ وہ جھنجھلا کر بولی تو فرحانہ اس کی بے مبری پر مسکرائی اور بے پروا انداز میں کہنے لگیں۔

”مسلم ٹاؤن والے ہاسٹل میں چنگی کی روم میٹ تھی، بہت خوبصورت اور بے داغ حسن کی مالک ایک بہت معصوم لڑکی۔“

”اچھا..... اب کہاں ہوتی ہے؟“ سوئی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
”اس نے خودکشی کر لی تھی۔“ فرحانہ برتن سیٹھتے ہوئے تاسف بھرے انداز میں بولی تو سوئی کو دھچکا لگا اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا جیسے سننے میں مغالطہ ہوا ہو۔
”لیکن کیوں؟“ ایک دم دہل کر اس نے پوچھا۔

”پتا نہیں..... اللہ جانتا ہے یا چنگی بہر حال، چنگی کے سکندر صاحب کے تعلقات کام آئے اور اس کیس سے چنگی کا نام نکل گیا، اب حقیقت اللہ جانتا ہے۔“ وہ کچن سے نکل گئیں۔
مریم لب بستہ سی کھڑی ان کو جاتا دیکھتی رہی، پھر جیسے ہڑبڑا کر نیند سے جاگی اور اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ناز و آبی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اس کا دل خاصا خراب ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گدے پر جا کر لیٹ گئی، ناز و آبی نے سلام پھیر کر تشویش بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

”مریم، کیا ہوا ہے چندا؟“

”آبی، آپ مسلم ٹاؤن میں چنگی باجی کے ساتھ کسی ہاسٹل میں رہی ہیں؟“

”تمہارا کزن خاصا اسارٹ اور ہینڈسم ہے۔“ چنگی باجی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا اس کے تو صیغی لہجے پر ناز دہشتے ہوئے بولیں۔
”یار مریم اپنے کزن کو چھپا کر رکھنا، چنگی ہینڈسم اور اسارٹ چیزیں کم ہی کسی کے پاس رہنے دیتی ہے۔“

”بکواس مت کرو، تم تو میری پکی دشمن ہو۔“ چنگی باجی نے ہنستے ہوئے مصنوعی غصے سے کہا جبکہ رات کو اپنے بستر پر لیٹتے ہی ڈاکٹر عادل کا پُرکشش چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے آ گیا کوئی بہت محبت بھرے لہجے میں بولا تھا ”مجھ سے شادی کرو گی؟“ اس کے دل نے فوراً اثبات میں جواب دیا تھا تو اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

* * *

اگلے دن کیسپس جانے سے پہلے اس نے تمام ٹراؤز، شرٹس، جینز اٹھا کر الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں پھینک دیں۔ میرون شلوار قمیض نکال کر اس نے آف وائٹ اسکارف لے کر دوپٹا سلیپے سے پھیلا کر لیا تو ناز و آبی نے بڑی سٹائی نظروں سے دیکھا تھا جبکہ کزن بھی مسلسل ذومعنی انداز میں مسکرا رہی تھی۔ چنگی باجی جمائیاں لیتے ہوئے کسلندی سے اٹھیں۔ اسے دیکھ کر ناگواری سے بولیں۔

”یہ اتنے پینڈو حلقے میں کہاں جا رہی ہو؟“

”کیسپس۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تم کبھی نہیں بدل سکتیں۔“ وہ غصے سے بڑبڑائیں۔

”میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ اس کے پُر اعتماد انداز پر وہ واش روم کی طرف جاتی خشکیں اور مڑ کر بطور خاص اسے دیکھا۔

”سوئی تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے اور پلیز چنگی باجی مجھے سوئی مت کہا کریں، میرا نام مریم ہی لیا کریں۔“ وہ اپنی فائل اٹھاتے ہوئے سرسری لہجے میں بولی تو چنگی باجی واش روم جانا بھول گئیں۔

”میرا خیال ہے سوئی کہ تمہاری طبیعت واقعی خراب ہے۔ ایسا کرنا کہ ڈیپارٹمنٹ سے واپسی پر اپنے ڈاکٹر کزن سے چیک اپ ضرور کرواتی آنا۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوئیں تو مریم

تک کافی شکلوں سے بڑھ چکا تھا۔

”لیواٹ ڈارلنگ تم اس حلقے میں بھی غضب ڈھا رہی ہو۔“ پھر اس کے ناں ناں کرنے کے باوجود وہ اسے زبردستی لے آئی تھیں۔ ہر طرف نئے چہرے تھے، جن میں مردوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اپنے بے باک ڈریس کی وجہ سے وہ کافی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھیں، جبکہ مریم خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ خدا خدا کر کے ڈنر ختم ہوا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ ہاسٹل کا ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ اچانک ہی انہوں نے انارکلی میں گاڑی روک لی معلوم ہوا کہ کل خاکوانی صاحب کے اپنے فارم پر دیے گئے لہجے کے لئے انہوں نے سوٹ خریدنا تھا۔

”پنگی باجی آپ ٹائم دیکھیں ذرا پھر ستارہ آنٹی ناراض ہوں گی، آپ کل صبح سوٹ لے لیجے گا۔“ اس نے انہیں روکنا چاہا، مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔

”ارے نہیں یار کل جمعہ ہے اور سارا بازار بند ہوگا بس پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔“ وہ فوراً اتر گئی تھیں، بازار میں خاشار تھا۔ وہ تیزی سے ایک سے دوسری شاپ میں گھس رہی تھیں، جبکہ اسے ان کے پیچھے تقریباً بھاگنا پڑ رہا تھا، پھر ایک شاپ پر وہ ایک سوٹ دیکھنے میں ایسی مگن ہوئی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا، پنگی باجی کہاں گئیں اس نے ان کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا، مگر وہ کہیں نہیں تھیں۔ مریم کے ہاتھ پیر پھول گئے سوئی پونے گیارہ بج رہی تھی۔ وہ بوکھلا کر باہر نکل آئی اسے بازار کا زیادہ علم بھی نہیں تھا۔ اس کے گھبرائے گھبرائے چہرے کو دیکھ کر دو تین لڑکوں نے کمٹس بھی پاس کیے تھے، وہ تیز چلتی پارکنگ میں آئی تو پنگی باجی کی گاڑی غائب تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ نسبتاً کم رش والی جگہ پر حواس باختہ کھڑی تھی۔ جب اس کے سیل فون پر اچانک ڈاکٹر عادل کا نمبر بجھا اٹھا۔ فون اٹینڈ کرتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ دوسری جانب عادل گھبرا اٹھا اور صورت حال معلوم ہوتے ہی اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم کو فیڈنٹ ہو کر سیدھی چلتی ہوئی نیلا گنبد کے پاس کنگ ایڈورڈ کالج کے سامنے آ جاؤ، جو تم سے صرف تین چار منٹ کی واک پر ہے، مجھے ٹاؤن ہال چوک سے آنے میں صرف پانچ منٹ لگیں گے اور خبردار رونا نہیں۔“ اس نے بیدردی سے اپنی آنکھوں کو مسلا، جب تک وہ وہاں پہنچی ٹھیک تین منٹ کے بعد دائیں سوزوکی کار میں گھریلو شوار قمیض اور چنل میں

”ہاں لیکن وہاں میری روم میٹ گوجرانوالہ کی ایک لڑکی تھی۔“

”آپ ایمن انصاری کو جانتی ہیں؟“ نہ جانے کیوں مریم کو لگا کہ اس سوال پر نازو آپنی کے چہرے کی رنگت اڑی تھی۔

”ہاں!“ انہوں نے سر ہلایا۔

”اس نے خودکشی کیوں کی؟“

”اس لیے کہ اسے کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا، اس کے والد بہت بڑے مذہبی اسکالر اور اس کا تعلق ایک خاصی مذہبی فیملی سے تھا، اس کے بھائی اپنے علاقے کے ناظم تھے۔“

”لیکن ہوا کیا تھا؟“ وہ شدید الجھن میں تھی۔ کرن بھی پڑھنا بھول کے ان کی طرف متوجہ تھی۔

”پتا نہیں، بس سننے میں آیا تھا کہ اس کے کسی فیکٹری اونر کے ساتھ تعلقات تھے، جس نے اسے کسی قابل نہیں چھوڑا اور اس نے مایوس ہو کر خودکشی کر لی۔“

”تو کیا وہ بے وقوف تھی؟“ وہ غصے سے بولی۔

”ہاں وہ بے وقوف ہی تھی، یا پھر اکثر لڑکیاں پاگل اور بے وقوف ہی ہوتی ہیں۔ انہیں محبت اور ہوس میں کوئی فرق ہی دکھائی نہیں دیتا۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے اب دعا مانگ رہی تھیں، جبکہ مریم کو شدید ڈیپریشن ہو رہا تھا۔ وہ تنگ آ کر انھی اور لان میں جا کر ڈاکٹر عادل سے بات کرنے لگی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس آئی تو خاصی مطمئن تھی۔ آتے ہی سو گئی۔

پنگی باجی کی واپسی چار دن کے بعد مہران گاڑی کے نئے ماڈل کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ خاصی تھکی تھکی لیکن گاڑی کے معاملے میں خاصی بڑجوش تھیں، تبھی آنٹی ستارہ نے ہاسٹل کے کیراج میں گاڑی گھڑی کرنے کے علیحدہ چار جز مانگے تو اس نے کوئی بحث نہیں کی۔

اس دن وہ کیمپس سے آخری کلاس اٹینڈ کر کے باہر نکلی تو سامنے پنگی باجی کو اپنا مختصر پایا، جو شاید کافی دیر سے اس کی منتظر تھیں، ”تھینکس گاڈ سوئی تم آ گئیں آج ارتھی خاکوانی کے گھر ڈنر تھا اور میرا اکیلے جانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ نازو ابھی آفس سے نہیں آئی تھی۔ سوچا تمہیں پک کر لوں۔“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بہانہ بناتی وہ گاڑی کا دروازہ کھول چکی تھیں۔

”لیکن پنگی باجی میرا سوٹ۔“ اس نے پنک کاٹن کے سوٹ کا تنقیدی جائزہ لیا، جواب

پریشان پریشان سا ڈاکٹر عادل وہاں تھا۔

مریم کی پلکوں پر پھر موتی چپکنے لگے اس نے احسان مندی کے جذبات سے اسے دیکھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ مڑا اور فرنٹ سیٹ پر اپنے ساتھ بیٹھی مریم کو دیکھ کر معنوی غصے سے وارننگ دی۔

”خبردار رونا مت۔“ وہ جیسے ہی تھوڑی سی ریلیکس ہوئی اس نے غصے سے کہہ ”تمہیں کس پاگل نے مشورہ دیا تھا کہ آدمی رات کو اس فضول عورت کے ساتھ شاپنگ پر نکل آؤ جسے نہ اپنی عزت کی پروا ہے اور نہ کسی اور کی۔“

”میں نے تو بہت منع کیا لیکن وہ مانی نہیں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
”کیوں وہ تمہارے اوپر تھانیدار لگی ہوئی ہے یا مگن پوائنٹ پر تمہیں لے کر آئی تھی تمہاری اپنی عقل کام نہیں کرتی اگر آئندہ مریم میں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تو بہت برا ہوگا۔“ وہ حقیقتاً بہت غصے میں تھا۔ وہ اس کے انداز پر ہنسنے لگی۔

”سارے جہاں کی سب سے فضول اور بے ہودہ لڑکی ہے وہ آج کل سکندر شاہ کو چھوڑ کے کسی منشر کے پیچھے ہے اور سکندر شاہ غصے میں پاگل ہوا پھر رہا ہے اور یہ گاڑی بھی اسے اسی منشر نے لے کر دی ہے۔ پچھلے دنوں مری میں ایک ہفتہ لگا کر آئی ہے اسی کے ساتھ۔“ ڈاکٹر عادل کی معلومات پر اسے خاصی حیرانی ہوئی۔

”تم سوچ رہی ہو گی کہ مجھے کیسے پتا چلا تو میرا روم میٹ سکندر شاہ کا فٹ کزن ہے اور مرد ایسی عورتوں کا ذکر کھلے عام کرتے ہیں۔ انہیں کسی کی عزت کی پروا نہیں ہوتی اور یہ چنگی صاحبہ تو خاصی مشہور و معروف ہیں۔“

مریم کو یہ ساری باتیں سن کر شاک لگا تھا۔ وہ ہکا بکا انداز میں سارے انکشافات سن رہی تھی۔ پھر ہاسٹل پہنچ کر چنگی کی گاڑی گیراج میں دیکھ کر وہ خاصا تپ گیا تھا کہ چنگی کو انہوں نے ٹھیک ٹھاک سنائی تھیں اور ڈاکٹر عادل نے بھی اسے سیل فون پر کمری کمری سنا کے آئندہ مریم کو ساتھ نہ لے جانے کی تلقین کی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو چنگی باجی اس پر برس پڑیں۔

”کہاں رہ گئی تھیں تم؟ تمہارا اگر ڈاکٹر عادل کے ساتھ کوئی پروگرام تھا تو مجھے بتا دیتیں میں خواہ مخواہ ساری انارکلی میں ذلیل ہو گئی اور پر سے تمہارے ڈاکٹر عادل صاحب بھی مجھ پر برس رہے تھے لوالٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے۔“ چنگی باجی نے اپنا سیل فون کبل پر پھینکتے ہوئے کہا ابھی

ابھی ڈاکٹر عادل کی کال شاید انہوں نے اینڈ کی تھی ان کا چہرہ غصے سے تپ رہا تھا۔
کرن اور نازو آپنی کے سامنے اس قدر انسٹ پر اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں وہ حیرت اور صدمے سے انہیں دیکھتی رہ گئی جو اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اب کبل تان کر آرام سے لیٹ گئی تھیں۔ انہوں نے آج مریم کو ٹھیک ٹھاک سنائی تھیں۔
کچھ دیر کو کمرے میں خاموشی رہی۔

”مریم چندا تم نے کھانا کھایا ہے؟“ نازو آپنی کی آواز میں حد درجہ سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ مریم نے سرعت سے سر اٹھا کر نازو آپنی کو دیکھا اور ان کے مہربان انداز کو دیکھ کر اسے بے اختیار رونا آ گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھتے ہوئے اسے یاد آیا کہ آج اس نے کیپس میں ایک سینڈوچ اور پنگی باجی کے ساتھ ڈنر میں بس تھوڑے سے چاول لیے تھے آنسو بے اختیار پھسلنے جا رہے تھے نہ جانے کب نازو آپنی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”ڈنٹ وری جانو! مجھے معلوم ہے کہ چنگی غلط بیانی کر رہی ہے۔ تم دل پر مت لو۔ وہ ایسی ہی ہے بے پروا اور بس اپنی ذات کو اہمیت دینے والی۔“

”یقین کریں آپنی میں کافی دیر تک ان کو وہاں ڈھونڈتی رہی اور بائے چانس ڈاکٹر عادل کی کال آگئی ورنہ میں رکشا لے کر آنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ اس نے ہچکے لہجے میں وضاحت دی تو کرن سنجیدہ سے انداز سے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”لیواٹ یار ہمیں تمہارا پتا نہیں ہے کیا؟“ وہ نہ جانے کب ان دونوں کے پیچھے کچن میں آگئی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ پورے ہاسٹل میں خاموشی تھی اور سب لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں تھیں۔ چائے پی کر وہ خاموشی سے اپنے بستر میں لیٹ گئی آج زندگی کا ایک تلخ اور چبھتا ہوا رخ اس کے سامنے آیا تھا اس کا دل درد سے بوجھل ہو گیا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس کی آنکھوں سے ایک بہت بڑا پردہ اٹھا ہو وہ کافی دیر تک اپنا تکیہ بھگوتی رہی اور پھر تھک کر سو گئی۔

صبح اٹھی تو دن کے دس بج چکے تھے۔ چنگی باجی اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی جا چکی تھیں اور کرن تو صبح صبح نکل جاتی تھی۔ نازو آپنی ناشتہ اس کے سر ہانے رکھ کر اب اسے اٹھا کر اپنے آفس کے لئے نکل رہی تھیں۔ وہ سستی سے جمائیاں لیتی آئی منہ ہاتھ دھو کر برش کیا پھر ناشتا

”کسی نڈل کلاس فیملی کے مرد سے شادی کر کے اپنا آپ خراب مت کر لینا“ ساری زندگی ہانڈی چولہا کرتے گزر جائے گی اور ہم جیسی خوبصورت لڑکیاں اپنا حسن باورچی خانوں میں غارت کرنے کے لئے پیدا نہیں ہونیں“ بلکہ مردوں کے دلوں پر راج کرنے کے لئے ہیں۔ یقین کرو مجھے تو بہت مزہ آتا ہے جب اپنے پیچھے ایک لمبی تعداد اپنے عاشقوں کی دیکھتی ہوں تو۔“ وہ بہت بے باک انداز میں ہنسی تھیں، مریم نے بہت غور سے انہیں دیکھا۔

”مریم“ یقین کرو جان، تم مجھے چھوٹی بہنوں کی طرح عزیز ہو اور میں چاہتی ہوں کہ تم شہزادوں کی طرح زندگی بسر کرو۔“ چنگی باجی کے پُر خلوص لہجے نے اس دفعہ اس کے دل پر خاصا اثر کیا تھا۔ تبھی وہ بولی۔

”لیکن چنگی باجی مجھے اتنے ماڈرن ڈریسز پہننے ہوئے شرم آتی ہے اور جب سکندر شاہ میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت عجیب لگتا ہے۔“

”اوہ انوسینٹ گرل! اگر ترقی کرنی ہے تو اس شرم ورم کو سائڈ پر رکھنا ہوگا اور ہاتھ وغیرہ پکڑنے سے کیا ہوتا ہے تمہارا کیا بگڑتا ہے؟ مائی ڈیئر انجوائے کیا کرو بلکہ ان لمحات میں خوب لمبی لمبی فرمائشیں کیا کرو۔“

چنگی باجی نے ناصحانہ انداز میں اسے سمجھایا وہ خاصی الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

”لیکن چنگی باجی یہ عادل کو اچھا نہیں لگتا؟“ اس نے اپنا اصل مسئلہ بتا دیا۔

”کون؟ وہ ڈاکٹر عادل؟“ وہ چونکیں ”لیکن وہ کون ہوتا ہے تم پر حق جتانے والا؟“ اب کہ ان لہجے میں غصہ تھا۔

”اس نے مجھے پروپوز کیا ہے۔“ مریم نے سادہ لہجے میں بتایا۔

”اوہ شٹ..... وہ ڈاکٹر عادل؟ سوئی تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ وہ تمہیں کیا دے گا؟ کسی سرکاری ہسپتال میں لگ کے آٹھ دس ہزار کمائے گا؟ اس میں تمہارا گزارہ ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں سوائے اچھی شکل و صورت کے اس میں ہے ہی کیا؟ اوپر سے انتہائی تنگ ذہنیت کا مالک، کبھی بھول کے بھی اس سے شادی کا نہ سوچتا، ساری زندگی ترس ترس کر گزار دو گی، میری مانو کھری کھری سناؤ تمہارے لیے لڑکوں کی کمی ہے۔“ وہ بری طرح الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

”دفع کرو اسے تمہاری ساری زندگی اس کے بچے پیدا کرتے اور باورچی خانے میں اپنا آپ جلاتے گزر جائے گی اور تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو جو اس طرح ترس ترس کر زندگی گزار

کیا اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لئے نکل پڑی وہ دوسری کلاس لے کر باہر نکلی تھی۔ جب شرمندہ شرمندہ سی چنگی باجی اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کے ڈیپارٹمنٹ تک پہنچ گئی تھیں۔

”سوئی ڈارلنگ آئی ایم سوری یار مجھے رات والے واقعے پر بہت شرمندگی ہے۔ یقین کرو آفس میں بھی میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا پہلے اپنی سوئیٹ ہارٹ کو منا کر آؤں پھر باقی کام کروں گی۔“ وہ اس کے گال پر بے ساختہ پیار کرتے ہوئے خفت زدہ لہجے میں بولیں تو مریم کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔

”واقعی یار رات میں کافی زیادہ اپ سیٹ رہی پورے بازار میں تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی رہی اور اوپر سے پہلے آئی ستارہ کی ککواس سننا پڑی اور اس کے بعد تمہارے ڈاکٹر صاحب بھی مجھ پر برسا شروع ہو گئے، میرا سارا غصہ تم پر نکل گیا، سوری یار۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے بہت محبت اور اپنائیت سے کہہ رہی تھیں۔ مریم کو اپنی رات کی ٹینشن بھولتی محسوس ہوئی وہ ایسی ہی تھی۔ معصوم اور بہت جلد اعتبار کرنے والی۔

”چلو یار، ٹیسی سے تمہیں اچھا سا کھانا کھلا کر لاتی ہوں۔“ چنگی نے اس کا بازو پکڑا ”اسے نہ جانے کیوں ان کے سارے انداز مصنوعی لگے تھے، لیکن نہ جانے کیوں وہ ہمیشہ ان کے سامنے بے بس ہو جاتی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم ابھی تک خفا ہو، تبھی جانیں رہی ہو۔“ وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئیں تو مریم نہ چاہتے ہوئے بھی گاڑی میں بیٹھ گئی اور دل میں سوچا کہ بس یہ آخری دفعہ ہے اسے نہ جانے کیوں اب چنگی باجی کے انداز برے لگنے لگے تھے۔

”یقین کرو سوئی، تم بہت کیوٹ ہو سکندر تو مجھے کہہ رہے تھے کہ اگر یہ لڑکی ماڈلنگ کی طرف آجائے تو تہلکہ مچا دے ذرا سوچو کتنی گلیمرس تمہاری زندگی ہو گی، اس دن لبرٹی میں انفضال چغتائی نے تمہیں میرے ساتھ دیکھا تب سے پاگل ہوا بھرتا ہے۔ میری مانو تو خوب مہنگے سیل فون، جیولری، کپڑے وغیرہ اس سے نکلواؤ، ایسے مردوں کو ایسے ہی لوٹنا چاہیے اور اپنی زندگی کو انجوائے کرنا چاہیے۔ اصل موجیں تو اپر کلاس کی ہیں نہ پابندیاں نہ کوئی ضابطہ اخلاق اور اگر اللہ نے آپ کو خوبصورت جسم اور چہرہ دیا ہے تو اسے چھپا کر رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ مائی ڈیئر! زندگی بار بار نہیں ملتی اپنے آپ کو بدلو۔“ آج چنگی باجی کی باتیں نہ جانے کیوں اسے متاثر نہیں کر رہی تھیں۔

دو اس سے اچھا تو افضال چٹائی ہے کروڑوں کی پراپرٹی کا تنہا مالک ہر تیسرے مہینے گاڑی کا نیا ماڈل ہوتا ہے اس کے پاس اور تمہارا تو پکا عاشق ہے بلکہ تمہیں تو مزید چار سال تک شادی کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی نہیں، خوب سے خوب تر کی تلاش رکھو اور اس کے بعد شاید کرو لیکن شادی کے بعد بھی انجوائے، پر کلاس مجھے اس لیے ہی تو پسند ہے۔ کہ وہاں ہماری کلاس کی عورتوں والے ڈرامے نہیں ہوتے، وہ لوگ ٹھیک زندگی کو انجوائے کرتے ہیں، روپیہ، فنکشن، ڈانس کلب، بوائے فرینڈز کیا عیاشی ہے ان لوگوں کی۔“ پنکی باجی نے کھانا کھا کے گاڑی ایک نو تعمیر شدہ فلیٹس کے آگے روکی۔

”بس یار دو منٹ ایرج سے مل لوں۔ آج کل بہت اونچی ہواؤں میں ہے۔ یہ فلیٹ اسے اس کے کسی دوست نے لے کر دیا ہے۔ آؤ ذرا دیکھتے ہیں اور چائے پی کر پھر چلتے ہیں۔ ابھی تو شام کے چھ ہی بجے ہیں۔“ ایرج کے فلیٹ میں بیٹھے ہی سوئی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ پنکی سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ اس نے خود کو بہت مین ٹین کر رکھا تھا۔ سیلولیس شرٹ میں اس کا بازو دک رہے تھے وہ سوئی سے بہت پیار سے ملی تھی۔

”یار! یہ تمہاری سوئی تو خود چلتی پھرتی قیامت ہے۔ بس ذرا پالش کرنے کی ضرورت ہے۔“ ایرج نے بہت رواں انگلیش میں پنکی سے کہا تھا۔ یہ الگ بات کہ سوئی کو آسانی سے سمجھ میں آگئی تھی۔

”ایسے ہی سکندر شاہ کے دل کو پچھے نہیں لگے ہوئے۔“ وہ خاصی بے باکی سے ہنستے ہوئے بولی۔ سوئی نے جیسے ہی چائے پی اس کا ذائقہ اسے کچھ مختلف لگا، لیکن اس کے اندر گہرا سکون اترتا گیا اور دماغ سرور کے انوکھے نشے میں ہلکورے لینے لگا۔ اسے گہری نیند کی تمنا جاگ اٹھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی گئیں اس کی سماعتوں میں پنکی باجی کا کامیابی سے لبریز قہقہہ گونجاؤ کہہ رہی تھیں۔

”ڈاکٹر رات مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ میرا کچا چٹا کھولنے کی دھمکیاں دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میری مریم بہت شریف اور پاکیزہ لڑکی ہے۔ ساری رات میرا دماغ کھول رہا۔ وہ تو سکندر شاہ نے بڑی بھاری قیمت لگا دی اور میرا کام بن گیا، ورنہ میں تو اسے مفت میں بھی کسی کے حوالے کرنے کو تیار تھی۔“ وہ ابھی مکمل بے ہوش نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے ہاتھ پیروں سے جان نکل گئی تھی۔

”ویل ڈن ڈارلنگ! تم آخر کار یہ بھولی بھالی چڑیا، بھلا پھسلا کر لے آئیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ جب سے میں نے اسے دیکھا تھا میری تو راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔“ سکندر شاہ کی قہقہہ آواز اب اس کی سماعتوں میں گونجی تھی اسے بہت کم باتیں سمجھ آ رہی تھیں۔ ”تمہیں تو ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھتے ہی دورے پڑنے لگتے ہیں۔“ پنکی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ جواب میں سکندر شاہ کا فلک شکاف قہقہہ فلیٹ میں گونجا۔

”لیکن جب تک تم میرے ساتھ ہو، میرے خیال میں میرے دورے مختصر ہی رہیں گے۔“ بس اس ایمن انصاری کی دفعہ مزہ کر کر رہا ہو گیا تھا۔ سالی نے ایک تو مزاحمت بہت کی اور اوپر سے خودکشی کرنے سے پہلے لمبا چوڑا مصیبت نامہ لکھ گئی، بہت مشکل سے اس پھڑے سے جان چھڑائی تھی۔“

”ٹھیک ہے، زیادہ باتیں مت کرو۔ اب میں مزید تمہارے لیے لڑکیاں سپلائی نہیں کر سکتی کیونکہ میں نے خا کوئی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم تو مجھے لاروں پر رکھو گے اب آئندہ اپنا بندوبست خود کرنا ایک تو آج کل لڑکیاں بہت تیز آ رہی ہیں۔ دوسرے ہاسٹلز کا ماحول خاصا ٹائٹ ہو گیا ہے۔ تم نے سوئی کو لانے کے لئے مجھے پانچ لاکھ کی آفر کی تھی۔ بس مجھے فارغ کرو مجھے جانا ہے۔ ایرج صبح اسلام آباد جا رہی ہے۔ اس لیے فلیٹ لاک کر دینا چاہی میں بعد میں لے لوں گی۔“

پتا نہیں کتنی دیر بعد سوئی کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور شراب کے نشے میں دھت کھڑکی کے پاس کھڑے شاہ صاحب اسے بڑی بے خود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جموتے لڑکھڑاتے مریم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں شیطانی چمک رہی تھی۔ انہوں نے جھٹکے سے مریم کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ ان کے منہ سے آتے ہوئے جھکے سے اسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اسی وقت لائٹ چلی گئی، ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔ مریم نے بستر سے اٹھنا چاہا، مگر اس کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ بے مشکل اٹھی اور اگلے ہی لمحے سکندر شاہ کے آہنی ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا تھا۔

”سبحان اللہ! ہم خواجواہ بے رنگ کلیوں کے پیچھے خوار ہوتے رہے۔ ان چھوٹی کلی کا تو اپنا ہی مزہ ہے۔ واہ پنکی ڈارلنگ آج تو عیش کر دے۔“

”چھوڑو مجھے، چھوڑو۔“ وہ بے بس لہجے میں بولی۔

نہیں معلوم کہ فلیٹ سے گر لڑ ہاسٹل تک کا سفر اس نے کیسے کیا۔ جسم و روح زخم خوردہ اور دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کی حالت عجیب سی تھی جیسے کسی نے اس کی سانس روک لی ہوں یا گلا دبوچ دیا ہو۔ وہ اپنے حواسوں میں کہاں تھی۔ رکشا ڈرائیور نے کئی دفعہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا جو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو کھولے پھرائی آنکھوں سے بس دیکھے جارہی تھی، جیسے کسی خاص لکیر کی تلاش ہو۔ دوپٹہ بے پروائی سے لٹک رہا تھا۔ بال بکھرے، آنکھیں وحشت زدہ اور ہونٹ بالکل سفید ہو چکے تھے۔

اسے یاد آیا کہ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو بابا نے پورے تین دن حویلی میں دیکیں پکوائی تھی۔ گاؤں والے بابا کی خوشی پر حیران تھے جو چار بیٹوں کے بعد پیدا ہونے والی بیٹی کی آمد پر خوشی سے سرشار تھے۔ اماں کہتی تھیں کہ میری مریم بہت قسمت والی ہے اس کی معصومانہ باتوں پر بھائی اس کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتے تھے۔ اب وہی مریم جس کے بارے میں گاؤں کی خواتین کہتی تھیں کہ چوہدری حسین کی بیٹی کے چہرے پر نظر نہیں نکلتی، اسی مریم کو اپنے چہرے سے نفرت ہو رہی تھی۔

”کیا سادہ دل ہونا اور سب پر اعتبار کر لینا اتنی بڑی غلطی ہے جس کا خلیا زہ مجھے اس ذلت آمیز نتیجے کی صورت میں ملا؟“ تلخ سوچوں نے اس کے ذہن کا احاطہ کر لیا تھا۔

”آپ کو پتا ہے مریم کے لڑکیاں ڈھکی چھپی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں جس چیز کی اسلام نے ممانعت کی ہے اس میں لڑکیوں کا کتنا فائدہ ہے وہ یہ سوچ لیں تو بہت سی لڑکیاں بہت بڑے خسارے سے بچ جاتی ہیں۔“ ڈاکٹر عادل کی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرانی۔

”آخر میرا کیا قصور تھا؟“ اس کا ذہن ایک ہی بات کی تکرار کئے جا رہا تھا۔ رخساروں پر آئی نمی کو اس نے ہاتھ کی پشت سے بے دردی سے صاف کیا۔

”ارے جان من! کیسے چھوڑ دیں، ہم تو اس میوزیکل ٹائٹ والے دن سے مدہوش ہیں۔ اپنے قیامت حسن سے تم نے ہمیں بہکایا، معصوم اداؤں سے تو بالکل ماری دیا۔ چھوڑو ان غروں کو مجھے معلوم ہے تم بھی پنکی کی ٹائپ کی لڑکی ہو۔ ورنہ پورے لباس اور پردے والیوں کو تو ہم بھی حیا کے مارے چھوڑ دیتے ہیں، لیکن جو خود نظارے کرائے ان کو کون کافر چھوڑ سکتا ہے۔ ابویں نہیں پچھیں ہزار کی شاپنگ کروائی تھی۔ اس کی قیمت آج وصول کرنی ہے، ناں، جانم۔“

”مجھے جانے دیں پلیز! جانے دیں، پنکی باجی۔“ وہ زور زور سے چیختی لگی تو سکندر شاہ نے فاتحانہ قہقہہ لگایا۔

”ارے تمہاری پنکی ڈارلنگ تو اپنے پانچ لاکھ کمرے کر کے اس خاکوانی کے پاس چلی گئی ہے۔ وہ کہیں سے نہیں آ سکتی میری قہقہ۔ بس آج یہ ٹائم نکال جاؤ، پھر سیٹ ہو جاؤ گی۔ اس کے بعد تمہیں عادت ہو جائے گی۔ اب پنکی ایسے تھوڑی چھوڑے گی۔ بڑے آفت تمہارے پوز میرے ساتھ کھینچ کر لے گئی ہے۔ اب اس کے ذریعے مزید مال کمائے گی پوری بزنس دو مین ہے۔“ وہ اب بہک رہے تھے۔ مریم خود کو چھڑانے کے لئے پورا زور لگانے لگی، مگر وہ بے بس چڑیا کی طرح شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر بے ہوش ہو چکی تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے اپنے جوڑ جوڑ دکھتے ہوئے بری طرح مسئلے جسم کو دیکھا تو اسے احساس ہوا پہلی دفعہ کہ ایمن انصاری نے خودکشی کیوں کی تھی؟

* * *

”تمہارا قصور یہ تھا کہ تم نے اپنی اخلاقی اقدار اور اسلامی احکام کو نظر انداز کر کے اندھا دھند غلط چیزوں کی پیروی کی اور یہ بھول گئیں کہ ”اخلاقیات“ نامکمل لباس پہننے کا نام نہیں۔ ماؤرن ازم کی دوڑ میں دینی احکامات کو نظر انداز کر دینے میں کتنا خسارہ ہے تم نے اپنا آپ دکھا کر سکندر شاہ کے جذبات میں طوفان پیدا کیا اور بنگی کے غلط مشورے مان کر اپنی عزت کو داؤ پر لگایا۔ تم دوست و دشمن کی پہچان بھول گئیں۔“ کوئی اس کے اندر سے بہت جارحانہ انداز میں بولا تھا۔

”کاش“ میں نے فرحانہ جمیل کی باتوں کو غور سے سنا ہوتا اور ان سے سبق اخذ کیا ہوتا۔“ ایک پچھتاوے نے اس کے اندر سراٹھایا تھا۔ ”کاش میں نے اماں کی بات مان لی ہوتی اور یہاں داخلہ نہ لیا ہوتا۔ کاش میں نے منیر لالہ کی بات مان کر بنگی باجی سے قطع تعلق کر لیا ہوتا۔“ پچھتاوے اس کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ بین ڈالے اور گاؤں کی جاہل بوڑھی عورتوں کی طرح قمیض کا دامن اٹھا اٹھا کر بدعائیں دے بنگی باجی کو، کو سے ان کی بربادی کی دعائیں مانگے، اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ فرحانہ جمیل نے بہت عجیب لہجے میں کہا تھا۔ ”بعض والدین کتنے عجیب ہوتے ہیں اپنے گھر کی قیمتی چیزوں کو اٹھا کر چوک پہ رکھ دیتے ہیں اور لوگوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان پر بری نظر نہیں ڈالیں گے۔“ ایک دفعہ اس نے تلخ لہجے میں مریم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”گمراہ لے اپنی بچپن کو ہاسٹل کے حوالے کر کے دوبارہ مڑ کے دیکھتے تک نہیں اور ان کے ناپختہ ذہنوں پر اعتبار کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ چپک ہی نہیں کرتے کہ ان کی معصوم بچیاں کن شیطانی ذہنوں کے اشاروں پر ناچ رہی ہیں اور شیطان کا جال تو ویسے ہی بہت پرکشش اور دل فریب ہوتا ہے۔“

اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اذیت نے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔ وہ لڑکھرائی ناگوں کے ساتھ ہاسٹل پہنچی تو ایک اور قیامت اس کی منتظر تھی۔ ستارہ آنٹی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تفر بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”کل شام تک اپنا سامان لے کر اس ہاسٹل سے دفع ہو جاؤ، میرے ہاسٹل میں بدکردار اور بے حیا لڑکیوں کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ تمہارا بھائی جو اس ہاسٹل میں ہنگامہ کر کے گیا ہے میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ خرابی اگر اپنے گھر میں ہو تو دوسروں پر الزام رکھنا

بے وقوفی ہے حالانکہ اس مسئلہ کی ہنگامی نے تمہارا کارنامہ صاف صاف اسے بتا دیا تھا، لیکن پھر بھی وہ چیخے جارہا تھا، کہہ رہا تھا کہ جہاں بھی تم نظر آئیں وہ تمہیں گولی مار دے گا۔ میں اپنے ہاسٹل میں کوئی تماشا نہیں دیکھنا چاہتی۔ بہتر ہے کہ تم بھی اس چنڈال کی طرح یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔“ آنٹی ستارہ آگ بگولہ لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔ مریم کا رنگ سپید پڑ گیا۔ ہاتھ بھر بالکل بے جان ہو گئے تھے۔

”توبہ استغفار“ ذرا گہر والوں کی عزت کا خیال نہیں کہ کتنی مشکلوں سے وہ تم لوگوں کو پڑھا رہے ہیں اور تم جیسی بے وقوف اور جذباتی لڑکیاں، بنگی جیسی بدکردار اور ڈرامے باز لڑکیوں کے ہتھے پتا نہیں کیسے چڑھ جاتی ہیں اپنی عقل کا استعمال نہیں کرتیں، توبہ توبہ.....“ آنٹی ستارہ استہزائیہ مسکراہٹ لیوں پر سنجائے اچھی خاصی بلند آواز میں بول رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر نازو آپی اور کرن کے چہروں پر اس قدر اجنبیت اور بیگانگی تھی کہ مریم کے اپنی صفائی کیلئے بولنے والے سارے الفاظ اندر ہی دم توڑ گئے۔

”میں اس منحوس کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھی، جس نے پہلے مسلم ماؤن والے اور اب میرے ہاسٹل میں گند ڈالا ہوا تھا۔ ہر بات پر تو دھمکیوں پر اتر آتی تھی اور زبان جو اس کی چلنی تھی کیونکہ ہر ڈیپارٹمنٹ میں اس کے عاشق اور قدردان جو بیٹھے ہوئے ہیں وہ تم جیسی بے وقوف لڑکیوں کے ذریعے ان کو خوش رکھتی ہے اور اپنا مال بناتی ہے، شکر ہوا کہ وہ گندی عورت خود ہی ہاسٹل چھوڑ گئی۔“ خس کم جہاں پاک۔“ آنٹی ستارہ نے دونوں ہاتھ جھارتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا تو وہ نڈھال قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ پیچھے سے آنٹی ستارہ پھر غصے سے چیخیں تھیں۔

”کان کھول کر سن لو، کل شام تک اپنا سامان اٹھا کر یہاں سے دفع ہو جاؤ میں اس سے زیادہ تمہیں برداشت نہیں کر سکتی ورنہ کل تمہارا بوریا بستر اٹھا کر سڑک پر پھینکوا دوں گی۔“ اس کے چہرے پر اتنی وحشت، بے چارگی اور دکھ تھا کہ نازو آپی کے دل میں ہمدردی جاگ اٹھی اس کے ساتھ کارپٹ پر بیٹھے ہوئے انہوں نے آہستگی سے کہا۔ ”مریم تم نے اچھا نہیں کیا اگر سکندر شاہ جیسے کرپٹ بندے سے شادی کرنی تھی تو کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیتیں۔ پتا ہے کل بنگی آفس سے آئی تو تمہارے بھائی کچھ چیزیں دینے ہاسٹل آئے ہوئے تھے، بنگی نے ان کو بتایا کہ تم نے ان کے ساتھ کورٹ میرج کر لی ہے اور رات وہیں رہو گی۔ وہ مان ہی

”کاش‘ میرے اندر ایمن انصاری جیسا حوصلہ ہوتا لیکن مجھے موت سے بھی ڈر لگتا ہے۔“ پھر اس کے آنسو غم نہ سکے نازو آپی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئیں ان کی آنکھوں میں اس قدر دکھ، تاسف اور بے یقینی تھی۔ وہ اپنے آپ ہی پانی پانی ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ دیر رونے کے بعد اس نے اپنے بال سیٹے، ٹشو سے منہ صاف کیا اور بیک اٹھا کر کھڑی ہو گئی کرن اور نازو آپی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں ڈاکٹر عادل سے لئے کنگ ایڈورڈ کالج جاری ہوں۔ دو تین گھنٹوں میں آ جاؤں گی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی، دونوں میں سے کسی نے بھی اسے نہیں روکا تھا باہر نکلتے ہی اس نے اپنے سیل فون سے گھر فون کیا۔ اماں نے اس کی سن کر اسے بری طرح دھتکار دیا اور بابا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ان کیلئے مر گئی ہے۔ اس نے صفائی دینے کی بہت کوشش کی۔ گھر کی ملازمہ نے اسے بتایا کہ چاروں بھائی اسے قتل کرنے کے ارادے سے لاہور آ رہے ہیں، یہ سنتے ہی خوف اس کے سارے وجود میں سرایت کر گیا۔

پورے پندرہ بیس دن ہسپتال میں رہنے کے بعد اباضہ کر کے گھر شفٹ ہو گئے تھے۔ وہ ایک دم ہی بوڑھے لگنے لگے تھے۔ چمکن ان کے بوڑھے چہرے سے ہویدا تھی اور حیرت کی بات تھی کہ وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ بس سنور کے ملازم کے آنے پر سرگوشیوں میں کچھ بولتے اور پھر چپ چاپ لیٹے رہتے، جو کھانے کو آگے رکھا جاتا دل کرتا تو کھا لیتے ورنہ ویسے ہی پڑا رہتا۔

اس دن بیانے انہیں غور سے دیکھا وہ بالکل سوکھ کر ڈھانچہ ہو رہے تھے حالانکہ ایک ماہ پہلے ان کی صحت ٹھیک ٹھاک تھی، لیکن اب آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور ہاتھوں کی رگیں تک ابھری ہوئی تھیں۔ بیانے اخبار ان کے سامنے رکھا تو وہ چونک گئے اسے غور سے دیکھا اور ٹیبل سے برتن اٹھاتی ثناء بیگم سے پوچھا۔

”بچیاں کالج نہیں گئیں؟“

”وہ تو جب سے آپ بیمار ہوئے ہیں ایک دن بھی کالج نہیں گئیں۔“

”آں.....“ وہ زہری طرح ٹھٹھکے اور حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں؟“

ثناء بیگم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ”آپ کے بغیر میں کیسے بھیج سکتی تھی ان کو اکیلے

نہیں رہے، بہت جیج اور چلا رہے تھے تب پنگی نے اپنے سیل فون میں تمہاری سکندر شاہ کے ساتھ کھینچی گئی تصاویر دکھائیں جو اس قدر بے ہودہ اور فضول تھیں کہ تمہارے بھائی آپ سے باہر ہو گئے وہ تمہیں کوس رہے تھے اور مار دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔“ خوف اور پریشانی سے مریم کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اس نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا لیکن دکھ اور بے وقفی کا احساس اس قدر غالب آچکا تھا کہ سارے لفظ کھو گئے تھے۔

”مریم تم نے بہت برا کیا ہے، بہت برا میں نے باتوں باتوں میں کئی دفعہ تمہیں روکا، کبھی ٹوکا لیکن ڈائریکٹ اس لئے نہیں کہا کہ تم پنگی سے اس قدر متاثر تھیں کہ شاید میری باتوں کا کبھی یقین نہیں کرتیں، الٹا پنگی کو بتا دیتیں اور وہ میرے بھی خلاف ہو جاتی۔ اس کی دشمنی کم از کم میں افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔“ مریم کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

”حالانکہ میں نے باتوں باتوں میں کرن کو بھی سمجھایا تھا اور وہ سمجھ بھی گئی، لیکن یہ شاید کرن کی خوش قسمتی تھی کہ کرن کو پنگی زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی لیکن خیر، اب تم نے کیا سوچا ہے؟ کیونکہ آئی ستارہ تو تمہیں بالکل بھی اس ہاسٹل میں رہنے نہیں دیں گی کیونکہ تمہارے بھائی ان کو بہت برا بھلا کہہ رہے ہیں۔“ وہ اب بھی خاموشی سے بس لیوں کو کالٹے جاری تھی۔

”بولو ناں مریم؟ پلیز..... ٹائم بہت کم ہے۔“ نازو آپی بڑے ضبط سے بولی تھیں جبکہ کرن اسے نظر انداز کئے کتاب کھولے پڑھنے میں مگن تھی۔

”میں نے سکندر شاہ سے شادی نہیں کی۔“ وہ بہ مشکل بولی تھی۔

”کیا.....؟“ نازو آپی اچنبھے سے بولیں۔ کرن نے بھی کتاب ایک سائیڈ پر رکھ دی

”میں نے سکندر شاہ سے شادی نہیں کی..... مجھے پنگی باجی نے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا انہوں نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے، پتا نہیں کس چیز کا مجھ سے بدلہ لیا۔“ وہ انک انک کر بولی اور وہ دونوں جیسے سنائے میں آ گئیں۔

”پھر تم رات بھر کہاں رہیں؟ اور وہ تصویریں؟ ہاں وہ تصویریں بھی تمہارے اسی سوٹ کی تھیں۔“ نازو آپی نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا، اب وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہیں تھیں جواب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”مریم بتاؤ کیا ہوا ہے.....؟“ نازو آپی کے ضبط کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

کالج؟“

”کیا مطلب؟“ وہ ایک بار پھر الجھ گئے۔ ”میرے بغیر کیوں نہیں، میں اگر مر گیا تو تب تو سمجھو گی ناں؟“ ثناء بیگم نے تڑپ کر انہیں دیکھا انہیں حقیقتاً ان کے اس جملے سے تکلیف پہنچی تھی۔ بیانے بھی دہل کر باپ کی شکل دیکھی۔

”اللہ نہ کرے آپ ایسی فضول باتیں کیوں کرتے ہیں، اللہ آپ کو صحت دے۔“
”ہونہہ.....“ وہ استہزائیہ انداز میں منے۔ ”ساری زندگی کیلئے معذور تو ہو گیا ہوں اب کیا کر سکتا ہوں؟“

”بہر حال جو تکلیف اللہ نے مقدر میں لکھ دی ہے وہ تو مل کے رہے گی، لیکن میں بچیوں کو اکیلے کالج نہیں بھیج سکتی، خود ہی پرائیویٹ امتحان دے لیں گی۔“

”رکشا ذرا سیر اللہ بخش قابل اعتبار بندہ ہے۔“ وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولے۔
”لیکن بچیوں کے معاملے میں مجھے آپ کے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں۔“ ثناء بیگم کے بے بس لہجے پر انہوں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور عجیب سے لہجے میں کہا۔
”میری بچیاں بہت سمجھدار ہیں۔“ لفظ ”میری“ کو ثناء بیگم نے بڑی خوشگوار حیرت سے سنا، لیکن دو ٹوک لہجے میں بولیں۔

”لیکن مجھے زمانے پر اعتبار نہیں وہ جتنی بھی سمجھدار ہوں ماں باپ کے تجربے کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“ فیصلہ کن لہجے میں کہہ کر وہ الماری میں ان کے کپڑے ترتیب سے رکھنے لگیں۔

”اب میں معذور ہو گیا ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں ان کو جاہل رکھوں، میری معذوری کی سزا انہیں کیوں ملے۔“ وہ بری طرح چڑ کر بولے تھے۔ ان کی بلند آواز پر ضوبی اور فوزی گھبرا کر محسن سے اندر کمرے میں آ گئی تھیں ابا کی بلند آواز کو انہوں نے بڑی خوشگوار حیرت سے سنا تھا۔ انہیں پہلی دفعہ اپنے گھر میں زندگی کا احساس ہوا تھا۔

”امی، پلیز ابا کو غصہ دلائیں تاکہ وہ غصے میں بولیں اور ہمیں گھر میں ان کی موجودگی کا پتا چلے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم کسی اور گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“ فوزی کے بے دھڑک بولنے پر ابا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ بیا کونہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کو بہ مشکل روکا تھا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا اخبار اٹھا کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔

”آج جمال آئے گا تو اسے کہوں گا کہ اللہ بخش رکشے والے کو کہہ دے صبح سے بچیوں کو لینے آئے۔“

”لیکن میں انہیں اکیلے نہیں بھجواؤں گی۔“ ثناء بیگم ان کی بات کاٹ کر بولیں تو وہ تمللا اٹھے۔

”کیوں نہیں بھجواؤ گی؟ میں ٹانگیں توڑ دوں گا، یہ مت سمجھنا کہ میں معذور ہوں تو تمہیں اپنی من مانی کا موقع مل جائے گا۔“ ثناء بیگم نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا اور بہ مشکل ضبط کر کے بولیں۔

”آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ خدا کی قسم میرا دل نہیں مان رہا کہ ان کو اکیلے بھجوں۔“ وہ مایوس ہو کر ان کے پاس بیٹھ گئیں تو ابا کچھ دیر تو ان کی شکل دیکھتے رہے اور پھر تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

”فکرمات کرو اللہ بہتر کرے گا۔ ساری زندگی میں ان کے سر پر تو بیٹھا نہیں رہوں گا اور جو سچ بات ہے کہ مجھے اب گھڑی بھر بھی زندگی کا اعتبار نہیں۔“ ثناء بیگم نے رنجیدہ نظروں سے انہیں دیکھا، جن کو ایک حادثے نے اچھا خاصا بدل دیا تھا وہ نظریں چرا کر بولے۔

”ضوبیہ نے ایف ایس سی پارٹ دن میں بہت اچھے نمبر لیے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس کا میڈیکل کا میرٹ بن جائے گا۔ پیری خواہش ہے کہ وہ کنگ ایڈورڈ سے MBBS کرے۔“ ان چاروں نے بے اختیار چونک کر انہیں دیکھا جو سپاٹ چہرے اور سپاٹ لہجے میں پہلی دفعہ اپنی کسی خواہش کا اظہار کر چکے تھے۔ دروازے کا پٹ پکڑے گھڑی ضوبی نے بڑی خوشگوار حیرت سے ابا کو دیکھا اسے تو گمان بھی نہیں تھا کہ اس کا اچھا رزلٹ ان کو نہ صرف میاؤ تھا بلکہ وہ اس کے حوالے سے اپنے کسی خواب کی تکمیل کرنا چاہتے تھے۔ ثناء بیگم نے ایک سرد آہ بھری اور آبدیدہ لہجے میں بولیں۔

”مجھے ساری زندگی اس چیز کا افسوس رہا کہ میری وجہ سے آپ کا کیریئر تباہ ہوا اور آپ نے جیسی زندگی کے خواب دیکھے تھے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ ہوا۔ اگر ہو سکے تو آپ مجھے معاف کر دیجیے گا۔“ وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑے بے بسی سے رو رہی تھیں اور ابا ان کو خاموشی سے دیکھے بس بے دردی سے اپنے ہونٹ کچلے جا رہے تھے۔

تینوں بہنوں نے شدید حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ کوئی بات سمجھنے سے

”مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا“ اس دنیا میں آپ آخری شخص تھے جن سے مجھے امید تھی کہ آپ میرا ساتھ دیں گے لیکن.....“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی تھی ڈاکٹر عادل نے غور سے اسے دیکھا جو شدید الجھن اور ہجوان کا شکار لگ رہی تھی اسی لمحے وہ بھی ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

”ٹھیک ہے“ میں آپ سے شادی کے لئے تیار ہوں۔ میری تو خواہش تھی کہ آپ کو باعزت طریقے سے آپ کے گھر سے لے کر جاتا لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے بارے میں بدگمان ہوں کیونکہ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ مجھے شادی آپ ہی سے کرنی ہے تب نہ سہی اب سہی۔“

”اوہ.....“ مریم نے سکون بھری سانس لی لیکن وہ خاموش رہی۔
”لیکن یہ بتائیں کہ آپ کی فیملی اس فیصلے پر اور اس طرح شادی کرنے پر مزاحمت نہیں کرے گی؟“ ڈاکٹر عادل نے سارے پہلو ایک ایک کر کے اس کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا۔
”نہیں وہ مجھے بری طرح دھتکار چکے ہیں اور بابا نے کہہ دیا ہے کہ میں ان کے لئے مر گئی ہوں۔“

”لیکن کیوں؟“ ڈاکٹر عادل کو شک لگا تو وہ گڑبڑا گئی۔
”اس لئے کہ میں نے اپنے چچا کے بیٹے سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

”اوہ“ آئی سی۔“ اسے کچھ اطمینان ہوا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“
”ہم ابھی کورٹ میرج کریں گے اس کے بعد میں ہاسٹل جاؤں گی اور اپنا سامان لے آؤں گی۔“

”لیکن پھر آپ کہاں رہیں گی؟“ اسے الجھن ہوئی۔
”جہاں آپ رکھیں گے۔“ اس نے اطمینان سے کہا تو وہ الجھن بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

”مریم آپ کو پتا ہے ناں کہ میں ایک سٹوڈنٹ ہوں اور خود بھی ہاسٹل میں رہتا ہوں“ میں فی الحال کوئی فیملی انورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں اس لئے آپ فی الحال اسی ہاسٹل

قاصر تھیں۔ ثناء بیگم اونچی آواز میں رورہی تھیں جبکہ ابا اب ان کے ہاتھوں کو نرمی سے پکڑے سہلا رہے تھے۔ ان تینوں کیلئے یہ منظر اس قدر عجیب اور حیران کن تھا وہ ٹکر ٹکران کو دیکھے جارہی تھیں۔

* * *

مال روڈ پر بنے اس چھوٹے سے ریسٹوران میں ایک کونے میں رکھی ٹیبل کے گرد پڑی کرسیوں پر ڈاکٹر عادل اور مریم آئے سامنے تھے۔ ”مریم کے چہرے پر اس وقت بے حساب وحشت اور بے بسی تھی وہ سپاٹ لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔
”آپ نے کہا تھا ناں کہ مریم آپ جس وقت جس جگہ کہیں گی میں آپ سے شادی کر لوں گا۔“

”ہاں.....“ ڈاکٹر عادل نے حیرانی سے جواب دیا وہ ابھی تک الجھن میں تھا کہ مریم کیسے اسے ڈھونڈتی کنگ ایڈورڈ کالج تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اسے اپنے سامنے پا کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ وہ بے حد تلکبے حلیے میں، سوچی آنکھوں سمیت کسی طور پر بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اپنے دوستوں سے معذرت کر کے اسے لے کر اس ریسٹورانٹ میں آ گیا تھا وہ سارے راستے ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ وہ کچھ دیر جا چٹی نظروں سے ڈاکٹر عادل کو دیکھتی رہی یہاں تک کہ اسے الجھن ہونے لگی۔

”ٹھیک ہے“ آپ ابھی اور اسی وقت مجھے سے شادی کریں میں تیار ہوں۔“
”کیا.....؟“ وہ بوکھلا اٹھا ”مریم ابھی کیسے؟ میرے ماموں، ممانی ہیں میں ان سے بات کروں گا وہ تمہارے گھر جائیں گے اور طریقے سے بات کریں گے۔“
”اس کا مطلب ہے کہ آپ جھوٹ بول رہے تھے اور مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتے“ اس اوکے! آپ دوبارہ مجھ سے مت ملنے گا“ میں اپنا ہاسٹل کل تک چھوڑ دوں گی اور مجھے کسی سے رابطہ نہیں رکھنا۔ اس لئے یہ سیل فون بھی آپ رکھ لیں۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں کہتی کھڑی ہو گئی جانے کیلئے۔

”مریم آپ کا دماغ ٹھیک ہے؟ کیا ہوا ہے؟ مجھے بتائیں ہم کوئی اور بہتر حل نکال لیتے ہیں۔“ عادل کو اس کے اس قدر جذباتی ردیے پر غصہ آ گیا تھی اس نے بازو سے پکڑ کر اسے زبردستی کرسی پر بٹھایا۔

* * *

صبح ڈاکٹر عادل کی کال سے اس کی آنکھ کھلی۔ منہ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کئے وہ اپنے بھاری بھر کم بیک باہر نکال رہی تھی جب نازو آپی نے سر دلچے میں اس سے پوچھا۔

”تم خان پور جا رہی ہو؟“

”نہیں۔“

”پھر.....؟“

”میں نے ڈاکٹر عادل سے شادی کر لی ہے۔“ اس نے عام سے لہجے میں اطلاع دی جتنے بڑے چلنے سے وہ گزر چکی تھی۔ اب ہر بات اسے عام اور معمولی ہی لگ رہی تھی۔

”کیا.....؟“ تو تھ برش ہاتھ میں پڑے وہ بری طرح چٹکیں اور پھر کچھ سنبھل کر بولیں

”جہیں خان پور چلے جانا چاہئے تھا اور اپنے والدین کو تمام حقیقت بتا دیتیں تو کوئی نہ کوئی حل نکال آتا۔ والدین زیادہ دیر تک اپنے بچوں سے ناراض نہیں رہتے۔“

”میں نے کال کی تھی۔ اماں نے مجھے سختی سے حویلی آنے سے منع کر دیا تھا وہ کہہ رہی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی شخص میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا۔“ مریم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”انہوں نے اگر یہ سب کہا تو غصے میں کہا ہوگا اب اتنا تو ان کا حق بنتا ہے۔“ نازو آپی نے ان کی تائید کی۔

”ہاں لیکن میرے پاس اب کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ بس آپ میرے لئے دعا کیجئے گا میری اتنی بڑی غلطی نہیں تھی جتنی مجھے سزا ملی۔ بہر حال اللہ میرے حال پر رحم کرے۔“ اس کے رنجیدہ لہجے پر نازو آپی تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگیں اور آگے بڑھ کر اس کا سامان اٹھوانے میں مدد کرنے لگیں۔

ڈاکٹر عادل اپنے کسی دوست کی گاڑی لے کر آئے تھے دونوں نے سارا سامان اندر ٹھونسا۔ ڈاکٹر عادل نے نازو آپی کا شکریہ ادا کیا وہ سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ ”بھائی میں آپ کو زیادہ نہیں جانتی لیکن ایک بہن ہونے کی حیثیت سے ایک درخواست کروں گی کہ مریم بہت جذباتی اور بے وقوفی کی حد تک سادہ لڑکی ہے۔ زندگی کے بعض معاملات میں انسان کا کوئی

میں رہیں۔“

”میں وہاں نہیں رہ سکتی مجھے آئی ستارہ نے وارننگ دی ہے کہ میں کل شام تک ہاسٹل چھوڑ دوں۔“ اس نے غصت زدہ لہجے میں بتایا تو وہ پریشان ہو گیا۔

”لیکن کیوں؟“

”اس لئے کہ میری منیر لالہ سے فون پر اسی رشتے کی وجہ سے تو میں میں ہو گئی تھی میں نے ان سے جھوٹ بولا کہ میں نے اپنی کسی کلاس فیلو کے ساتھ کورٹ میرج کر لی ہے۔ وہ کل ہاسٹل میں خوب ہنگامہ کر کے گئے ہیں جس کی وجہ سے آئی ستارہ بہت غصے میں ہیں اور بھائی لوگ مجھے پاگلوں کی طرح پورے شہر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“ اس نے آدھا جج اور آدھا جھوٹ بتایا۔

”اوہ مائی گاڈ!“ پریشانی سے ڈاکٹر عادل نے اپنا سر تھام لیا۔ ”مریم مجھے تم سے اتنی بڑی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی..... پھر اپنی فیل کی ساتھ بگاڑنے کی کیا تک نفی ہے؟“

”آپ پریشان نہ ہوں ہم کوئی چھوٹا موٹا کرائے کا گھر دیکھ لیتے ہیں۔ میرے اکاؤنٹ میں بابائے ابھی خاصی رقم جمع کروا رکھی ہے ڈیڑھ دو سال تو ہم آسانی سے گھر بیٹھے کھا سکتے ہیں۔“ مریم کی بات پر ڈاکٹر عادل کے چہرے پر کچھ سکون کے تاثرات نمودار ہوئے۔

”اٹس اوکے“ اب بھگتنا تو پڑے گا۔ میں ذرا ایک دو دوستوں سے بات کر لوں تم آرام سے چائے پیو۔“ وہ اپنا سیل فون اٹھائے ریٹورنٹ سے باہر نکل گیا اور پندرہ منٹ کے بعد واپس آیا تو سارے انتظامات کر چکا تھا۔

اسی شام عادل کے ایک دوست کے گھر جو ہر ٹاؤن میں ان کا چند لوگوں کی موجودگی میں نکاح ہوا اور رات تک عادل اور اس کے ایک دوست نے بھاگ دوڑ کر کے ماڈل ٹاؤن میں ایک ہاسٹل میں اس کا انتظام کروا دیا تھا۔ عادل نے تسلی کروائی تھی کہ دس پندرہ دنوں میں وہ کسی چھوٹے موٹے گھر کا انتظام بھی کر لے گا۔ رات کو اپنے ہاسٹل میں واپس آنے تک وہ خاصی مطمئن ہو چکی تھی۔ وہیں جا کر اسے معلوم ہوا کہ بچی اپنا سارا سامان لے کر ہاسٹل ہمیشہ کیلئے چھوڑ چکی ہے۔ اس نے بھی خاموشی سے اپنا سارا سامان سینٹا شروع کر دیا۔ کرن اور نازو نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا اور ان کا اس طرح اسے نظر انداز کرنا بہت اذیت دے رہا تھا ساری پیکنگ کرنے کے بعد اس نے کبل اوڑھا اور سو گئی۔

دوش نہیں ہوتا اور وہ خود بخود اس سے ہو جاتے ہیں آپ اس کے کسی جذباتی قدم کی اسے بہت سخت سزا مت دیجئے گا، کیونکہ اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔“ مریم کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں دل دکھ سے بوجھل تو پہلے ہی تھا۔

نئے ہاسٹل میں جا کر تو وہ بوکھلا گئی، وہ خاصا گندا اور چھوٹا سا تھا اوپر سے ہر کمرے میں لڑکیاں زبردستی ٹھوسی ہوئی تھیں۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ عادل کو فون کر کے دھواں دھار رو رہی تھی، جبکہ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے سب کچھ اچانک اور آنا فانا ہوا تھا۔

اس کے بعد تکلیفوں اور پریشانوں نے تو گویا ان دونوں کا دامن تھام لیا تھا۔ ڈاکٹر عادل کے ہاسٹل میں چھاپا پڑا تھا اور پولیس نے اس کے کمرے سے اسلحہ اور ہیروئن برآمد کی تھی۔ وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ یہ اس کے خلاف کوئی سازش ہے۔ مگر اعلیٰ حکام اس کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ مریم نے اپنے ایک دو سینئر کلاس فیوز سے بات کی۔ عادل کے دوست بھی اس کیلئے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ وہ پولیس کی حراست میں تھا۔ مریم کی رات کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ مریم اپنی جمع پونجی بے دردی سے اس پر خرچ کر رہی تھی۔ ایک مہینے کے بعد وہ باہر آیا تو معلوم ہوا کہ اس سارے قصے کے پیچھے سکندر شاہ کے بندوں کا ہاتھ تھا جو مریم سے اس کی شادی کے بعد پاگل ہوا پھر رہا تھا اور اب تو ڈاکٹر عادل کو بھی اندازہ ہو گیا تھا۔

ڈیڑھ ماہ کے بعد مریم نے اسے دیکھا تو اس کا دل دھک کر رہ گیا وہ خاصا کمزور، کمزور اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ وہ ٹیبل پر سر رکھے حقیقتاً رو رہا تھا اس کا سارا تعلیمی کیریئر ختم ہو گیا تھا۔ اسے ہاسٹل میں ناجائز اسلحہ سپلائی کرنے کے جرم میں کالج سے نکال دیا گیا تھا اور اس کے پچھلے سارے میڈیکل کے رزلٹ کینسل کر دیئے گئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح کبھی وی سی اور کبھی اعلیٰ حکام کے پیچھے بھاگ رہا تھا، لیکن اس کی کہیں بھی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ مریم بے بسی سے اسے روتا دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر بننا اس کا خواب تھا جو تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ کبھی غصے میں سکندر شاہ اور کبھی انتظامیہ کو گالیاں دینے لگتا۔

ایک ہفتے بعد وہ آیا تو خاصا ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے مریم کو کہا کہ اس نے اندرون شہر لاہور

میں ایک کمرے کا گھر کرائے پر لے لیا ہے کیونکہ اسے ہاسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کے ماموں اس سے بہت ناراض تھے اور کوئی بھی اس کا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مریمؑ اس گھر میں لے آیا۔ خود سارا سارا دن نوکری کی تلاش میں باہر رہتا۔ انہیں دنوں وہ امید سے تھی جب ایک روز وہ گھر آیا تو اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اس نے آتے ہی مریم کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا، وہ اسے بے دردی سے مار رہا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ بولا، بکواس کی۔ میں تمہیں شکل سے اتنا بے وقوف اور مدعا لگتا ہوں تم ایک بدکردار لڑکی ہو جو میرے کسی گناہ کی سزا ہو، میں تمہیں مار دوں گا۔“ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا، کئے اور ٹھنڈوں کا بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔

وہ مجھے آج مارکیٹ میں ملی تھی میرے اوپر ہنس رہی تھی، فخرے کس رہی تھی۔ سمجھتی ہو گی کہ اس سے بڑا بے وقوف دنیا میں کہیں نہیں جو ایک آبرو باختہ لڑکی کو سنبھالے پھر رہا ہے اور میں اتنا بڑا پاگل، تمہاری ہر بات کا یقین کرتا رہا۔ غیرت مند تھے تمہارے بھائی جو تمہاری شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔“ وہ غصے سے کانپ رہا تھا جبکہ مریم ہاتھ باندھے اس سے معافیاں مانگ رہی تھی جبکہ وہ ایک بھی لفظ سننے کو تیار نہیں تھا۔

وہ مار مار کے تھک گیا۔ وہ بے ہوش گئی تھی آس پاس سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک دو خواتین بہ مشکل کھینٹ کر اسے ایک کلینک تک لے کر گئیں اس کا مس کیرج ہو گیا تھا۔ رات کو وہ واپس آیا تو کافی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ایک پڑوسن نے اسے بری خبر سنائی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی تو مریم اس کے پاؤں پکڑے بے دردی سے رو رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر گومڑ نکل آیا تھا جبکہ نیچے والا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔ اس کے بازوؤں پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھتا رہا جو ہچکچوں میں اس رات کا واقعہ سنا رہی تھی اور اپنے ناکردہ گناہ کی معافیاں مانگ رہی تھی۔ اس کی شکل پر اس قدر پچھارگی طاری تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکا، لیکن وہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اس کا کیریئر، اس کا مستقبل، اعتماد مان سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اس کیلئے دنیا میں کوئی کشش نہیں تھی۔ دو دن تو وہ بند کمرے میں لیٹا بس سگریٹ پھونکتا رہا یا سوچ و بچار میں گم رہتا۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے سارا سامان سمیٹا، اسے برقع لا کر دیا اور

”ہزار دفعہ کہا ہے بچوں کو دروازے تک مت بھیجا کرو۔ ذرا دیکھو کون آیا ہے؟“ ابا اپنے کمرے میں غصے سے بڑبڑا رہے تھے مریم بیگم ہڑبڑا کر دروازے تک پہنچیں تو بیا حواس باختہ سی کھڑی تھی۔ کھلے دروازے سے ایک شاندار گاڑی اور بیا کی بی عمر کی ایک لڑکی دور سے نظر آرہی تھی۔

”بیا! بچی کو اندر آنے کا راستہ دو۔“ انہوں نے قدرے سخت لہجے میں کہا تو وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئی، جبکہ مریم ان کو بیشک کا راستہ دکھا رہی تھیں۔ بیا کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ شمر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

”مردمت! میں نے بابا کو سختی سے منع کر دیا ہے وہ تمہاری آمد کا اکل کے سامنے ذکر نہیں کریں گے۔“

”تم آئی کیوں ہو؟“ اس نے دانت کچا کر کہا۔

”بابا زبردستی لے کر آئے ہیں اصل میں، میں ان کے سامنے تمہارے ابا کے ایک سیڈنٹ کا ذکر کر بیٹھی تھی۔ وہ اور ہارون بھیا ایک دفعہ انہیں ہسپتال بھی دیکھنے گئے تھے، لیکن ان کا کرا تبدیل ہو چکا تھا۔“ وہ شرمندہ شرمندہ لہجے میں اپنی صفائی دے رہی تھی۔ بیا نے ٹھنڈی سانس بھری اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ابا کی ڈانٹ کیلئے ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔ امی کے کہنے پر وہ چائے بنا کر اندر آئی تو اندر کا خوشگوار ماحول دیکھ کر دروازے پر ہی ٹھک گئی۔ اس نے بے یقینی سے ابا کو دیکھا جو بڑے خوشگوار انداز میں شمر کے والد کے ساتھ جو گفتگو تھے جبکہ شمر امی اور فوزی کے ساتھ بیٹھی تھی جبکہ صوبی رات کے کھانے میں مصروف تھی کچن میں۔

اس نے شمر کے بابا کو سلام کیا تو وہ چونک گئے اور پاس بلا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے پیار سے حال احوال پوچھا، اس نے کن انکھیوں سے بابا کو دیکھا جو چہرے پر مسکراہٹ سجائے اب چائے پی رہے تھے۔

”ماشاء اللہ آپ کی تینوں بچیاں ہی ذہین اور محنتی ہیں، شمر اکثر ان کا گھر میں ذکر کرتی ہے۔“ وہ بڑے شفقت بھرے انداز میں بولے تھے۔

”ظاہر ہے، بیٹیاں کس کی ہیں؟ باپ بھی خاصا ذہین تھا۔ بس قسمت کے الٹ پھیر میں آگیا۔ ورنہ ایک بہت قابل سرجن ہوتا۔“ ابا ہنستے ہوئے بولے تھے۔ امی نے چونک کر انہیں دیکھا آج ان کا لہجہ کسی بھی طہر سے پاک تھا۔

اسے لے کر پنڈی میں اپنے ایک دوست کے پاس آگیا۔ وہیں ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا اور خود ایک میڈیکل سٹور میں نوکری کر لی۔

جس دن وہ ڈیپرس ہوتا اس دن مریم کو گالیاں دیتا، کوستا جس کی وجہ سے اس کا سارا کیریئر ختم ہو گیا تھا۔ شادی کے چار سال بعد ٹوبہ پیدا ہوئی تو اس نے آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا۔ مریم کا پورا نام شام مریم تھا وہ اسے شام کہتا تھا، کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ مریم کہنے سے ساری تلخ یادیں اس کے ذہن میں ابھر آتی ہیں اور پھر صوبہ پیدا ہوئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ اس نے مریم پر بے تحاشا پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اڑھائی سال پہلے وہ خان پور گیا تو اس کے ماموں نے اسے دھکار کر نکال دیا تھا جبکہ اس کے سسکے ماں باپ معاشی لحاظ سے کمزور تھے اور پھر ڈھیر سارے بچوں کی موجودگی میں انہیں اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی، مایوس ہو کر وہ پنڈی واپس لوٹ آیا اور جب فوزیہ پیدا ہوئی تو وہ مکمل طور پر ڈھمکے گیا۔

اس نے ہومیو پیتھک کا کورس کر کے اپنا کلینک کھول لیا تھا، لیکن وہ چلا نہیں پھر ایک دوست کے مشورے پر اس نے لاہور شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ پورے پانچ سال کے بعد وہ لاہور آیا تو اس کے زخموں کے ٹانکے ادھر گئے پتا نہیں یہاں آ کر غصہ کیوں زیادہ آنے لگا تھا حالانکہ اس کا میڈیکل سٹور اور کلینک خاصا چل رہا تھا اور اب تو اس نے اپنا گھریک خرید لیا تھا، لیکن مریم کی شکل دیکھتے ہی اسے یاد آنے لگتا کہ اس نے کس طرح اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اور اتنی بڑی حقیقت چھپا کر اسے شادی پر مجبور کیا۔ وہ اسے کوستا، برا بھلا کہتا لیکن وہ خاموشی اور صبر سے اپنا کام کئے جاتی اور پلٹ کر جواب تک نہ دیتی۔ کبھی کبھی تو اسے مریم کی خاموشی پر مزید تاؤ آنے لگتا اور وہ غصے سے مزید بولنے لگتا حتیٰ کہ بیٹیاں تک زہر لگنے لگتیں، اسے بیٹے کی بہت خواہش تھی، لیکن وہ بھی پوری نہ ہوئی۔ ان تمام محرومیوں نے اسے خاصا چڑچڑا کر دیا تھا۔

* * *

وہ تینوں کافی دنوں سے کالج نہیں آ رہی تھیں۔ ٹھگ آ کر شمر ایک دن اپنے بابا کے ساتھ شام کو گھر آدھمکی۔ دروازہ بیانے ہی کھولا تھا اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ ابا جھپٹے دو دنوں سے خاصے چڑچڑے سے ہو رہے تھے۔

”ارے چھوڑیں عادل مرزا صاحب! اس میں بھی پتا نہیں اللہ کی کیا مصلحت ہوگی ورنہ لب بام آ کر تو کوئی واپس نہیں جاتا۔ اگر آپ کے گھریلو حالات اچانک نہ بگڑتے تو آپ بھی MBBS کر لیتے، اب یہ اللہ کے کام ہیں اور اس کی مصلحتیں وہ ہی جانے۔“ وہ بڑے ہلکے ہلکے انداز میں ابا کو تسلی دے رہے تھے۔

”اب مجھے دیکھیں، بچپن ہی سے انجینئرنگ کا شوق تھا۔ میرے والد نے زبردستی کامرس سائنس پر بھیج دیا جو تے مار مار کر MBA کروایا اور بزنس میں کھپا دیا۔ ساری زندگی بہن بھائیوں کو پڑھایا میں نے اور آخر میں شادی کی، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بیوی اچھی مل گئی اور آگے سے اولاد بھی نیک ہے۔ بیٹے نے میرے شوق کی خاطر انجینئرنگ کی حالانکہ اسے میڈیکل پسند تھا اور اب اچھی جاب کر رہا ہے اور بیٹی اپنے شوق سے آرٹس پڑھ رہی ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں اپنی زندگی کی ساری داستان سنا گئے تھے۔ ابا بہت غور سے ان کی باتیں سن رہے تھے وہ ایک گھنٹے کیلئے آئے تھے، لیکن ابا کے بے حد اصرار پر نہ صرف چار گھنٹے بیٹھے تھے بلکہ رات کا کھانا بھی کھا کر گئے۔

ان کے جانے کے بعد ابا کا موڈ خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ انہوں نے بیا سے خصوصی فرمائش کر کے الاچھی والی چائے بنوائی تھی اور امی کی مدد سے وضو کر کے عشاء کی نماز بھی پڑھی تھی۔ وہ اب خاصے پرسکون ہو کر سوئے تھے آج کافی دنوں کے بعد بیا نے اپنی ماں کو کچھ مطمئن دیکھا تھا۔

* * *

وہ جاتی سردیوں کے دن تھے، لیکن موسم خاصا خوشگوار تھا۔ مریم نے سرمئی غبار چڑھے آسمان کو دیکھتے ہوئے کچن میں چولہے پر چائے کا پانی رکھا۔ آج کافی دنوں کے بعد بچیاں کالج گئی تھیں اس لئے وہ دونوں بھی گھر میں اکیلے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میڈیکل سٹور سے ملازم جمال کچھ حساب کتاب کرنے کیلئے گھر آیا تھا۔ عادل کو اس پر خاصا اعتبار تھا، وہ تھا بھی بہت ایماندار اور محنتی اس نے آج کل سارا سٹور سنبھالا ہوا تھا۔ رات کو شمر کے بابا نے ان کو وٹیل چیئر کا مشورہ دیا تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے صبح فون کر کے کچھ مشورے بھی دیئے تھے۔

انہوں نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا عادل اخبار پڑھ رہے تھے۔ جب باہر

کے دروازے پر تیل ہوئی۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

”مریم باہر دیکھو کون آیا ہے؟“ وہ بری طرح ٹھنکیں اور چوٹک کر انہیں دیکھا۔ آج پتا نہیں کتنے سالوں کے بعد انہیں مریم کے نام سے پکارا تھا۔ ان کا دل بری طرح دھڑکا تھا، کن آنکھوں سے انہیں دیکھا جو اخبار کی طرف متوجہ تھے۔

وہ خاموشی سے دروازہ کھولنے گئیں تو باہر ڈاکٹر ریان کا نام سن کر وہ رک گئیں اور سوالیہ انداز سے عادل کو دیکھا تو وہ حیرانی سے پوچھنے لگے ”کیا ہوا؟ کون ہے؟“

”ڈاکٹر ریان ہیں۔“

”اچھا.....؟“ ان کو خوشگوار حیرات ہوئی۔ ”دروازہ کھولو بلکہ ادھر میرے پاس ہی بیج دو۔“ مریم بیگم نے مڑ کر ان کو حیرت اور بے یقینی سے دیکھا اور دروازہ کھول کر اندر آنے کو کہا یہ نوجوان ان کو شروع دن سے ہی بہت اچھا اور اپنا اپنا لگا تھا اور اس نے عادل کا خصوصی خیال رکھا تھا۔ عادل گھر آ کر بھی وقتاً فوقتاً اسے یاد کرتے تھے۔

”سر بہت مشکل سے آپ کا ایڈریس ڈھونڈ ڈھاڑ کر یہاں پہنچا ہوں۔ اتفاق سے آپ کے میڈیکل سٹور کا پتا ذہن میں محفوظ تھا۔ وہاں آپ کے ملازم نے دوسرے ملازم کے ساتھ یہاں بھیج دیا۔“ وہ بڑے بے تکلف انداز میں ان سے مخاطب تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں چائے کے کپ اور بسکٹ رکھ کر اندر آئیں تو عادل بڑی خوشی سے انہیں بتانے لگے۔

”مریم! تمہیں پتا ہے کہ ریان نے کنگ ایڈورڈ سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی ہے اور اس کا تعلق بھی خان پور سے ہے۔“ وہ بری طرح ٹھنکیں ایک لمحے کو ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔

”بنا کس علاقے سے تعلق ہے آپ کا؟“ انہوں نے جھکتے ہوئے پوچھا۔

”حسین آباد۔“ وہ سرسری لہجے میں بولا جبکہ مریم کی سانس رک گئی۔ عادل نے بھی گھبرا کر اسے غور سے دیکھا جبکہ وہ ان کی حیرت سے بے نیاز بیٹا رہا تھا۔

”اہل میں حسین آباد کا نام میرے دادا کے نام پر ہے ان کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے علاقے کی ہر دل عزیز شخصیت تھے اور سیاسی لحاظ سے بھی ان کی حیثیت اپنے علاقے میں خاصی مستحکم تھی اب میرے بابا نے ان کی سیٹ کو سنبھال رکھا ہے۔“

مریم کی ٹانگوں سے جان نکل گئی تھی۔ انہوں نے فوراً دیوار کا سہارا لیا ایک انتہائی

”بیٹا آپ کی کوئی پھوپھی نہیں ہیں؟“ مریم کے منہ سے پھسلا تو اس کے چہرے پر سایہ دوڑ گیا۔ وہ کچھ لمحے کے توقف کے بعد سنبھل کر بولا۔

”ایک تھیں لیکن انہوں نے شاید گھر والوں کی مرضی کے برعکس اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کر لی تھی جس کی وجہ سے ابی اور چچا لوگوں نے ان کا بایکاٹ کر دیا تھا پھر کافی سالوں بعد ان کی کسی دوست نے فون کر کے بابا کو کچھ واقعات بتائے ان کے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے وہ بولڈ اسٹیپ لیا۔ اس کے بعد بابا لوگوں نے انہیں تلاش کرنے کی کافی کوشش کی لیکن ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میری بڑی اماں آج بھی ان کو یاد کر کے روتی ہیں۔“ وہ بڑی افسردگی سے بتا رہا تھا۔ مریم کا دل کٹا جا رہا تھا۔ زندگی نے ان کے ساتھ بہت جان لیوا مذاق کئے تھے جب بھی کوئی خوشی ملتی پاس ہی کوئی دکھ بھی ان کے تعاقب میں ہوتا۔ دل کی رگیں کھینچتی جا رہی تھیں اور ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ عادل کی تمام تر توجہ ان کی طرف تھی مریم کے منہ سے نکلنے والی سرد آہ پر ڈاکٹر ریان نے مڑ کر انہیں دیکھا جو کمرے میں موجود کرسیوں میں سے ایک پر انتہائی اضطرابی حالت میں بیٹھی تھیں۔ آنسو ایک لڑی کی صورت میں بہہ رہے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے اپنے سینے کو سہلا رہی تھیں۔

”آئی کیا ہوا ہے؟“ ڈاکٹر ریان فکر مندی سے اٹھ کر ان کے پاس آیا۔ ذرا سا سہارا پا کر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی جا رہی تھیں۔ عادل نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر معذوری کے احساس نے ان کو بے بس کر دیا۔

اسی وقت بیا، ضوبی اور فوزی گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئیں۔ اندر کے منظر نے ان تینوں کو یو کھلا دیا تھا۔ بیا نے اپنا کالج بیک زمین پر پھینکا اور لپک کر ماں کی طرف بھاگی۔ ماں کی بگڑتی حالت نے تینوں کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی اور ڈاکٹر ریان کی موجودگی کو بھلائے اپنے پردے سے بے نیاز اپنی ماں کے ہاتھ پاؤں سہلا رہی تھیں۔ ڈاکٹر ریان بھاگ کر جا کر گلی میں کھڑی اپنی گاڑی سے اپنا میڈیکل باکس اٹھا کر لے آئے تھے اور اب ضروری ٹریٹمنٹ دے رہے تھے۔

ضوبی کی حالت ماں کو دیکھ کر اور زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر ابا کے پتنگ پر آن بیٹھی اور اسے معلوم ہی نہیں ہوا اب کب سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی

درد ناک حقیقت سے وہ ابھی ابھی باخبر ہوئی تھیں۔ ان کے دل کی گواہی غلط نہ تھی۔ انہیں نہ جانے کیوں ریان کو دیکھ کر اپنائیت کا احساس ہوا تھا جب انہوں نے اسے آخری دفعہ دیکھا تھا تو وہ تین سال کا تھا اور اب وہ ایک مکمل مرد کا روپ دھارے ان کے سامنے تھا۔ لیکن..... بے بسی کے احساس نے ان کے دل کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔ ان کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کر عادل نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”مریم بیٹھ جاؤ۔“

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا.....؟“ اس نے بے اختیار پلٹ کر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ مریم بیگم کے دل کو کچھ ہوا۔ منیر بھائی کا یہ بیٹا ان کا بہت لاڈلہ بھتیجا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس اتفاقی ملاقات پر خوش ہوں یا بابا کے انتقال پر چیخ چیخ کر دل کی بھڑاس نکالیں۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بہ مشکل بولیں جبکہ وہ سائینڈ ٹیبل پر پڑی عادل کی میڈیکل سز اٹھا اٹھا کر چپک کر رہا تھا بلکہ ساتھ ساتھ ضروری مشورے بھی دے رہا تھا۔

”بیٹا کیا آپ اپنے ہسپتال کے ہر مریض کے گھر جا کر ایسے ہی چپک کرتے ہیں؟“ عادل نے ہلکے پھلکے لہجے میں بات تبدیل کی وہ ایک لمحے کو چونکا اور پھر ہنسنے لگا۔

”ارے نہیں سر ہر گز نہیں بغیر بلائے میں کہیں نہیں جاتا لیکن آپ کے ساتھ ہسپتال میں اچھی خاصی گپ شپ ہو گئی تھی پھر آپ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ آپ کو ڈاکٹر بہت اچھے لگتے ہیں ورنہ زیادہ تر لوگ تو ہم سے دور ہی بھاگتے ہیں اور ہم سے نہ ملنے کی دعائیں کرتے ہیں۔ آپ واحد بندے تھے جنہوں نے اتنی محبت اور اپنائیت سے بات کی اس لئے میرا دل چاہا کہ آپ سے دوبارہ ملوں۔ اگر آپ کو اچھا نہیں لگا تو آئی ایم سوری۔“ وہ شرارتی لہجے میں بولا تو عادل نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

”نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں بلکہ میرے لئے خوشی کی بات ہے کہ اب تم بغیر فیس کے اکثر مجھے چپک کرنے آ جایا کرو گے۔“

”وائے ناٹ شیور سر۔“ وہ بالکل منیر لالہ کے انداز میں ہنسا۔ مریم نے اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے بہ مشکل روکا اس کے نین نقش خصوصاً آنکھیں اور ناک بالکل منیر لالہ پر تھے جبکہ قد کاٹھ میں وہ بابا پر تھا۔

دیکھا جو اپنے باپ کی تعریف سے خاصی جھپٹی جھپٹی سی نظر آ رہی تھی جیسے اسے اس چیز کی توقع نہ ہو۔

”فوزی بیٹا! دیکھو بیا کچن میں کیا کر رہی ہے؟ دوپہر کے کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے بھائی کو کھانا لا کر دو۔“ ابا کے محبت بھرے لہجے پر فوزی بے ہوش ہوتے ہوتے بال بال بچی۔

”ارے نہیں اکل“ میں اب جاؤں گا۔ اصل میں میرے ابا ان دنوں لاہور آئے ہوئے ہیں۔ لہجے میں ان کے ساتھ ہی کزنوں کا میں تو بس آنٹی کی طرف سے کچھ تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا یہ بھی اپنا گھر ہے۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اپنے ابا کے ساتھ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ“ ہمارا گھر چھوٹا سا لیکن دل خاصا بڑا ہے۔“ ابا کی اچانک دعوت پر ڈاکٹر ریان نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ اسے اپنی منزل کافی آسان محسوس ہوئی تھی۔ وہ اپنے ابا کو بھی اپنی پسند کی لڑکی دکھانا چاہتا تھا تا کہ ہاؤس جاب کے بعد جب وہ خان پور میں جائے تو اسے کچھ تسلی رہے کیونکہ صوبہ کو دیکھتے ہی اس کا دل بغاوت پر اتر آیا تھا۔ عادل مرزا کی یہ دعوت اسے خاصی خوشی میں مبتلا کر گئی تھی۔

”ارے کیوں نہیں اکل“ موسٹ ویلکم میں انشاء اللہ رات کو ابا کے ساتھ حاضر ہوں گا اور آنٹی کو بھی دیکھ لوں گا۔ ویسے تو الحمد للہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس تھوڑا سا ذہنی دباؤ اور ٹینشن کا شکار ہیں۔ میں نے ٹرینٹ ٹو دے دیا ہے انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔“ وہ خوشگوار لہجے میں کہہ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی گہری آنکھوں کے حصار سے گھبرا کر صوبی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی گاڑی اسٹاٹ ہونے کی آواز سن کر وہ مطمئن ہو کر اندر آئی تو ابا بیا کورات کے کھانے کیلئے ہدایات دے رہے تھے اور ان تینوں کے لئے یہ بات خاصی تعجب کا باعث تھی۔

* * *

پھر رات کا منظر اس گھر کی خواتین کیلئے بہت حیرت انگیز تھا۔ مریم بیگم کی طبیعت شام تک کافی سنبھل گئی تھی، لیکن وقفے وقفے سے رونے کا سلسلہ جاری تھا۔ عادل صاحب نے بھی انہیں کچھ نہیں کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ صدمہ بھی تو خاصا گہرا تھا۔ وہ حسین صاحب کی لاڈلی بیٹی تھی، لیکن اتنے سال ان کی ناراضی کے جرم میں دوری میں کاٹ دیئے، لیکن دل کو تسلی تو تھی کہ وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں۔ یہ تو خبر ہی نہیں تھی کہ ان کی سانسوں کی ڈور تو کب کی ٹوٹ چکی۔ صبح ہی سے دل پر چھریاں چل رہی تھیں، ان کا بس

دے رہے تھے۔ بلیک چادروں میں اپنے سارے وجود کو ڈھانپنے انہیں اپنی تینوں بیٹیاں بہت معصوم اور سادہ لگی تھیں۔ انہیں لگا کہ ایک کے بجائے تین تین مریم ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی ہیں۔ بیا اور فوزی بوی ہمت اور حوصلے سے ڈاکٹر ریان کی ہدایت پر عمل کر رہی تھیں۔ تھوڑی سی دیر میں مریم بیگم ڈاکٹر ریان کے دیئے گئے انجکشن کے زیر اثر غنودگی میں چلی گئی تھیں۔

”انشاء اللہ جب یہ ہوش میں آئیں گی تو بالکل ٹھیک ہوں گی۔“ ڈاکٹر ریان کے بڑے اعتماد لہجے پر ان تینوں کے چہروں کی رنگت بحال ہوئی۔ ڈاکٹر ریان کو ذرا فرصت ملی تو وہ ان تینوں کو بغیر نقاب کے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ تینوں اپنی ماں کا پر تو تھیں اپنے باپ کے پاس ہلکی ہلکی سسکیوں میں روتی صوبی کی پرکشش آنکھیں تو وہ پہلے بھی نہیں بھلا پائے تھے۔ جس کی کشش ان کو یہاں تک لے آئی تھی، لیکن اب اس کے معصومانہ حسن کو دیکھ کر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ بیا فوراً کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ فوزی ماں کے اوپر دی گئی چادر کو خواخواہ درست کرنے لگی اور صوبی باپ کے کندھے سے سر ٹکائے اب اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

”اکل آپ جتنے بہادر ہیں آپ کی بیٹیاں اتنی ہی کم ہمت اور کم حوصلہ ہیں۔“ ڈاکٹر ریان نے بس پردہ صوبیہ کو چھیڑا جواب شرمندگی سے بازو کی پشت سے اپنا چہرہ صاف کر رہی تھی۔ عادل مرزا بے بسی سے مسکرائے۔ وہ ان کی کئی ہمتی کا سبب جانتے تھے۔ مریم بیگم سے چڑھنے کی وجہ سے انہوں نے کبھی بیٹیوں کو بھی اپنے قریب ہونے نہیں دیا تھا۔ اب زندگی میں پہلی دفعہ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ یہ ان کی بھی بیٹیاں ہیں اور احساس ندامت ان کا گھبراہٹ تمام کے بیٹھ جاتا۔ وہ اس کا مدا کرنا چاہتے تھے لیکن جس طرح مریم اور بچیاں چونک کر بے یقینی سے انہیں دیکھتیں وہ بری طرح شرمندہ ہو جاتے اب بھی وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولے۔

”نہیں میری بیٹیاں بہت بہادر ہیں۔ بس اپنے ابا کی معذوری نے انہیں کچھ پریشان کر دیا ہے ورنہ یہ بہت ہمت والی ذہین بیٹیاں ہیں اور آپ کو پتا ہے ڈاکٹر ریان ایف ایس سی پارٹ ون میں میری بیٹی صوبی کے اپنے کالج میں سب سے زیادہ نمبر تھے۔ انشاء اللہ میری بیٹی کا بھی کے ای (کنگ ایڈورڈ) میڈیکل کالج کا میرٹ بنے گا اور یہ بھی آپ کی طرح بہت اچھی ڈاکٹر بنے گی۔“ ابا کے فخریہ لہجے پر ڈاکٹر ریان نے شرارتی نظروں سے اسے

نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر حویلی پہنچ جائیں اور اماں کے گلے لگ کر خوب روئیں۔

رات کو ڈاکٹر ریان کے ساتھ منیر لالہ کو دیکھ کر انہیں تو سکتہ ہی ہو گیا۔ وہ بے یقینی سے کبھی عادل مرزا کو اور کبھی منیر لالہ کو دیکھتیں جو خاصی گرم جوشی سے ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ منیر لالہ کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ بار بار مریم بیگم کو اپنے ساتھ لگا کر گلے شکوے کر رہے تھے۔ ”بیا“ فوری اور ضوہی سب کے لئے یہ تمام چیزیں ناقابل فہم تھیں اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ریان کے والد ان کے سکے ماموں ہیں تو ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

مریم بھی اپنی زندگی کے حالات سناتے ہوئے رو پڑتیں اور کبھی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر دکھ کا اظہار کرنے لگتیں۔ وہ حد درجہ حساس اور جذباتی ہو رہی تھیں۔ منیر لالہ کبھی کسی بات پر تاسف کا اظہار کرتے اور کہیں اظہار ندامت کے طور پر چپ ہو جاتے جبکہ ان تمام باتوں کے دوران عادل مرزا بالکل خاموش تھے۔ انہوں نے مریم کو کہیں بھی نہیں روکا تھا۔ آج کئی سالوں کے بعد انہوں نے مریم کو اس طرح مسلسل بولنے دیکھا تھا اور وہ خاصی خوش بھی تھیں۔

ان تینوں بہنوں کیلئے آج کل ہر چیز ہی حیرت کا موجب بن رہی تھی۔ ڈاکٹر ریان حویلی والوں کا تعارف مکمل تفصیل سے کروا کر مزید تجسس میں ڈال رہے تھے۔ ان تینوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ایک لمحے میں اپنے نہیال پہنچ جائیں۔ ان تینوں نے آج تک اپنے والدین کے علاوہ کوئی رشتے دار بھی تو نہیں دیکھا تھا اس لئے ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ آج رات بہت سالوں کے بعد عادل مرزا کو بہت سکون کی نیند آئی تھی۔ ایک سیڈنٹ والے حادثے نے انہیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا اور معذوری نے تو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔

انہیں نہ جانے کیوں لگتا تھا کہ پچھلے بیس اکیس سالوں سے انہوں نے مریم کی زندگی کو جتنا تلخ، اذیت ناک اور دردناک بنایا ہوا تھا اللہ نے اس کی سزا کے طور پر انہیں اتنے بڑے صدمے سے دوچار کیا ہے، کیونکہ ان کے زہر آلود جملوں کے جواب میں مریم نے بہت طویل عرصے کا کڑا صبر کیا تھا اور کبھی پلٹ کر ایک لفظ بھی نہیں کہا، حالانکہ انہیں مریم سے محبت کا دعویٰ تھا، لیکن سکندر شاہ والے شرمناک واقعہ کو سن کر انہیں لگا ساری محبت بھک کر کے کہیں اڑ گئی ہے۔ حالانکہ مریم نے کئی دفعہ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کی تفصیلات سے انہیں آگاہ کیا تھا، لیکن شاید ان کی محبت کا ظرف بڑا نہیں تھا، لیکن اب ندامت اور شرمندگی نے انہیں اندر

سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ اس میں کسی کا بھی قصور نہیں تھا۔ بس سارا قسمت کا پھیر تھا، لیکن نہ جانے کیوں وہ زندگی کے حادثات کا مقابلہ جو اندری سے نہیں کر سکے تھے۔

وہ ایک بہت خوبصورت اور چمکیلی صبح تھی۔ آج عادل مرزا اپنی وہیل چیئر پر بیٹھ کر اسٹور گئے تھے جو ان کے گھر سے دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ ان کے چہرے پر ایک بہت خوبصورت اور انوکھی چمک تھی۔ مریم نے شام میں گھر میں قرآن خوانی کی تقریب کا اہتمام کیا تھا اور اڑوس پڑوس سے کافی خواتین کو مدعو کیا تھا۔

بیا کی دوست شرمج سے گھر میں تھی اور اس نے آتے ہی مریم کو بتایا تھا کہ شام کو اس کی ماما بھی قرآن خوانی کیلئے آئیں گی۔ بچیوں نے گھر کے تمام انتظامات سنبھال رکھے تھے۔ مریم خاموشی سے صحن میں بچھی دریوں سے ایک پریشی دھیمی آواز میں قرآن پاک پڑھنے میں مصروف تھیں۔ کافی خواتین آنا شروع ہو گئی تھیں۔ مریم کا ارادہ تھا کہ اس مقدس تقریب کے بعد وہ بچیوں کو لے کر کچھ دنوں کیلئے خان پور سے ہو کر آئیں گی۔ ابھی دو دن پہلے اماں اور ساری بھابھیاں ان سے مل کے گئی تھیں۔ زینت بھابی نے ڈاکٹر ریان کے لئے ضویہ کے رشتے کی بات کی تھی اور ریان نے عادل کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود ضویہ کو میڈیکل میں داخلہ دلوائے گا اور پڑھائی میں بھرپور مدد بھی کرے گا۔ عادل نے مریم کے چہرے پر پھیلی ہوئی خوشی دیکھ کر بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی تھی۔

مریم نے ایک سیپارہ پڑھ کر قرآن پاک بند کیا اور انتظامات کا جائزہ لینے کیلئے کچن کی طرف قدم بڑھائے جہاں ساری بھابھیاں مصروف تھیں، لیکن گھر کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہونے والی خاتون کو دیکھ کر وہ ٹھنک گئیں۔ سفید سوٹ میں سلیقے سے دوپٹا اوڑھے بڑے پروقار انداز میں اندر آنے والی خاتون پر انہیں ناز و آبی کا گمان ہوا تھا۔

”تھنکس گاڈ ماما آپ آگئیں۔ بیا کی امی کافی دفعہ آپ کا پوچھ چکی ہیں۔“ شرمجہا نہیں کس کو نے سے برآمد ہوئی تھی اور اب باقاعدہ شکر ادا کر رہی تھی وہ ہاتھ پکڑے انہیں اندر لا رہی تھی۔ مریم بیگم کے پاؤں زمین نے جکڑ لئے۔

”ناز و آبی.....“ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔

”سوئی.....“ وہ ایک ہل کو رکیں اور پھر خوشگوار حیرت سے بولیں ”مریم۔“

اگلے ہی لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگی خامے جذباتی انداز سے مل رہی تھیں۔ نازو آپنی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں ان کا چہرہ پکڑے بہت بے تابی سے پیار کر رہی تھیں۔

”تم کتنی بدل گئی ہو مریم“ تم ایسی تو کبھی نہیں تھیں اتنی بڑی کیسے ہو گئیں؟“ مریم نے ہنس مکھ لہجے سے انہیں دیکھا جو آج بھی ویسی ہی تھیں۔ بہت پر خلوص اور مہربان ان کا دل چاہا وہ کہیں ”میں بڑی نہیں بڑھی ہو گئی ہوں۔“ لیکن سرد آہ بھر کر بولیں۔

”وقت سب کو ایسا ہی کر دیتا ہے۔“ مریم کی آنکھوں میں نمی لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اچھا“ ثوبیہ عادل تمہاری بیٹی ہے؟“ وہ بہت پیار سے پوچھ رہی تھیں۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یا اللہ یہ آج کل ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟“ میں کہیں خوشی سے فوت ہی نہ جاؤں۔ زندگی میں پہلی دفعہ ہمارے گھر رشتے داروں کی بارش ہو رہی ہے۔ ہر روز ایک نیا رشتہ دریافت ہو جاتا ہے۔“ فوزی نے دونوں خواتین کو اس طرح ملتے ہوئے دیکھ کر خوشگوار لہجے میں کہا۔

”یا اللہ تم میری خالہ کی بیٹی ہو؟“ ثمر نے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو یمانہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”منہ دھو کے رکھو“ میری والدہ اکلوتی بہن ہیں۔“

”یہ نہ تھی ہماری قسمت.....“ ثمر نے ٹھنڈی آہ بھری تو یمانہ نے اسے دھموکا جڑا۔

کافی ساری خواتین آپچی تھیں تو قرآن خوانی کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ نازو آپنی بھی سیپارہ اٹھا کر درمی پر بیٹھ چکی تھیں۔ مریم بیگم نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ اس محفل کے اختتام پر وہ ایک دو گھنٹے رکیں گی تاکہ بہت ساری باتیں اور دکھ سکھ بانٹ جائیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا اس لئے وہ بار بار سیپارہ پڑھتے ہوئے بے دھیانی میں نازو آپنی کو دیکھنے لگتیں اور پھر سے سر جھٹک کر دوبارہ متوجہ ہو جاتیں۔

عادل مرزا جب گھر آئے تو اس وقت اس محفل کا اختتام ہو رہا تھا اور اجتماعی دعا کروائی جا رہی تھی۔ مریم بیگم بڑے خشوع و خضوع سے دعا مانگ رہی تھیں۔ ان کے ملازم نے انہیں

ان کے بستر پر لٹانے میں مدد کی۔ مریم بیگم کی آواز اندر کمرے تک آرہی تھی وہ بڑے جذب کے عالم میں رورو کر دعا کر رہی تھیں۔ پورے گھر میں ان کی آواز گونج رہی تھی عادل بے چینی کے عالم میں اٹھ بیٹھے اور آنکھیں بند کر لیں۔ دعا ختم ہو گئی تھی اب باہر سے خواتین کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”ابا آپ کے لئے کھانا لگاؤں؟“ یمانہ نے اندر جھانکتے ہوئے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”نہیں بیٹا“ دل نہیں کر رہا۔“ ان کی آواز میں ٹھنڈک تھی۔

”ابا“ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ یمانہ نے فح ہوئی رنگت سے پوچھا۔

”ہاں۔“ انہوں نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ روکنے کی کوشش کی۔

”ابا کچھ بڑی بنا دوں یا دلیر؟“ یمانہ نے اختیار ہو کر بولی۔

”ادھر آؤ بیٹا میرے پاس بیٹھو بیٹا۔“ وہ اس کی بات کو نظر انداز کئے بڑے پیار سے بولے تھے۔

”کون ابامیں.....؟“ وہ جھجک کر بولی۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ابانے اثبات

میں سر ہلادیا تو وہ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس آ بیٹھی۔

”میرا بیٹا مجھ سے ناراض ہے.....؟“ انہوں نے بہت عجیب سوال کیا تھا۔

”نہیں ابا۔“ اس نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ کر اس کا بوسہ لیا اور اپنے اس بے

اختیاری فعل پر ایک دم جھینپ گئی۔ ابا کے اندر ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ انہوں نے بھی محبت سے

اس کا ماتھا چوما تھا۔ وہ ان کی سب سے پہلی اولاد تھی، لیکن انہوں نے آج تک کسی بھی بیٹی کو

پیار سے نہیں بلایا تھا، لیکن اب اچانک محبت اور شفقت کا ان کے اندر ایک سمندر ابل پڑا تھا۔

کمرے کے اندر آتی ضوہی اور فوزی بھی ٹھٹک گئی تھیں دروازے میں ہی پھر فوزی اڑتی ہوئی

ان کے پاس پہنچی اور اگلے ہی لمحے ان کے گلے میں بازو ڈالے ان کو دیوانہ وار پیار کرنے

لگی۔ ابا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

”لیس آنٹی اندر تو بہت جذباتی سین چل رہے ہیں۔“ کمرے میں داخل ہوتی ثمر نے

پچھے مڑ کر بلند آواز میں کہا تو مریم بیگم نے بہت حیرت سے ان تینوں کو دیکھا جو باپ سے

لپٹی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں نے بار بار ایسے مناظر دیکھنے کی خواہش کی تھی، لیکن اس وقت وہ

سب بھلائے کہہ رہی تھیں۔

”بس اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری قربانیوں کا بہت اچھا اجر دیا، حالانکہ بچی میرا بہت مذاق اڑاتی تھی اور میری امی کیلئے بہت غلط الفاظ بولتی تھی، لیکن آج جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے مجھے لگتا ہے وہ میری ماں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ میری امی کہتی تھیں کہ نازیہ میری بہت مبر والی بچی ہے، اللہ اس کے ساتھ بہت اچھا کرے گا۔ اور الحمد للہ شکر کے بابا بہت اچھے اور میری قدر کرنے والے ہیں۔“

”آپ کی شادی کہاں ہوئی؟ میرا مطلب ہے کہ خاندان میں یا.....؟“ مریم نے بات ادھوری چھوڑی۔

”تمہیں پتا ہے میری شادی کس سے ہوئی؟“ انہوں نے تجسس بھرے لہجے میں کہا۔

”کہاں؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”کرن یاد ہے تمہیں؟ ہماری چوتھی ہاسٹل فیلو؟“ وہ رکیں ”اس کے بڑے بھائی سے۔“

”اچھا.....؟“ اسے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔

”ہاں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ ہی کرن کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔ وہ تو ایک دن کرن کی والدہ چکوال سے آئیں اور ہاسٹل میں ہمارے ساتھ دو دن رہیں اس عرصے میں میرا سکھڑاپے کو غور سے دیکھتی رہیں اور جاتے ہوئے میرا ایڈریس لے گئیں اور اگلے ہفتے وہ کرن کے ساتھ اوکاڑہ آئیں، بس پھر آنا فانا سب ہوا اور الحمد للہ آج میں ایک مہر پورا ازدواجی زندگی گزار رہی ہوں۔ ساری بہنیں اپنے گھروں میں سیٹ ہیں اور بھائی بلال آج کل میو ہسپتال میں جاب کر رہا ہے۔“

”اور کرن کہاں ہوتی ہے؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”کرن ماشاء اللہ سعودیہ میں اپنے تین بچوں کے ساتھ سیٹل ہے۔ کبھی پاکستان آئے اور ہاسٹل کا ذکر ہو تو تمہارا ضرور پوچھتی ہے۔ اس کی شادی اپنے ماموں زاد سے ہوئی ہے جن کی جاب سعودی عرب میں ہے۔ ہر سال بچیوں کی چھٹیوں میں پاکستان کا چکر لگاتی ہے اور ماشاء اللہ بہت خوش ہے اپنے گھر میں۔“ نازو آبا کے لہجے میں اپنی نند کے لئے ڈھیروں پیار تھا۔

”اور..... نازو آبی..... کبھی بچی باجی سے سامنا ہوا؟“ وہ پست لہجے میں بولی تو نازو

”عادل ذرا پہچانیں یہ کون ہیں؟“ مریم بیگم نے ان کی توجہ اپنے ساتھ کھڑی نازو آبی کی طرف دلوائی۔ عادل نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر بے بسی سے سرنگی میں ہلا دیا۔ وہ حقیقتاً انہیں نہیں پہچان سکے تھے اور ویسے بھی ان کے ساتھ ملاقات بھی تو خاصی سرسری سی ہوئی تھی۔

”چھوڑو مریم تم کیا پہیلیاں بھجوا رہی ہو پورے بائیس سال گزر چکے ہیں اور یہ خاصا طویل عرصہ ہوتا ہے۔“ انہوں نے بڑی متانت سے جواب دیا اور مریم بیگم کے بولنے سے پہلے ہی فوری بڑے جوش و خروش سے انہیں بتانے لگی۔

”ابا یہ شرکی والدہ اور امی کی ہاسٹل فیلو اور بہت اچھی دوست اور آپ نازیہ ہیں اور امی ان کو پیار سے نازو آبی کہتی ہیں۔“

”اوہ! ہاں یاد آیا،“ کیسی ہیں آپ؟ یہ تو بہت اچھا اتفاق ہے ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا کہ آپ شرمیٹی کی والدہ ہیں۔“ ابا کے لہجے میں غیر محسوس طریقے سے گرم جوشی آگئی تھی جبکہ نازو آبی بھی ہنستے ہوئے بولیں۔

”ہاں اب یقین آ گیا کہ دنیا گول ہے۔ انسان زندہ ہو تو کہیں نہ کہیں سے آپس میں ٹکرا ہی جاتا ہے آپ سنائیں کیسی طبیعت ہے؟“

”بس اللہ کا شکر ہے وہ جس حال میں جیسا رکھے، ہم تو اس کی رضا میں راضی ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”ابا اس وقت ہم سب آنٹی نازو اور امی کے درمیان میں ظالم سماج بن رہے ہیں۔ وہ دونوں تنہائی میں بہت سارے دکھ سکھ شیز کرنے کیلئے بے تاب ہیں۔ امی نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ وہ آنٹی کو رات دس بجے سے پہلے ہرگز نہیں جانے دیں گی۔“ ضوبی نے ہنستے ہوئے کہا تو مریم بیگم اس کے شرارتی لہجے پر اسے گھور کر رہ گئیں۔

اور پھر ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں کمرے میں تنہا تھیں۔ بچیاں اپنے ابا کے کمرے میں لڈو بچھائے کھیلنے میں مگن تھیں۔ نازو آبی بار بار محبت سے مریم کا چہرہ دیکھ رہی تھیں جو اپنی عمر سے دس سال بڑی لگ رہی تھی۔ مریم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بہت نرمی اور اپنائیت سے پوچھا۔

”بتائیں ناں نازو آبی اتنے سال کہاں رہیں؟ اور کیا؟ کیا؟ آپ کے میاں سے تو میں ملی تھی، وہ بہت ناکس اور شریف انسان ہیں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائیں اور پیار سے مریم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

آپنی کے چہرے پر ایک تاریک سایہ دوڑ گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے بولیں۔

”چندا! جو لوگ اندھا دھند آگے بڑھنے کے جنون میں راستے میں آنے والے لوگوں کو کھینچتے جائیں زندگی ان کو ڈھیل ضرور دیتی ہے، لیکن کہیں نہ کہیں جب وہ وقت کے پہنچنے کے نیچے آتے ہیں تو ان کا حشر برائیاں بہت برا اور عبرت ناک ہوتا ہے۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی تھیں، تبھی مریم نے تیزی سے ان کی بات کاٹی، شدت جذبات سے اس کا لہجہ گلوگیر ہو رہا تھا۔

”یقین کریں آپ! میں نے ایک ناکردہ گناہ کی بہت طویل سزا کاٹی ہے۔ میں نے پنکی باجی کا اعتبار کیا، لیکن اس کا نتیجہ اتنا بھیانک ہو گا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میری تو کوئی بہن نہیں تھی اور میں نے ہمیشہ ان کو بڑی بہن جیسی عزت دی لیکن.....“ وہ ان کے گلے لگی بہت بری طرح رو رہی تھی۔

”بس مریم زندگی میں کچھ لوگ کسی بھی رشتے کے قابل نہیں ہوتے وہ نہ اچھی بیٹی تھی اور نہ اچھی بہن اور نہ اچھی دوست کیونکہ جو لوگ صرف اپنے لئے جیتے ہیں ان کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی بندھ جاتی ہے، وہ صرف اپنی ذات سے پیار کرتے ہیں۔“

”کاش میں ان کی بات کا یقین نہ کرتی اور اس دن ان کے ساتھ ان کی فرینڈ کے فلیٹ میں نہ جاتی وہ سب کچھ نہ ہوتا۔“ وہ سر جھکائے بے بس لہجے میں بولی تھیں۔

”نہیں مریم کچھ لمحات زندگی میں ایسے آتے ہیں جو انسان کو بالکل بے بس اور لاچار بنا دیتے ہیں، بس اللہ ان لمحات کی آزمائش سے بچائے۔“ وہ اسے تسلی دے رہی تھیں۔

”میں نے بہت سال رو رو کر گزارے اور پھر تھک ہار کر اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ بس اللہ نے مجھے صبر دے دیا مجھے مکافات عمل پر یقین ہے۔ میں نے بیس اکیس سال اس جرم کی اذیت میں کاٹے ہیں، جس میں میری رتی برابر بھی رضا مندی نہیں تھی۔“ مریم اب بہت پرسکون لہجے میں بولی تھیں۔ نازد آپی بہت عجیب انداز میں مسکرائیں اور اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

”تمہیں معلوم ہے پنکی کے ساتھ کیا ہوا؟“

”کیا ہوا.....؟“ وہ متوحش سی ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

”اس نے ارتضیٰ خا کوئی سے شادی کر لی تھی جس کا سکندر شاہ کو بہت غصہ تھا، کیونکہ ان

دونوں کی آپس میں دشمنی تھی۔ پنکی کی عادتوں کا تو تمہیں پتا ہی ہے وہ ایک مرد پر استغنا کرنے والی نہیں تھی۔ تنگ آ کر خا کوئی نے اسے طلاق دے دی تو اس نے خا کوئی کو زچ کرنے کیلئے سکندر شاہ سے مراسم بدھانے شروع کر دیئے۔ خا کوئی اس کے اس اقدام سے پاگل ہو کر انتقام پر اتر آیا۔ اس نے دن دہاڑے پنکی کے چہرے پر تیزاب پھونکوا دیا۔ اللہ معافی دے پنکی کی شکل اور جسم بگڑ کر رہ گیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ وہ اپنی اسکن کے بارے میں کس قدر کونشس تھی وہ جب بھی ہوش میں آتی آئینہ دیکھ کر زور زور سے چیخیں مارتی اور بے ہوش ہو جاتی۔ اس کے چہرے کا سارا گوشت گل گیا تھا۔ اس کے گھر والوں نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ظاہر ہے جب اس نے کبھی گھر والوں کا خیال نہیں کیا تو پھر وہ اسے کیسے پوچھتے۔ کافی عرصہ اسلام آباد ہسپتال میں رہی، اس کے سارے قدر دان اڑن چھو ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اس کی ذہنی حالت بھی خاصی خراب ہو گئی تھی اور پھر پتا چلا کہ ہسپتال میں ہی دو کرچن جمداروں نے ایک رات اس کے ساتھ زبردستی زیادتی کی جس سے اس کا دماغ الٹ گیا۔ آج کل ذہنی معذوروں کے ہسپتال میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی ہے۔ بس اللہ معاف کرے اور اس کے حال پر رحم کرے۔“ نازد آپی نے خوف سے جھرجھری لی۔

مریم کے آنسو حیرت سے منجمد ہو گئے اور جسم پر کچھ ٹھنڈی طاری ہو گئی وہ اس قدر بھیانک انجام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”وہ مائی گاڈ!“ مریم نے سرد آہ بھری اور آسمان کی طرف دیکھا اور بے اختیار سوچا۔

”واقعی خدا کی لاشی بے آواز ہے۔ اللہ اس پر رحم کرے۔“ مریم کے دل سے آواز نکلی اسے حقیقتاً سن کر بہت خوف محسوس ہوا تھا اور ان کے ایسے انجام کے بارے میں انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنے دل کے اندر انہیں معاف کر دینے کا حوصلہ نہیں کر پاتی تھیں۔

”اور مریم تمہیں پتا ہے کہ آنٹی ستارہ کے بھائی نے جو ان سے چھوٹے تھے زبردستی بہنوں کی مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ خاصی اچھی اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے، جبکہ آنٹی ستارہ کی ڈیڑھ ہو گئی تھی اور باقی دونوں بہنیں اب تنہائی کی اذیت کے ساتھ انتہائی غیر فطری زندگی گزار رہی ہیں۔ اللہ معافی دے لوگ اپنے خود ساختہ رواجوں کے تحت اسلامی قوانین سے انحراف کر کے جب زندگی گزارتے ہیں تو ان کا انجام بہت برا ہوتا

ادھوری باتوں سے بہت کچھ سمجھ چکی تھیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں اس کی دائمی خوشیوں کیلئے خصوصی دعا کی تھی اور مزید کچھ بولنے اور پوچھنے سے احتراز کیا تھا۔

”اور بچیوں کی کہیں بات چیت طے کی؟ ماشاء اللہ تینوں ہی پیاری ہیں۔“ نازو آپی نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کو پلٹا تو مریم ان کی اس حرکت پر مسکرا دیں۔

”ہاں، صوبیہ کے لئے منیر لالہ نے بات کی ہے۔“ انہوں نے سرسری بات کی۔

”بس بیا کے لئے جب نو چو میرے ہارون کو ضرور نظر میں رکھنا ماشاء اللہ بہت محتف اور

فرمانبردار بچہ ہے۔“ نازو آپی کے لہجے میں اپنے بیٹے کیلئے پیار ہی پیار تھا۔

”کیوں نہیں آپی میرے لئے تو یہ اعزاز کی بات ہوگی۔“ مریم کو حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔

ہارون کو انہوں نے ہسپتال میں دیکھا تھا۔ خاصا اسارٹ اور ڈے دار لگا تھا انہیں، کمرے کے اندر کسی کام سے آتی بیا کے پاؤں وہیں ٹھہر گئے تھے۔ اپنی ماں کے جواب نے اس کے دل میں کئی پھول کھلا دیئے تھے۔ طمانیت اور سرشاری کے رنگ اس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔

* * *

اس دن موسم خاصا خوبصورت تھا۔

آسمان پر سرمئی بادلوں نے ڈیرا لگا رکھا تھا۔ ہوا میں بھی نمی کا عنصر بڑھ گیا تھا مریم کو اپنے اس نئے گھر میں شفٹ ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا اور یہاں سے عادل کا میڈیکل سنٹر صرف دو تین منٹ کی مسافت پر تھا۔ اس گھر کے پہلے مکین شاید پودوں اور پھولوں کے خاصے دیوانے تھے۔ الماس کے زرد پھولوں نے سامنے محن والی دیوار کو ڈھانپ رکھا تھا جبکہ نیچے مریم نے ترتیب سے ڈھیر سارے گلے رکھے ہوئے تھے۔ باہر شاید ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی تھی۔

عادل مرزا نے اپنے کمرے کی محن کی طرف کھٹنے والی کھڑکی کھولی تو چنبیلی کی خوشبو دے

پاؤں اندر چلی آئی۔

بچیاں کالج گئی ہوئی تھیں اور عادل آج گھر میں ہی تھے۔ ڈاکٹر ریان نے ’میل چیک اپ کیلئے آنا تھا اور اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھولے مریم ہاتھ میں چائے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئیں، بیٹکی ہوا کا ایک جھونکا بھی ساتھ ہی چلا آیا تھا۔ عادل نے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو کتاب پر سے آنکھیں اٹھائیں اور غور سے دیکھا۔ وقت نے اپنے نقش چھوڑے تو تھے، لیکن چہرے کی پاکیزگی اور تازگی ابھی بھی باقی تھی البتہ جھریوں کا

ہے۔ دونوں بہنیں موت کے سرہانے ہیں اور کوئی ان کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ ڈالنے والا بھی نہیں جبکہ بھائی کی غیر برادری میں شادی کو گناہ سمجھ کر وہ اس سے تعلق جوڑنے کیلئے راضی نہیں۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں ستارہ ہاسٹل کے مالکان کے حالات زندگی پر روشنی ڈال رہی تھیں اور پھر بولتے بولتے وہ رکیں اور کھوجتے لہجے میں دریافت کیا۔

”مریم تم بتاؤ زندگی کے مدد و سال کیسے گزارے؟“

”بس نازو آپی گزر گئے۔“ مریم کا لہجہ گہرے دکھ اور رنج میں ڈوبا ہوا تھا۔ نازو آپی

نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”کوئی خاص مطلب نہیں۔“ بے پروائی سے چائے کے گم کو کھتے ہوئے جواب دیا اور پھر ان کی گہری نظروں کے ارتکاز سے گزبڑا کر بولیں۔

”بہت سارے سال اپنی بے توفیوں پر افسوس کرتے اور باقی ان ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتے گزر گئے۔“

”اور عادل مرزا تمہارے ساتھ کیسے رہے؟ انہیں تو تم سے خاصی محبت تھی۔ تمہارا تو خوب پیچھا کرتے تھے اور میڈیکل کی ٹیٹ اسٹڈی کے باوجود ہر جگہ پہنچے ہوتے تھے۔ پھر انہوں نے تمہارا اس موقع پر ساتھ دیا، جب سب لوگ تمہیں چھوڑ گئے تھے۔“ نازو آپی کے لہجے میں عادل مرزا کے عقیدت کے رنگ تھے۔ مریم کی بات سن کر پھسکی ہنسی ہنسی اور جب بولیں تو ان کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔

”نازو آپی! مردوں کی محبت کے رنگ بھی عجیب ہوتے ہیں وقت کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، جس طرح مرد اپنی عورت کے معاملے میں اعلیٰ ظرف نہیں ہوتا۔ اس طرح اس کی محبت کا دامن بھی خاصا تنگ ہوتا ہے اور جس عورت پر اسے شک ہو جائے اسے وہ محبت تو دیتا ہے، لیکن عزت نہیں حالانکہ عورت کے لئے محبت سے زیادہ عزت قیمتی شے ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ عادل بہت اچھے ہیں اور مجھے اتنے سال انہوں نے برداشت کیا، جبکہ میرے دامن پر اتنا بڑا داغ بھی لگ چکا تھا۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ان کی مجبوری تھی یا پھر دل کے کہیں کونے میں چھپی چاہت کی چنگاری، لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ ٹھن اور اذیت کے موسم میرے گھر کے آنگن سے رخصت ہو چکے ہیں۔“ نازو آپی اس کی مبہم اور

اضافہ ہو گیا تھا اور رنگ بھی کچھ ماند پڑ گیا تھا۔

”مریم.....“ انہوں نے بہت عرصے بعد اس طرح اتنے پیار اور اپنائیت سے مخاطب کیا تھا۔

”جی.....“ وہ بے اختیار چوکی تھیں۔

”ادھر آؤ، بیٹھو میرے پاس۔“ انہوں نے اپنے بیڈ کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے نا سنجی کے عالم میں انہیں دیکھا۔ اگرچہ ان کا بدلا ہوا رویہ انہیں چونکا تا نہیں تھا، لیکن اس قدر اہمیت کا ابھی دل عادی بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ کچھ جھپکتے ہوئے خالی کردہ جگہ پر آن بیٹھیں۔

”کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو مومو؟“ عادل نے انہیں دونوں شانوں سے تھاما۔

”بولو ناں مریم، تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ انہوں نے پوچھا تو مریم نے اثبات میں

سر ہلا دیا۔

”مریم!“ ان کے لب کپکپائے اور انہوں نے نرمی سے اسے اپنے پاس کیا اور مریم کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ”مجھے معاف کر دیتا“ میں اپنی محبت کا ظرف وسیع نہیں کر سکا۔ میں نے بہت کوشش کی، لیکن یقین کرو مومو میری محبت اتنی کمزور نہیں تھی اگر تم مجھے سب کچھ بتا دیتیں، میں تب بھی تم سے شادی کرتا، لیکن یہ احساس مجھے اندر سے جینے نہیں دیتا تھا کہ تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی، مجھ پر اعتبار نہیں کیا اور پھر یہ سوچ مجھے اور زہر آلود کر دیتی تھی کہ اگر مجھے اتفاقی طور پر نہ پتا چلتا تو کیا ساری زندگی تم مجھے نہ بتا تیں۔“

”نہن..... نہیں عادل میں مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ ان دنوں آپ اپنی جاب اور میڈیکل کالج سے ٹرمینٹ ہو جانے کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ میں آپ کو مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔“ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ ”لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ اس طرح مجھ سے بدگمان ہو جائیں گے اور.....“ وہ اب بے آواز رو رہی تھی۔

”سوری یار! آئی ایم سوری، تم تو میری زندگی ہو، کائنات ہو، بس مجھے معاف کر دو۔“

وہ سرگوشی میں بولے اور مریم کے ماتھے پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے۔ وہ پتھر کی مورت بنی ساکت رہ گئیں۔ انہیں لگا کہ پچھلے اکیس سالوں کی ساری اذیت ختم ہو گئی ہو۔ دل ایک دم سے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ مریم کو لگا کہ اللہ نے ان کے صبر کا بہت اچھا صلہ دیا اور ”نارسانی“ کو

ان کا مقدر نہیں بنایا اور واقعی جو اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں اللہ انہیں بہترین اجر دیتا ہے۔

{تمت بالخیر}